





محبہ شعری ادب

نور ان بیوہ
۱۲۰ فرحت جہاں
غزلیں
۱۳۱ ریاضت شعری تہذیب - صاحبہ قدوسی
مشاہدہ ہستی - شہت رحیمی شاما

مضامین

۱۲۹ کامیاب ازدواجی زندگی
۱۴۰ حضرت انسہ
۱۴۱ اور وہ فکر کن بن گئی
۱۴۲ رومی صاف کرنے کی ترکیب
۱۴۳ کیا آپ باقی ہیں؟

مستمل عنوانات

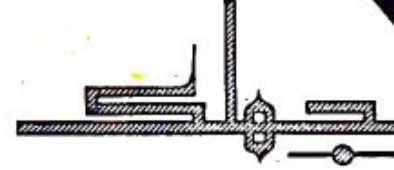
۱۴۱ ایسا بھی ہوتا ہے
۱۴۲ منقسم باقی
۱۴۳ نعتیاتی اور ازدواجی انجمنیں
۱۴۴ تاثرات
۱۴۵ آپ کا ہاتھ
۱۴۶ بچوں کے نام
۱۴۷ میں اکثر شگفتاں ہوں
۱۴۸ بزم پاکیزہ

ایڈیٹر پبلشر مقرر سراج رسول سے جاوید پریمی آئی اے اینڈ ریکورڈ ہے
چھپو یا اور - مقرر شیرو مارکیٹ سے شائع کی

پوسٹ بکس ۵۵۵ سعید منیش بابری اسٹریٹ نزد دفتر تجارت آئی اے اینڈ ریکورڈنگ
کے محلہ

برس * قیمت * دو روپے

نور * ۵۵۵ روپے



راز و نیاز ایمان و یقین

۶ ۵ ۱ ۱
عقلمندی صدیق

زندگی کی کہانیاں

۱۰ ناکرہ گناہ
۱۲ شہ پہ دریا
۱۳ فرحت آرا

مستملات اول

۳۸ بھری رحمان
۱۴۱

افسانے

۱۹ یہی ہے رسم و نفا
۲۵ پارہ گروہی تھا
۶۲ نیلام
۷۶ سائل کی تمنا کون کرے
۸۰ مل اٹھے چراغ
۹۱ زنجیری
۹۲ جبر کی موت
۱۰۸ بارانی
۹۹ صنم پھر کے

پہلی کہانیاں

۱۱۵ آرزوؤں کا مدفن
ساجدہ قدوسی

راز و نیاز

گفتن شصتہ ماہ جب ہم پاکیزہ کے پہلے شامے کی تیاریوں میں مصروف تھے تو ہمیں پوری امید تھی کہ یہ چرچہ ختم ہو کر رہ جائے گا کچھ اس وجہ سے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں کیا بڑھنا پسند کرتی ہیں اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ محنت کبھی راہنمائی نہیں جاتی، کچھ بھی چونکہ پہلا چرچہ تھا اور خاصی اذیت دہی اور چنگامی انداز میں مکمل ہوا تھا اس لئے ہم نے اس سے بہت زیادہ توقعات نہیں وابستہ کی تھیں۔

لیکن پرچہ بازار میں لگنے کے بعد مہینوں نے جس گرمیوں سے اس کا استقبال کیا یہ بات ہمارے ذہن و گمان میں ہی نہ تھی، مبارکباد کے خطوط کا ایک تاننا بندھ گیا، بعض الفاظ اس نرغہ صوفت کا شکر راہ نہیں کر سکتے جو مہینوں نے پاکیزہ سے ظاہر کی ہے۔ ہمارا وعدہ ہے کہ ہم پاکیزہ کو بہتر سے بہتر نکالا اور جاکر پیش کریں گے تاکہ آپ کے خوابوں کی تعبیر کے عین مطابق ہو۔

اور اسی طرح ہم مہینوں کی اس محنت کا شکر ادا کریں گے جو انہوں نے پاکیزہ سے ظاہر کی ہے۔

ہمیں اپنا یہ وعدہ یاد ہے کہ پاکیزہ خواتین کا پہلا مکمل ماہنامہ ہوگا جو ہر ذوق اور طبقہ کی خواتین کو مطمئن کرے گا۔ اس کے لئے بہت سے منصوبے ہمارے سامنے ہیں لیکن صفحات کی تنگی آئے آ رہی ہے۔ پھر بھی ایک ایک کر کے وہ تمام وعدے پورے کئے جائیں گے جو ہم نے آپ کے لئے کیے ہیں۔

اس ماہ آپ پاکیزہ میں 9 افسانے پڑھیں گی۔ یہ تمام افسانے بہت سے دلچسپ افسانوں میں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ ان مہینوں سے جو پاکیزہ کے لئے افسانے بھیجنا چاہتی ہیں یہ خاص طور پر درخواست ہے کہ وہ افسانے بھیجتے وقت ان افسانوں کو ضرور ذہن میں رکھیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا افسانہ بہت ہی زیادہ عیاری ہو لیکن اس میں کچھ نیکو بات ہونی چاہیے۔ ہم نے اس بات کا اہتمام کر لیا ہے کہ نو آموز مہینوں کے افسانے درست کر کے شائع کئے جائیں لیکن بعض افسانے بلا شکے اعتبار سے اتنے بے جا نہ ہونے چاہئے جو تہہ پہن کی ان کو ٹھیک کرنا ناممکن ہو جائے۔ یہ ٹھیک ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بے پناہ افسانے ہمارے پاس آئے ہیں ان میں سے بعض بہت بے جا ہیں، پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض مہینوں اگر ان کا افسانہ ناقابل شاعت قرار دیا جائے تو برا بھی مانتی ہیں، حالانکہ بڑا ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع شروع میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ ٹھیکے ٹھیکے لکھنا آتا ہے۔ اگر کوئی بہن چاہیں کہ وہ کچھ بھی لکھیں وہ چھپ جائے تو یہ ناممکن ہے۔ اس لئے افسانے بھیجتے وقت پاکیزہ کے افسانوں کو ذہن میں ضرور رکھئے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ ہم افسانوں کے پلاٹ کو نہیں بدل سکتے اس کی زبان اور مہینوں کرنے کے انداز کو بھی ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔

اداسے کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ مہینوں کو فورا جواب دے دیا جائے لیکن بعض اوقات دیر بھی ہو جاتی ہے۔ کچھ اور مستقل عزائمات مثلاً "میں اکثر گفتگو کرتی ہوں" ایسا بھی ہوتا ہے اور موسم باتیں "کے سلسلے میں عرض ہے کہ ان میں منہا کی پابندی ہے اور دلے والی چیزیں بے شمار ہیں۔ اس لئے مہینوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی باہمی کا اشتہار کیا کریں۔

خوابوں کی تعبیر کا سلسلہ آئندہ ماہ شروع ہوگا جن مہینوں نے خواب بھیجے ہیں اور وہ فوری طور پر تعبیر چاہتی ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ جوابی لفظ ذہین کتبچہ تعبیر نکالیں۔

اور آخر میں ہمیں مہینوں سے یہ کہنا ہے کہ جب وہ یہ سال پورا پڑھ لیں تو ہمیں اپنی ملنے والی رشوروں سے ضرور آگاہ کریں تاکہ آپ کے ماہنامے کو آپ کے رشوروں سے بہتر سے بہتر بنایا جاسکے۔

افسانہ افسانوں کی شرائط میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی ہے اور اس تبدیلی کا مقصد بھی نئی اور دلچسپائی لکھنے والی مہینوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اعلان کیا اور صفحہ پڑھیجئے۔

عظمیٰ صدیقی



محاذِ چوڑا کے ہیرو
میرضیاء الدین عباسی شہید کی بیوہ

محترمہ شاکرہ عباسی سے ایک ملاقات

بقا
شاعی بار



کر لی۔ کتنی غلط باتیں ہیں۔ ایسی باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا کو آواز دیکھ پوچھوں کہ کیا اپنی لوگوں کے لئے تم نے قربانی دی تھی لیکن یہاں میں بے بس ہوں۔ پھر یہ سوچتی ہوں کہ لوگوں کو کہنے دو ان کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن بہر حال مجھے ملال تو ہوتا ہے نا۔

شاگرد کو کدھی دیکھ کر ہم سے برداشت نہ ہو سکا ایسے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”آپ نے پڑھا کہاں تک ہے۔“

”میں نے شادی کے بعد بی بی ایڈ کیا ہے

بی اے سال اول میں بھی کڑا دی کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔“ آج کل وکینٹ پبلک اسکول میں پڑھا رہی ہیں

”فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟“

میں فرصت کے وقت میں عباسی کی ڈائریاں کھنکھاتی ہوں یا ان کے پسندیدہ شاعر اقبال کو پڑھتی رہتی ہوں۔

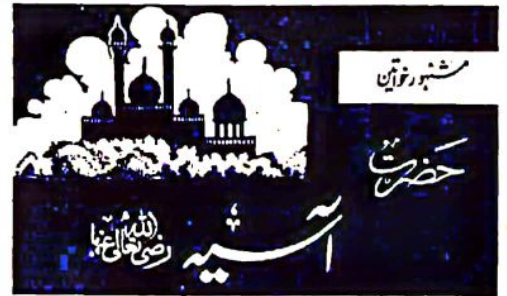
مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں آپ کچھ کہیں گی؟

”مجموع مشرقی پاکستان پر ناتجربہ ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اب تو اس نئے کو پھوڑ دیں کب تک گڑے مرنے لگا کر

مردہ پرستی کا ثبوت دینگے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اب اسی کا خیال رکھنا چاہئے تو بہتر ہے۔

جنگی قیدیوں کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے شاگرد انتہائی محتاط تھے۔ جیسے کافی اصرار پر انہوں نے کہا کہ تمام حالات آپ سب ہی کے سامنے ہیں۔ اور جب حالہ ہیں ان سے امید واثق ہے کہ ہمارے جنگی قیدی بہت جلد انشا اللہ واپس آجائیں گے۔ ان کے لئے پوری کوششیں ہو رہی ہیں حکومت کے ساتھ ساتھ جنگی قیدیوں کی بیویاں بھی بھاگ دوڑ کر رہی ہیں پچھلے ہی دنوں ان خواتین کا ایک وفد سیرونی مالک گیا ہے تاکہ وہاں پر کچھ کیا جاسکے۔ بین الاقوامی رائے عامہ کے ذریعے ان قیدیوں کو جلد سے جلد واپس لانا ان کا مشن ہے۔ جنگی قیدی جس دن اپنی سرزمین پر واپس آئیں گے وہ پاکستان کے لئے شہرا دن ہوگا۔ ہم انتہائی عزت و احترام کے ساتھ ان بھائیوں کا استقبال کریں گے۔ میری پرنسٹون دعائیں اور نیک تمناؤں جنگی قیدیوں اور ان کے لواحقین کے لئے ہیں۔

شاگرد سے گفتگو کافی طویل ہو گئی تھی ان کو کلاس بھی لینی تھی۔ لہذا ہم نے اجازت چاہی اور ان کے لئے اپنے دل میں عظمت و احترام کا اثر دے دیا۔ واپس ہوئے ایسا لگ رہا تھا کہ کپالے طن کی ہوا میں بھی شاگرد کی عظمت کو سلام کر رہی ہیں۔



افروزہ اقبال فحیت

کے بعد ایسے شیاطین و اجنہ کا داخلہ آسمانوں میں بند ہو گیا جو فرشتوں کی بہت سی باتیں چوری چھپے کر کانٹوں کو تار دیا کرتے تھے۔

ایک روز کا مہزون نے بتایا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا اللہ کے فرشتوں کی موت کا باعث بنے گا۔ فرشتوں نے یہ اطلاع ملنے ہی ایسا انتقام کیا کہ جو بچہ بھی پیدا ہو گئے اس کو جیلے، ہزاروں لاکھوں بچے قتل کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ

والسلام پیدا ہوئے۔ انسانی میل شائے نے ان کی والدہ مظلہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ بچہ کی ایک کھنکھیں مل کر انہیں دریا میں ڈالیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ صاحبہ نے ایسا ہی کیا اور محنت کے ہاتھوں جو بچہ رکھ کر اپنی بڑی بیٹی سے چھپا کر انہیں موشین کے نزدیک مریم اور عیسیٰ کے نزدیک عیوبہ کے کہا کہ وہ بچہ لٹا دیں کہ مسند وق کی طرف نہ بہے جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن دریا کے کنارے سے ملے گا۔ انہوں نے دیکھا کہ دریا سے ایک بچہ نکل کر ان کی جانب نکلا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ وق سے ہی مل گیا ہے۔

فرعون کو جب معلوم ہوا کہ ہند وق میں ایک بہت خوبصورت بچہ رہتا ہوا ہے تو حکم دیا کہ فوراً قتل کر دیا جائے مگر فرعون کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اڑے آگئیں اور انہوں نے فرعون کو سمجھا دیا کہ یہ بچہ ہم دونوں ان بچہ کو اپنا بچہ بنا کر بالین فرعون کے دل میں بھی بچے کی محبت لٹا دیں اور یہ بچہ کر کے اگر یہ بچہ بنی اسرائیل کی قوم کا ہوتا تو سیکڑوں آدمی اسے پہلے ہی قتل کر دیتے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکل سے باز آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہمشیرہ فرعون کے محل میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ چونکہ ان کے والد فرعون کے ہاں ملازم تھے وہ بھائی کے بلے میں معلومات حاصل کر کے گھنٹیں تو انہوں نے فرعون اور حضرت آسیہ دونوں کو معلوم اور اس پایا وجہ جو بھی تو معلوم ہوا کہ یہ شیر خوار بچہ جو ایک صندوق میں بٹا ہوا یہاں آگئے کسی عورت کا درد وہ بچے کیلئے تیار نہیں ہوتا اگرچہ جان بات تو اس کی زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہمشیرہ صاحبہ نے فرمایا۔ ”میں ایک درد پلانے والی کو جانتی ہوں جو بہت شفیق اور شیر خواہ ہیں اگر آپ اجازت دیں تو انہیں یہاں لے آؤں۔“

اجازت مل گئی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ صاحبہ شریفہ نے آئیں اور اللہ تعالیٰ نے نہاں بیٹے کو فخری جلال کی سے بعد و بارہ دلوا دیا۔

حضرت آسیہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ وہ ان کا ایک ایک ادا پر جان دیتی تھیں، روزانہ جب تک ان کی جملک نہ دیکھ لیتیں، انہیں چین ہی نہ آتا اسی زمانہ میں ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورے قوت سے فرعون کی داڑھی پکڑ لی تھی یا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو نہ اٹھانے والا تھا جو بوجھ بے بس ہے کہ یہ چھوٹا سا بچہ ایک گھٹنے پر کھڑا تھا۔ فرعون نے اس کو قتل کرنے کے لئے حکم دیا کہ اس کو قتل کر دے۔ اسی زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ

ہی مطلق کر دیا ہے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی لمحہ قتل کر دیا۔ حضرت آسیہ کو علم ہوا تو گریہ پڑی آنسو بانی ہوئی۔ جلی آئیں اور فرعون کی خوشامد کے معصوم بچہ کو کیا معلوم کہ بھاری کیا حقیقت ہے، فرعون نے کہا کہ مجھے اس بچے سے خوف آتا ہے۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کیلئے کہ بچہ غیر معمولی صلاحیت کا مالک ہے یا نہیں ایک ہیرا اور ایک انگارے ٹکڑا اس کا خیال کیا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام غیر معمولی صلاحیت کے مالک ہیں تو وہ لازمی طور پر انگارے کے مقابلے میں ہیرا کو ترجیح دے گا۔ لیکن اگر نام بچہ کی طرح ہیں تو انگارے کی چمک دمک دیکھ کر اسے اٹھا لیں گے۔

امتحان لیا گیا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہیرے کی جانب ہاتھ نہ بڑھایا مگر زوادی حضرت جبریل علیہ السلام نے شرف لاکر ان کا ہاتھ انگارے کی جانب پھیر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انگارہ اٹھا لیا جس کی وجہ سے ان کی تھیلی خلیس گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بونہ تھیلی کو اس کی قوت عطا فرمائی کہ جب حضرت والا اپنا دست مبارک کھمبے تو تھیلی چاند کی طرح چمکنے لگی۔

بڑے بزرگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بغیر بی بی اور ماہونہ نے فرعون کو ایک اللہ کی راہ پر لانے کی کوشش کی تو اس نے حان اٹھا کر دیا۔ لیکن حضرت آسیہ اور ایمان لے آئیں۔

فرعون کا جو خضر ہوا وہ سب کو مل گیا ہے لیکن حضرت آسیہ کی قسمت میں ایمان لانا تھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ان کا ذکر فرمایا ہے یہ بات بھی خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے جس کی تعریف اللہ تعالیٰ میں شائے قرآن میں اس کی کوئی اس کا کم سے کم درجہ دل کا ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی تعریف اس فتح فرمائی ہے ”مردوں میں بہت کامل ہونے کے بعد انہیں نہیں سولے میں کوئی کمال کے لیے کہہ سکتے ہیں انہیں سولے

حضرت مریم اور حضرت آسیہ کے۔۔۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد کوئی سابقہ انہوں کی خواتین کے بلے میں ہے کلام ایک میں ان کے ذکر اور حضور پرورد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کوئی کے ہمہ کی عظمت و بزرگی میں کوئی کلام نہیں۔

فرعون کو جب یہ پتہ چلا کہ حضرت آسیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بی بی مان کر ایک اللہ پر ایمان لائے ہیں تو اس نے ان پر بہت سختی کی اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں لیکن حضرت آسیہ کے قدم میں رتی برابری لرزش نہیں ہوئی یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید پڑھتی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مٹی اللہ تعالیٰ عنہا۔



زندگی کی کہانیاں



میری بدھنی کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میرے شوہر ایک اتفاقیہ حادثے کا شکار ہو کر اپنی دونوں ٹانگیں توڑ بیٹھے۔ تین روز کے بعد انھیں ہسپتال سے توجاریج کر دیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ہلارت بھی کی تھی کہ وہ تین مہینے تک ہنگامے کے نیچے قدم تک نہ آئیں۔

میں اکیلے وی کمانے والے تھے۔ ایک بچہ میری گود میں اور ایک بیٹہ میں تھا۔ گھر کا آنا نہ چند گنے چنے زیورات اور معمولی قسم کے برتنوں پر مشتمل تھا۔ میرے شوہر کو جب ڈاکٹروں نے تین ماہ تک ہلنے چلنے تک کی ممانعت کر دی تو وہ بے اختیارانہ طور پر رو پڑے۔ میں نے انھیں پہلی بار روئے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر تو یہ ہے کہ ان کی بے بسی اور بچاری پر مجھے بھی رونہ آ گیا۔ تاہم میں نے ضبط کیا اور انھیں دلاس دیا کہ جب تک میں زندہ ہوں انھیں گھیرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں اچھے اور بُرے وقت آتے ہی رہتے ہیں۔ اگر انھوں نے بہت بار دی تو لوگ طعنیوں گے اور تین مہینے کا کیا ہے چکی بجاتے

میں گذر جاتی تھی۔

نیری بات سے انھیں بڑی ڈھارس بندھی ہسپتال سے گھر آ کر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے سارے زیورات ادا کرنے والے داموں بیچ کر ان کے لئے ضروری دوائیں اور ایک ماہ کے لئے آٹا۔ دالیں اور دوسری ضرورت کی اشیاء لے آئی اس کے بعد کبھی کبھار پیسے بچا رہے تو میں روپیہ ماہوار کی قسط پر سلائی کی ایک مشین لے لی۔

پڑوس والوں نے میری ہر ممکن مدد کی بچوں کے کپڑے معقول سلائی پر میرے پاس آئے۔ دل میں اپنے شوہر کی خدمت اور دوا دارو کرنی۔ کھانا پکانی اور گود کے بچے کو بہلائی اور راتوں کو بیٹھ کر سلائی کا کام کیا کرتی۔ بھری بھری آنکھوں سے وہ مجھے دیکھتے رہتے اور میرا شکریہ ادا کرتے ان کی زبان نہ نکلتی تھی۔ انھیں یقین دلائی کہ عورت کے لئے اس کا سہاگ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں جو کچھ کہی ہوں اس میں میری اپنی غرض اور لالچ شامل ہے پھر میں بظاہر نہیں کران کا دل بڑھانے کے لئے کتنی کٹم ٹھیک ہو جاؤ پھر سو دوسروں سے کچھ وصول کروں گی۔

ایک مرتبہ آنکھوں میں آنسو لاکر کہنے لگے میں تمام زندگی تباہ کیا یہ احسان نہیں بھول سکوں گا۔ میں نے ہمیشہ یہ سمجھا

منا کہ عورت کمزور اور ناتوان ہوتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ عورت لہجہ و جرات اور قربانی دینا کا مقابلہ تو بڑے سے بڑا مرد بھی نہیں کر سکتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ عورتیں آہم کرتی ہیں تمنا کا کام کیسے کر لیتی ہو۔ بچے کو سنبھالنا میری دیکھ جائیگا۔ اپنا نیاں رکھنا۔ کھانا پکانا اور بچوں کی سلائی کرنا۔ اتنے بہت سے کام انجام دینا جس سے دل گر دے کا کام ہے۔ آفریں بہ تمہاری بہت پر تم سو دوسروں سے کچھ وصول کرنے کو کہتی ہو اور میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے پاؤں دھو دھو کر مٹیوں سے کچھ دنوں میں انھیں اپنے جسم میں کچھ طاقت محسوس ہوئی کہ ان کی غیر رعایت معلوم کرنے کے لئے ان کے آنے والے دوستوں نے بہت کایا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فخر کرنے لگے کہ ان کے لئے پاس پڑوس کے بچوں کے ٹوشنوں کا استعمال کیا جائے وہ بیٹھے بیٹھے بچوں کو پڑھا دیا کریں گے کچھ آمدنی میں اضافہ ہوگا اور کچھ میرا کام بھی ہلکا ہو جائے گا۔

میں نے بہت کہا کہ میری نکرت کرو لیکن وہ نہیں مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا آرام کا زمانہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کام کی زیادتی کے باعث کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ میں کئی دن تک انھیں مانتی رہی۔ اسی دوران میں ایک روز دیکھا کہ کتنی چھوٹے ہموں بچے اپنے گھلوں میں بسنے لگے۔ گھر کے مرنے کے لئے چلے آ رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں نے ان کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا تو عموز انھیں ان لوگوں سے ذکر کرنا پڑا جو انھیں دیکھنے کے لئے آئے۔

اسی روز میں ڈاکٹر کے پاس گئی اور اس سے دریافت کیا کہ ٹوشن پڑھانے میں کوئی حرج تو نہیں۔ ڈاکٹر نے اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ وہ بغیر طے جلے بیٹے ہی ٹوشن پڑھا سکتے ہیں۔

ایسے غریبوں، معذوروں اور ابا بچوں سے لوگوں کو قدرتی طور پر ہمدردی ہو جاتی ہے، جو کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر بغیر محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کمانا چاہتے ہیں۔ میرے پاس سلائی کا سامان تو آہی رہا تھا۔ جب لوگوں کو چلا کر میرے شوہر ٹوشن پڑھانا چاہتے ہیں تو طلبہ کا تانا گنا گیا۔ میرے شوہر کہتے کہ میں ایک بچے کو ایک مضمون پڑھانے کے پچاس روپے لوں گا۔ پڑوسی کہتے کہ اس علاقہ میں ایک مضمون پڑھانے کا نفع پچھتر روپے ہے۔ ہم تو آپ کو پچھتر روپے دیں گے۔ ہمدردی اور بہت افزائی کا جو مظاہرہ میرے پڑوسیوں نے کیا آج تک اُسے لئے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

تین ماہ تک جھپٹے میں گزر گئے میرے شوہر کی ہانگوں کا پلاسٹر کاٹ دیا گیا۔ ایک سرے سے پڑ چلا کہ ہڈیاں ہر جگہ ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مزید تین ماہ احتیاط کی جائے۔ میرے شوہر صبح و شام چل قدمی تو ضرور کیا کریں لیکن ابھی گھڑی پر تین ملازمت تو پہلے ہی جا چکی تھی۔ اس کے علاوہ ملازمت میں تنخواہ بھی کیا ملتی تھی صرف ساڑھے تین سو روپے ماہوار جس میں سے ڈیڑھ سو روپے مکان کے کرایہ کے نکل جاتے۔ ہم دونوں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ تقریباً سات آنٹھ سو روپے ماہوار

دیکھا جائے تو زندگی بڑا سہیہ خود ایک بے کوائف ہے۔ سلسلے ختم کرنا یا خوشگوار بننے سے پہلے کے زندگی بے ایسے کہانیاں نے مجھے تیرا ہوا جو دوسروں کے لیے دیکھو، عزیزانہ اور ناخیز ہو سکتے ہیں۔ انہی صفات میں اسے ہم کہ مقرر کیا نہ ہے شائع ہر گے۔ برصغیر کے قیدی ہیں اور نہ ہی یہ مذہب ہے کہ آپ بہت اچھے والے ہیں۔ آپ بہت اچھے زندگی کے کہ کوئی دیکھو کہ کوائف ہے بھی دیکھے، ہم اے خود ہی دیکھو۔

صرف میزمنوں کے ذریعہ مل جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ گھر کے قریب ہی کوئی اچھی سی وکان کرایہ پر لے کر کوچنگ سنٹر قائم کر دیا جائے۔ کوچنگ سنٹر بھی خوب چلا میسے شوہر مختلف مقامین پر چلنے کے لئے کئی دوسرے استادوں کا بھی انتظام کرنا پڑا جب مجھے معلوم ہوا کہ اردو پڑھانے کے لئے شاہد نامی ایک مٹریں کا انتظام کیا گیا ہے تو میرا اچھا کچھ ٹھنک گیا کہ کوکلاس عورت کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی لیکن مجھے اپنے شوہر پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا۔

گھر کے حالات درست ہو چکے تھے۔ بچے کی پیدائش کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ ان کے مشورے پر میں اپنی امی کے گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک قواعد کے خطوط لکھ کر رہے پھر ایک ایک خط لکھنا شروع ہو گئے۔ میں ہر مہینے دن انھیں باقاعدہ خط تحریر کرتی رہی۔

اللہ نے ایک اور چاند سا عطا فرمایا۔ انھیں اطلاع دی گئی خیال تھا کہ نو ذرا دوسرے دن چلے آئیں گے لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو مجھے بہت پریشانی ہو گئی کہیں خدا نخواستہ ان کی طبیعت دوبارہ نہ بگڑ گئی ہو۔

ابھی چھٹی چھلے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انھوں نے اپنے بچے کی پیدائش پر اظہارِ مسرت کرنے کے بجائے مجھے یہ اطلاع دی کہ میکراوران کے مذاق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاہد سے ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا کچھ پلا انتخاب غلط تھا۔ حق مہر کے لئے پانچ ہزار کا ڈرافٹ اس خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ اور اپنے وکیل کے ذریعہ طلاق نامہ الگ سے بھیجا رہا ہوں جس وقت تمہیں یہ خط ملے گا، شاہد سے میرا نکاح ہو چکا ہوگا۔ امید ہے کہ تم بھرت ہو گئی ہو تو کو بارہ خط لکھنے کے بعد ساری دنیا میں سے لے کر ایک بچی دوسرے دن طلاق نامہ بھی موصول ہو گیا۔ بڑے بھائی خاموشی سے جا کر میرا سامان لے آئے۔

آج کل میں اپنی امی کے ہاں ہوں ملائی کا کام بدستور جاری ہے شوہر کے لئے آج بھی دل سے بدعا نہیں نکلتی۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔ ان کی ثنائی دو بچے میکرا پاس ہیں۔ انھیں سینے سے لگا لیتی ہوں تو سب کچھ بھول جاتی ہوں۔

اب سلسلہ میرے شوہر بچوں کے حصول کے لئے

علاقت سے رجوع کرنے والے ہیں۔ کیا اس بھری پُری دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو انھیں یہ سمجھا سکے کہ ایک بے قصور ماں کی کوکھ کیوں اجالتے ہو یہ درست ہے کہ وہ تمہاری حتی المقدور خدمت نہ کر سکی۔ بیواری عورت بھی نا لیکن تم تو مرد ہو کیا تمہارے نزدیک وہائی اسی کا نام ہے کہ مردوں اور جموروں کو جتنا زیادہ ستایا جاسکے، ستایا جائے؟

آمنہ۔ کمرپی

نام کردہ لکھا

میں نے شروع ہی سے بڑی تکلیف دہ زندگی گذاری ہے۔ والدین ہی میں اللہ کو پاس ہو گئے تھے میری والدہ نے میری پرورش کی بڑی تکلیف دہ دلائی۔ میکرا تھپیلے کے اندر اپنے نزدیک خوب اچھی جگہ میسر راستہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ مشرق کی لڑکی بے زبان ہوتی ہے جس کے بچے لے لے باندھ دیا جائے پس خاموشی سے اس کی ہو جاتی ہے۔ شوہر کے گھر مولیٰ میں سوار ہو کر جاتی ہے اور وہاں سے اس کا جنازہ ہی باہر نکلتا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نہ بے زبان تھی اور نہ بے پس۔ شادی سے پہلے میری والدہ نے صرف لڑکے کو مجھے دکھایا بلکہ میری سہیلیوں کی معرفت میرا عندیہ بھی معلوم کیا اور جب انھیں خوب اچھی طرح پہل گیا کہ مجھے یہ رشتہ منظور ہے تو انہوں نے حامی بھری۔ اور اس طرح میں سرخ جوڑا پہن کر اپنے شوہر کے ہاں پہنچ گئی۔

نہ جانے کیوں شوہر کے بہن بچہ نہ کر سکی نہ میں یہ بات سمجھتی تھی کہ میکرا شوہر کو کچھ سے بچی وقت نہیں کسی وقت بھی مجھے چھو کر جا سکتے ہیں۔ ان کی باتوں میں مجھے جھوٹ اور بناوٹ اور قلعہ کا گمان ہوتا۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں میں بھینچ گئی مولیٰ جہز میں شروع ہو گئیں۔ وہ جتنا مجھے اپنی محنت کا ثبوت دلاتے اتنا ہی میرے لیے ہناؤ جتنا ہی تمہاری سہیلیوں کی باتوں کا جواب دیتی ان کے اہکاتے منہ سے انکار کر دیتی۔ اٹھتے بیٹھتے ایک ہی کلمہ میری زبان پر رہتا کہ مدد کرو تو ہوتے ہیں۔

میں داؤد تھی ہوں کہ انھوں نے میری ہر بات کو برداشت

کیا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے میری والدہ کے اعتقاد کے تحت لڑکی ہی دنوں کے بعد ان کے کپڑوں سے قسم قسم کے عطریوں کی خوشبو میں آئے۔ میں دھرت سر شام گھر آنے کے بجائے وہ رات گئے گھر پہنچنے لگے ایک بار جب سے ایک زمانہ وہاں بھی نکلا جو خوشبوؤں سے سب اہوا تھا اور جس میں آپ اشک کے دھتے صاف نظر آ رہے تھے۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے کتنی زبردست بھول ہوئی ہے۔ مرد کو یوں کبہر دینا ایک قسم کے فیشن کی بات ہے لیکن جب وہ بچہ بچہ ہو جاتا ہے تو اسے تب پہلے کہہ کر دینا کتنی ناپاک ہو گئی ہے۔ میکرا شوہر کے علاوہ اس دنیا میں میرا کون تھا؟ اگر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ اب تو میں ایک بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔

میں نے دور دراز کے حضور میں خوب دعائیں مانگیں۔ اپنے گناہوں اور غلطیوں کی معافی چاہی۔ میں الہام اور کشف کا دعویٰ تو نہیں کرتی تاہم یہ ضرور کہتی ہوں کہ ایک ایک میرے دل میں دعا آتے وقت یہ خیال آیا کہ اگر میں اپنے شوہر کو بھرپور محبت دوں تو شاید وہ مجھے راضی ہو جائیں، اور اوپر اٹھ کر آجائے اور دیکھیں اگر ایک چیر گھر میں مل جائے تو کسی کو کیا ضرورت پڑتی ہے کہ دوسری جگہ اسے تلاش کرتا پھرے۔

میں نے ان کا دل جیتنے کے لئے سرحدوں کی بازی لگادی اپنی والدہ سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ان کی ایسی خدمت کی کہ کھولے ہی دنوں میں وہ میکرا بن گئے۔ کپڑوں میں سے خوشبو میں آنا بند ہو گئیں، سر شام گھر آتے گئے۔ روکھی ہوئی بہاریں واپس آ گئیں۔

مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ عورت اگر چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔



بچے کا حقیقہ تھا۔ ہمارا گھر ماٹوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا ہاں رات بھر کے قہقہے جگمگاتے تھے۔ پورے گھر میں تو بھول کی آوازیں کو بڑی ریختیں میکرا شوہر کے دوست ہمارے بھائی بنیں میں ارشاد بھائی کہتی تھی بچے کے لئے جوڑا لے آئے تھے اور شوہر کی باتیں کر کے کہنے لگے۔

”بھائی، اب تو تمہیں یہ شکایت نہیں کہ مرد بھول ہو سکتا ہے۔“

ہو۔ ہاں۔

میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ ”مرد بھولا عورت... کوئی بھی بھولا نہیں ہوتا۔ یہ تو ماحول کے اثرات ہیں جو انسان کو بوجھلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“

ارشاد بھائی بہت زور سے ہنسے۔ ”خوب سمجھیں بھائی لیکن غلطیوں میں سمجھیں۔“

”مطلب یہ کہ اگر تمہیں اپنے میاں کے کپڑوں سے خوشبو میں نہ آتیں اور جب سے آپ اشک ٹکا ہوا مال نہ ملتا تو تمہارے خیالات میں ہرگز تبدیلی نہ آتی۔ تم ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہتیں اور گھر کے اندر مرد و جنگ جاری رہتی۔“

میں نے کہا یہ تمہیں یہ باتیں کس لئے بتائیں؟

بولے ”بتاؤ کہ اس سارا منصوبہ میری تیار کیا ہوا تھا تمہارے میاں روزانہ میکرا پاس آکر دیکھتے تھے۔ میں نے کہا یا ر۔ تم بھی بیوفا بن کر دکھا دو۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے لیکن جب میں نے انھیں اپنی ایکسٹیم ہائی تو وہ جوڑے کرنے پر تیار ہو گئے۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے کہ کسی لڑکی کو کسی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور یہ سارا ڈرامہ مجھے دھوکہ دینے کے لئے رچایا گیا تھا؟“

ارشاد بھائی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”ہاں بھائی! ہم کو دو مائیں دو تھیں یہ جانا دیا۔“

مجھے ان کی اس حرکت پر ہنسی آئی اور خوشی بھی ہوئی۔ غصہ اس لئے کہ انہوں نے مجھے دھوکہ دیا تھا اور خوشی اس لئے کہ ان کی اس حرکت سے میرا گھر اجڑنے سے بچ گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں بھی ان سے ایسا ہی بدلوں کی جس پڑ انھیں عقیدہ بھی آئے اور خوشی بھی محسوس ہو سچا بچان کی بہن کو اپنا راز دار بنا کر میں نے بھی ایک ایسا ڈرامہ کھلایا کہ ارشاد بھائی جن کا کہنا تھا کہ آدمی دنیا میں کو کھائے یا نہ کھائے خود کھائی کرے لیکن کبھی شادی نہ کرے، چند ہی ماہ میں ایک عدوی کی شہر نامہ لکھ رہے تھے۔

ولیم میں ہم لوگ ان کے ہاں اکٹھا ہوئے تو میں نے پوچھا ”کہئے ارشاد بھائی آپ تو کہتے تھے کہ شادی کرنے کے مقابل میں خود کھائی کے لئے زیادہ ترجیح دیں گے اب یہ کفر کیسے ٹوٹ گیا۔“

کہنے لگے: "بھئی میرا کوئی قصور نہیں۔ اچانک آیا اور اسی لمحے پیچھے ہٹ گئے کہ اگر میں نے فوراً شادی نہیں کی تو دونوں زہر کھا کر سو جائیں گے۔ مجھ کو ان کی بات ماننا پڑی۔ اب تمہاری بھالی باتی ہیں کہ اگر ان کی شادی میں سے ساتھ نہ ہوئی ہوتی تو وہ بھی مر جاتیں۔" اللہ میرا بھلا کرے۔ میں نے تین چار دن پہلے اس میں لے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے آباؤ اجداد اچانک آپ کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟"

انہوں نے سوالیہ نظریں سے کہنے لگے: "میرے چچا کی عزت تھی۔ ان بات دراصل یہ ہے: میں نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ان دونوں کو آپ کے بستر سے خوشبو میں لیے اور... لپ اسٹک لگے۔ مرنے سے پہلے مال لاکرتے تھے۔" دودھ تو لٹی ہوئی ہوڑیوں کے تھمے بھی ملے۔ آپ کی ان حرکتوں کا لازمی طور پر یہ رد عمل ہونا تھا کہ وہ آپ کو فوراً شادی کرنے کا حکم دیں؟

"اچھا تو یہ آپ کی حرکت تھی؟" ارشاد دیکھائی نے ہنسنے ہوئے کہا: "میں بھی تو کہوں کہ اچانک آیا اور اچھی کو کیا ہو گیا ہے؟ مجھ جیسے سیدھے سادے اللہ میاں کی گلے جیسے لڑکے پر ایسا کی آوارگی اور بد چلنی کے الزامات کیوں عائد کئے جا رہے ہیں؟"

پھر اپنی آواز میں مصنوعی غصہ پیدا کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "بھائی تم نہیں جانتیں کہ تم نے کس شیر کو لٹکا رہا ہے۔ اگر میں بھی تم سے ایسا ہی بدلتا تو میرا نام ارشاد نہیں؟"

ابھی تک تو انہوں نے کوئی انتقامی کارروائی کی نہیں تھی، مگر اب مجھے بے چینی سے انتظار ہے کہ وہ کب اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مجھے بظاہر غصہ تو بہت آئے گا لیکن حقیقت میں ان کا انتقام میرے لئے کسی دلی مشرت کا پیغام ضرور لے کر آئے گا۔



بعض اوقات ایک ذرا سی نفرت انسان کو وہاں تک پہنچاتی ہے جہاں سے وہاپس نہیں لوٹتا۔ ایسا ہی کچھ مجھ پر بھی ہوا ہے۔

ساتھ بھی ہوا۔ میں جہاں ایک بے حد معزز اور شریف گھرانے کی عزت تھی ایک ذرا سی نفرت کی وجہ سے جس کے سبب مجھے گھر کی باعزت اور پر وقار زندگی چھوڑ کر ہمارے شہر کی ذلت آمیز اور کراہت انگیز زندگی اختیار کرنی پڑی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے کہ جب میں بچپن میں اور وہ کچھ سن کے معصوم سرخروں سے نکل کر جوانی کی حسین و رنگین طاوولوں میں قدم رکھتی تھی۔ میرے جوان بوجھے ہی میری پیچھے کا میرے والدین پر دباؤ پڑنے لگا کہ اب یاسین کو یعنی مجھے ان کے گھر بیاہ کر بھیج دیا جائے۔ واصل بچپن ہی میں میری بھوپھی نے مجھے اپنے لڑکے حیدر کے لئے مانگ لیا تھا۔ لہذا جب میں جوان ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنے لڑکے چلنے کے لئے امرالہ شروع کر دیا۔ میرے والدین کو بھلا اس میں سے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے بھوپھی کے امر پر حیدر کے چاند کی تاریخ طے کر لی۔ تین مہینے میری شادی میں کہ انہیں دنوں میری زندگی میں ایک یوں کوٹھن آیا اور میں اس میں رہی۔ جس فلیٹ میں ہم رہتے تھے اس کے برابر والے فلیٹ میں انہیں دنوں ایک نیا صورت سا جوان آکر ہوا تھا۔ ایک روز میں اپنے گھر کو واپس میری بھوپھی کے ہنگاموں کو دیکھ رہی تھی کہ تین مہینے وہ وہاں ہی اپنے فلیٹ کے دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میری نظر جب اس پر پڑی تو وہ عجیب سے آواز میں سکرا دیا میں گھر کر کرے میں بھاگ گئی۔ میرا دل نہ در زور سے دھڑک رہا تھا۔ بار بار پوچھتا تھا کہ کچھ سے جا کر واپس میری بھوپھی اور وہ مجھے دیکھ کر کچھ سے مسکراتے۔ میری ہمت نہ بڑھ سکی اور شدید خواہش کے باوجود دوبارہ واپس نہ جاسکی۔

دوسرے روز میری بھوپھی کا اتفاق ہوا۔ جیسے ہی میں واپس میں جا کر کھڑی ہوئی، وہ بھی اپنے دروازے میں آ گیا اور مجھے دیکھنے ہی سے کھلے لگا۔ میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس بار میں بھاگ نہیں۔ بلکہ اپنی جاگ کھڑی کر کے طرف دیکھتی رہی کبھی کبھی کن انکھیں سے میں نے اس کی طرف سے دیکھ لیتی تھی۔

اچانک میرے کانوں میں اس کے زور زور سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں ہاتھ جا کر مجھے سلام بھی کر لیا۔ میں شرم سے کٹ کر رہ گئی اور تب مجھ سے وہ بڑکاز لیا۔ ایک بار میں اپنے کمرے کی طرف بھاگ پڑی۔

اس کے بعد تو تقریباً دو دن ہی ایسا ہونے لگا۔ اب میں بھی

اس کے لئے ہر وقت بے چین رہتی تھی۔ جہاں اس کا کام ہے واپس آنے کا وقت ہوتا، میں واپس جاکر ہی ہوتی۔ وہ کام ہے اس کا تو ترک ہی ہے۔ مجھے کھڑے دیکھ لیتا۔ پھر وہ جلدی سے لڑنگ کی بیڑیاں چڑھ کر اوپر آتا۔ اپنا فلیٹ کھولتا اور اندر داخل ہو کر واپس نہ آ کر کھڑا ہوتا۔ میں ملے دیکھ کر مسکراتی۔ وہ بھی مسکراتا۔ پھر اس کے کمرے کے دروازے پر اٹھ کر ایک بار جھپٹتا۔ ایک دفعہ جب میرے والدین اور والدہ اپنی بہن سے ملنے گئی تھیں تو وہی نوجوان عادت گیا۔ میں پہلی اس کے انتظار میں رہنے میں کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ حسب معمول مسکرا دیا۔ "کیا حال ہے یا سہن؟" اس نے اشارے سے پوچھا۔

جواب میں میں نے سر کے اشارے سے ٹھیک ہے۔ کہہ دیا۔ "تمہاری اُمی کیا کر رہی ہیں؟" اس نے پوچھا اور میں نے بتا دیا کہ ابھی ہوتی ہیں۔

"اوہ... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم جہاں میرے کمرے آ جاؤ۔ اس نے کہا میں اس کی بات سن کر جھجک گئی۔

"گھر تو نہیں، اتنے دن سے ہم دونوں کی طرح واپس میں کھڑے ہو کر اٹھتے کہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں، دعا سلام کرتے ہیں تو اس میں مزہ نہیں آتا۔ یہاں آؤ تو چند منٹ بیٹھ کر باتیں کریں۔ اس نے پھر اس طرح کہا کہ میں انکار نہ کر سکی اور فوراً ہی اپنے فلیٹ سے نکل کر اس کے فلیٹ میں پہنچ گئی۔

ایک گھنٹے بعد جب میں اس کے فلیٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ میں پہنچی تو میری دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ اپنے فلیٹ جالے پر مجھے بے حد دیکھا ہوا ایک نوجوانی کرکٹ کا ہوسٹا تھا۔ نہایت کے آسویں کہیں اس داغ کو دیکھتے تھے جو میری پیشانی پر کلک کا ٹیکہ بن گیا تھا۔

اس حادثے کے بعد میں کڑاؤ اس رہنے لگی۔ مگر عارف مجھے اپنی جہاں کی فحش کالینڈر دکھاتا تھا۔ میں خود کو کٹی کٹی کر دیکھتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا: "یا سہن! تم خواہ مخواہ آؤ اس اور پریشان ہوتی ہو۔ اسے میں تو ابھی دیکھتا ہوں، میں تمہارے لئے عرش کے سامنے توڑ کر لاسکتا ہوں۔

تو کہہ کر وہ میں جلدی تھا ہے والد سے بات کر کے انہیں اس بات پر اطمینان دلانے کا وہ تمہاری سنگینی تو کر کے مجھے تمہاری شادی کر دیں اور اس بات میں اس کی جوتی لٹکیوں میں آگئی اور اس طرح میں مہینے گزارے۔ تین مہینے بعد ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میرے پیٹ میں مال کا نام پڑ رہا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میرے کمرے کے دروازے پر ایک بار پھر پڑا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ مارنے سے روک لیا۔

لگے۔ پھر جب میں نے اس بات سے عارف کو آگاہ کیا تو اس نے مجھ سے چپ چاپ بھاگ چلنے کو کہا۔ میں لڑ گئی میں نے اس سے کہا کہ وہ تو میرے والد سے بات کرنے والا تھا۔ اس پر عارف نے کہا کہ وہ میرے والد سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ ایک مولیٰ آدمی ہے اور میرے والد کا تعلق متون طبقے سے ہے۔ پھر وہ اپنی بہن کے بیٹے سے میری سنگینی تو کر کے ساتھ میری شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب اپنی جگہ میں تھا۔ میں چکر کر رہ گئی۔ میرے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ خودکشی۔ یا زنا۔

خودکشی میں بھی رسوائی تھی اور فرائض بھی۔ بہت سوچنے

دست شناسی



آپ ہمارے دست شناساں لے اس مضمون سے اپنے ہاتھ میں دو سوالات کے جواب حاصل کر سکتی ہیں کس قسم میں بہتر سے درخواست ہے کہ وہ ملنے دہننے اور بائیں دونوں ہاتھوں کے صاف متعصب پرنٹ مندرجہ ذیل کو آٹھ کے ساتھ، ویسے جیسے درج فرمائے پھر ان کے سوالوں کے جوابات شائع کر دیے جائیں گے۔ پرنٹ کے ساتھ مندرجہ ذیل کو آٹھ ضرور دیں۔

۱۔ پورا نام، ۲۔ تاریخ پیدائش، اگر یاد ہو تو ماہ اور دن، ۳۔ ملازمت پیشہ ہیں یا نہیں، ۴۔ کس ہاتھ سے کام کرتے ہیں، ۵۔ پتا، ۶۔ پرنٹ (ہاتھوں کی چھاپ) ۷۔ دو سوالات۔

پرنٹس نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہاتھوں کو صابن سے دھو لیں۔ پھر ان میں کوئی مائل یا کریم نہ لگا کر ان پر گھس لیں اور کسی خوشبو سے متاثر نہ ہو کر ہاتھ دبا کر پرنٹس آٹھ لیں۔ وہی پرنٹس جیسے جو صاف ہو اور جس میں تمام ٹھیکریں واضح ہوں۔ پرنٹس بپ اسٹک کے ذریعے بھی نکلے جاسکتے ہیں۔

پرنٹ پر سونے نام کے کچھ نہیں۔ جیہ کو آٹھ، انگ اٹھ کے کاغذ پر لکھیں۔ نقشہ پر پتا نہیں۔

ماہنامہ پاکیزہ کراچی۔ لے اس مضمون پر پتہ جس نمبر ۲۲۹، کراچی



میں نے سہم وق



فوج
درویشی میں ملوس اپنی تمام تر عبادت کا جادو گنگے
اور سکھ لاشوں کی بجلیاں لگاتے تھے بھارتی بھاد
کو اتنے دھمکے بعد اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ
"نہان نمکت نہبت اور جی جان سے قبول میں اتنے مجھے کہ عیسائی کی
"دودھ کی کو موس بھی نہ کر سکے۔ یا پھر والہ اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ کھٹے
"کھٹے دل میں کچھ ایسا احساس لئے وہ کوشش کے باوجود ان کی طرف
"ایک لمحہ نہ سکی۔
"اے تم یہاں کھڑی کیا تمنا دیکھ رہی ہو لڑکی۔ جاؤ جلدی

منائیں اور خوب عیش کئے۔ اس عرصے میں اس سے برابر مل کر کرتی
رہی کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔ اور وہ برابر باں ہوں کہ مجھے ٹانہ مارا
پھر ایک رات جب کہیں سو رہی تھی۔ وہ میرا زور اور روپیہ لے کر
چپ چاپ کہیں فرار ہو گیا۔ وہ سکر و جب میں سو کر اٹھی تو میسرے بستر
پر ایک پرچہ پڑا تھا۔ جس میں عارف نے لکھا تھا کہ وہ روپیہ و زور لے
کر جا رہا ہے۔ میں اسکا انتظار نہ کروں۔

اس کے بعد مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میں جھڑ
جاتی مجھے لوٹنا جانا۔ میری عزت کی وجہاں اڑائی جاتیں گھر جاہیں
سکتی تھی۔ دنیا میں اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ جاتی تو کہاں۔ بڑھن نے
ہمدردی اور ہنس کے نام پر مجھے دھوکا دیا۔ ایک شخص نے جانی کہ مجھے
اپنے غلوں کا لٹکین دلایا یہاں سے کی پیش کش کی۔ میں نفاس پر پڑی اپنا
کیا کیا نہ دولت شریف مجھے بازار حسن کے ایک دلال کے ہاتھ فروخت کر گیا۔
اور میں یوں ایک مضمحل لڑکی سے عورت بنی عورت سے طوائف بنی اور
کو کبھی کی نہایت بنا دی گئی۔

آج اس واقعہ کو دس برس بیت چکے ہیں میں اب بھی
بازار حسن کی نہایت بنی دولت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ لوگ آتے ہیں اور
چلے جاتے ہیں۔ عارف کے گناہ کی نشانی ایک خوبصورت بچی کی
شکل میں میسرے پاس ہے جسے دیکھ کر اکثر میں یہ سوچا کرتی ہوں۔
"کاش میں عارف کی جھوٹی محبت میں گرفتار ہو کر یہوقوف
رہتی ہوتی۔ تو آج میرا بھی ایک گھر ہوتا۔ اور یہ بچی جواب دنیا والوں کے
لئے ایک گالی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک باعزت گھرانے کی قابل احترام
لڑکی ہوتی۔ (دیا سیہت۔ لاہور)



روزانہ

شوہر (پڑوسی سے) کیا آپ کو مسلم ہے
رات آپ کے ٹھٹھنے میری ماس کو کاٹ کھا۔
پڑوسی۔ معافی چاہتا ہوں، میں مسیح پسند آدمی ہوں،
عدالت میں جانا پسند نہیں کرتا۔ آپ مجھ سے کی جوتیم
تجزیہ کریں گے، میں ادا کروں گا۔
شوہر۔ تو مٹنے مجھے وہ گنا چاہیے ہیں اُسے
کوئی تعینت نہیں ہونے دوں گا۔
موسل۔ اکھیک بٹا، لاہور



کے بعد آخر میں نے عارف کی بات مان لی۔ اور ایک رات جب کہ میسرے
والدین سو رہے تھے میں بہت سا زور اور پیسے لے کر چپ چاپ رات کے
اندھیرے میں اپنے گھر سے نکلی۔ عارف نیچے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرا
ہاتھ پکڑ کر چپ چاپ اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔
اور اس رات..... میں عارف کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر
کراچی سے لاہور آ گئی۔
میں اپنے ساتھ تقریباً دس ہزار روپے کے زیورات اور تین
ہزار روپیہ نقد لے کر آئی تھی۔ ایک بیسٹ تک عارف نے خوب ہنگام لیا

سے سرکے لئے جانے لگا اور آخری جان نے اسکی موت پر لوکا تو وہ ایک دم ہڑکارت سے نڈی سے باہر نکل گئی۔

پھر میدلی سے چائے کا اہٹا کرتی وہ اپنے خیالات کے تاروں بانوں میں ابھی رہی۔ اپنی جھین سے زیادہ اسکی حماقت پر فخر کرتا تھا آخر مجھے کیا ہوگا کتنا حواس نہیں دیکھنے کی جارہی تھی اس نے دھوئے دل میں آئی تاب کماں، جو مزید کسی بات کا بوجھ نہ رہا۔ وہ بھی شارق کا دی شارق... پانی کھلنے کے ڈھکے کو اچھالتا نیچے گرنے لگا تو اسے ہوش نہ آیا۔ پھر سب کچھ بھول کر جلدی جلدی چائے کی دکان اور سٹاٹھ گھر لگنے لگے میں نے آئی۔ سب بدلتے ہوئے میں مصروف تھی۔ وہ میز پر ٹپسے لکھ کر جانے لگی تو چچی جان بولیں۔

”اے چچیں کہاں چلے نہ کر دو۔ اتنا سا کام بھی نہیں ہوتا تم سے۔ چچی جان کے لیے میں جو جھین تھی اس کی وہ مادی ہو چکی تھی اسلئے خاموشی سے چلنے پھیلنے میں اٹھ بیٹھ لگی۔

”ایک بات تو بتائیے امی جان۔ عیسائی عزم کی پڑاؤ تو نہیں؟ عرفان نے یہ پوچھا گو اب شریا جیسو دی بجھت اور نہ بہت بھی شارق سے باتیں کرتے کرتے ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”اے میں کیا جانوں۔ کوئی اس کی دانی نہ ہوئی ہوں۔“

چچی جان نے لاک بڑھا کر کہا۔
”آؤ تو اسے ایسے ہی ہیں۔ عرفان نے مسکرا کر کہا بجھت اہ نہ بہت بننے لگیں۔ شارق اس دوران لائق سے بیٹے ایک دیکھ میں تیرتی رنگ بڑی پھیلوں کو دیکھتے رہے۔ مگر سن تو سب دے جتھے تا سہی احساس اسے مشغول نہ کرنے کے لئے کیا تھا۔ چچی جان کو چائے کی پیالی پکڑا کر جب وہ جھکتے ہوئے شارق کی طرف بڑھی تو بجھت نے پھلکی سے ہاتھ بڑھا کر پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی اور شارق کو ددی اور جب وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیکر نکلا جھکتے کرتے سے باہر نکلنے لگی تو شارق کی آواز نے اس کے ہرستے قدم کو روک لیا۔

”یہ ابھی تک نہیں ہم مانی جان؟“ شارق امی کے مائے میں پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔ اور کہاں جاتی۔ ادا نے تو کبھی ہٹ کر نہ پوچھا اور پوچھ کبھی کیا کرتے۔ سنلیں میں ایک دن بھی گھر میں رکھنے کی ڈار نہ ہوتی یہ تو میری دم تھا۔“ چچی جان اتنی حقارت کبریٰ تھیں کہ عیسائی کو اپنا جگہ پائش ہوتا محسوس ہوا۔ مزید کہنے کی تاب نہ ملنے چچی جان گئی بات کا جواب شارق نے لیا دیا۔ ”خاہر ہے۔۔۔ ابھی کے اعلان

میں دیا ہوگا۔ انہیں تو ہمیشہ سے مجھ سے خمد واسطے کا پر ہے۔ چچیں کا وہ تیغ ترین واقعہ اپنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اسے اسی طرح یاد تھا جیسے کبھی ہوا ہو۔

ان دنوں وہ نئی نئی چچیاں کے یہاں آئی تھی شارق اس زمانے میں متعلق طور پر نہیں رہتے تھے کیونکہ وہ اپنی نانی یعنی عیسیٰ کی دکان کے سب سے زیادہ لڑنے لڑنے والے تھے اور دادی امان نے انہیں کوہ لے رکھا تھا۔ بجھت نہ بہت اور عرفان کے ساتھ ساتھ شارق بھی اسے ستانے اور ملانے میں پیش پیش رہتے۔ کبھی اسے دھکات دے دیا کبھی مذاق میں نرنا لے کر دھکات دے دیا۔ کبھی اس کی چوٹی پر ڈاکر اتنی زور سے کھینچی کہ پیچیں نکل گئیں۔ کبھی باتیں باتیں چچی جان سے اسکی شکایت کر کے اسے ڈانٹ کھولا دیا عیسائی بچہ ہی ان کے بھٹوٹے کھلاتا ہی سب کچھ کہے گئی۔ اور اس کی بے بسی اور خاموشی سے ناامدہ اٹھا کر شارق کچھ زیادہ ہی مادی ہوتے گئے۔ اس کی ذہنی چوک پر ایک قیامت کھڑی کر دیتے اور یوں کھجلا جتے جیسے وہ ان کی زنجیر ہو۔ ایک دن تو وحشی ہو گئی چچی جان حسب عادت اپنی ہیرے کی انگوٹھی کہیں رکھ کر بھول گئی تھیں اور اپنی فطرت کے مطابق ہر ایک پر رشک کر رہی تھیں۔ خاص طور پر ملازم چھو کر سے غمور کی شامت گئی آتے بہت ڈر دیا۔ دھمکا بامگراں نے لی ہوئی تو کچھ بولنا بھی بجھت اور نہ بہت نے سارا گھر حسیان مارا۔ مگر ان کی بھی پوچھ گچھ ہوتی مگر کوئی ملتا نہ تھا۔ ملی عیسائی زبان میں انہیں پوچھا تو ان کی بھی ہاتھ دھوئے غسل خانے میں گئی تو وہاں کی عیسائی کی وہ انگوٹھی ملے لگی۔ اسے دھوئے کے ادا سے جوڑی تھ کے اسے ہاتھ بڑھایا۔ شارق پیچھے آگئے۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی چوٹی پکڑی اور باہر لے آئے پھر پیچھے جھک کر کہنے لگے۔ ”آئیے مانی جان!۔ آپ کی انگوٹھی کا چوری نے پکڑ لیا ہے۔“

سب دوڑے دوڑے آئے۔ اور چچی جان نے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں دیکھنے کی ملا تو فتنے پھٹنے اس کے گالوں پر چڑھ گئے۔

”اب یہ کس کی ہو گئی تھی چوٹی میں گئی۔ بے نانی اس کی اور لا بجھت دو دن بھی گھر میں نہ رہ سکی پہلی گئی اپنے آشتی کے ساتھ اب یہ اسکی گھنٹھیں پائی پڑ رہی ہے۔ لکھ دوں گی میں بھی شریا جی کو کہ اسے جلاں تھے۔ میں نے تو جوں اور دھاروں کو پالنے کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ چچی جان پھٹکار کے دو گھر سے برساری تھیں اور سب کھڑے بڑی جیستی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور اسی میں اس کا کٹھا لٹا

”اے مانی! اپنی گھر میں تو کبھی کسی نے میری نگاہ سے بھی اس کی ڈانٹا تھا۔ کہا کہ اپنی اور میں ملے۔ وہ ہلک ہلک کر دنگی۔“
”تاگ اڑائی تھی یہ۔ چچی جان نے اس کے ہلکے غصہ تک اسے سنا۔ ہم کلاس نے اسے جلتا بتا دی مگر کسی کو یقین نہ آیا۔ خصوصاً اس کی بڑی کو وہ دیر کی خالو سے کہیں کسب کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ کیسے نہ نہ میں مبتلا رہی ہے۔ اور کس چالاک کی سے اپنے جرم پر پردہ ڈال رہی ہے۔ ان دنوں ان کی عمر سو لہا ستر سال تھی نظر اتنا نہایت ذہین اور کچھ نہ تھا۔ مگر کہیں ان کا مرتبہ اور حیثیت بھی مفروضہ تھی اور جب سے کچھ چچی جان نے بجھت کو اپنی بیوی بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی چچی جان کی نظروں میں ان کی ذہن چوک سے کچھ گھٹی تھی وہ اس سے پہلے چچی جان کو شارق کی گھر میں متعدد ملازمتیں کرتا کرتا تھا۔ وہ تو دادی امان کا لٹا ہوا تھا۔“

اس نے کھل کر مخالفت نہیں کرتی تھیں۔ ہر حال اس نے تو چچی جان نے اس کی حالت زار پر ترس لکھا۔ رحمانہ دشت کر دیا۔ لیکن شارق نے اب متعلق اس کا سنا۔ چوٹی کھدیا۔ پھر سب اسے اسی نام سے پکارتے گئے۔ حتیٰ کہ غفور بھی، جسے اسی گستاخی پر دیکر ان چچا جان نے خوب ٹھونکا تھا۔ چچیں ہی سے بات بات میں اپنی اپنی کاکڑان الفاظ میں سنتے سنتے اس کے قصور سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی اور بے شوری سے اس کے بعد تو اس کا آواز سنانے کی طرح لگتا۔ حالانکہ اس کی بانی کا کوئی اسے قصور ہی نہ تھا۔ آؤ اب میں بغزت طریقے سے سیکڑوں آدمیوں کے سامنے یہ کہہ لائے تھے۔ مگر یہ ان کی پسند کی شادی تھی، جو دادی امان کی ہزار محنت کے باوجود کسی نہ کسی طرح انہیں رخصتی کر کے لے جانے لگی تھی۔ ان دنوں لڑا ہوا تھا۔ اور اپنے بڑے بیٹے کے طرف لڑ رہی تھی اس نے بھی اتنی سے اس کی شادی ہو کر ہی ددی دادی امان نے شروع شروع میں تو سوہنی بڑی اور نہایت کی گویا اشارہ چچی شادی ان کی گئی بھائی سے ہوئی تو اتنی کی آمد جاتی رہی۔ اس پر ہم بالسنے ستم کر شادی کے تین سال بعد عیسائی پیدا ہوئی۔ اور دو روز کے خواب دلی دادی امان کے ہاتھ ہو کر مخالفت کو ایک بات گئی۔ اور عیسائی کی پیدائش سے پہلے عرفان پیدا ہو چکے تھے اور چچی جان شادی کو بچا دیا کہ اس نے لڑی اندر رہ کر گھومتی رہتی تھیں۔ اتنی دنوں مال تک نہ دیکھ سکتی تھیں۔ عیسائی کے بعد کوئی اولاد بھی نہ ہوئی تھی۔ آؤ آخر دادی امان کی باتوں میں ہی کے ادا سے اسے نغمی رہتے لگے۔ اتنی بات تو اب تک جی رہی تھیں جب یہ سارا بھی کھولا ہو کر گرنے لگا۔ اس کی موت پر جب دے گئی جس کا تھوڑا سا کی صورت میں نکلا۔ اس نے اپنی بیوی چوٹی کا زور لگایا کہ عیسائی کے پاس رہے مگر بولنے

علانیہ کا ڈانٹ کر کے عیسائی کو ان سے جین لیا۔ عیسائی اس وقت سات سال کی تھی۔ ایک برس انہوں نے اسے اپنے پاس رکھا۔ مگر ددی امان سے یہ بھی گواہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا گھر بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس اور کو کا دوسرا کٹھن ہوا اور دھو کر کو دادی امان کے پاس ڈانڈ کر دیا گیا۔ اور یوں ہر طرح کی محرومی اس کے لیے باندھ دی گئی۔ چچی جان نے تو اسے واقعی زنجیریں بچھ لیا تھا۔ اسی میں عمریں کڑا کے کی سر دلوں میں اس سے سارے کام لگائیں۔ دادی امان کی تمام تر خدمت بھی اس کے سپرد تھی۔ بات بات میں ڈانڈ پھینکا۔ کتا فطرتی۔ یعنی طعن۔ اس سب باتوں نے اسے ٹھیکے ٹھیکے سے ذہن کو مفلوج کر کے رکھا تھا۔ جسے کوئی خود کار شین میں اس کی احساس کا شائبہ نہ ہو۔ مگر کہیں کبھی کسی طرح کو زبردی گھبرا دیا۔ عیسائی کو جانی کی منزل میں قدم رکھا۔

پڑنے لکھنے کا سہ لے اپنا شوق تھا۔ لیکن چچی جان نے وہ بھی پورے ہونے دیا۔ دادی امان کے دہلے اور حجامان کی حمایت کی وجہ سے میٹر تک ہی پڑھنا غصیب ہو سکا۔ اور لڑنے لگے تھے ہی دادی امان کی کچھ بندہ رہی تو چچی امان کو سن مانی کر کے کو مٹھ لگایا۔ انہوں نے چچی جان کی ایک دھپلے دی۔ اس نے تعلیم سے ہاتھ دھوئے ہی پڑے۔ آؤ تو دیکری شادی کر کے اور اسے یہاں چھوڑ کر جسے اس سے بڑھ کر توڑ دیتے تھے۔ اتنی بڑی جاہل کے ہاتھ تک تھے۔ جن میں بھی تھپتھپانے پھل رہا تھا لیکن مجال بھی کہ ایک پسرا کوئی معمولی جیو بھی اس کو بھیج دی جاتی کیسے نہ تھی اس کی بھی۔ وہ کچھ سے سوچتی رہ جاتی۔ سب کچھ کہتے رہتے بھی وہ ہر چیز سے مجرم ہے۔ اتنے سلسلے جنوں کے درمیان رہ کر بھی غیر لڑا رہی ہے۔ اسے ماں باپ کا سایہ بہتے ہوئے بھی لا دوڑوں کی ہی زندگی گزار رہی ہے۔ اس احساس نے اس کو اتنا مایوس کر دیا تھا کہ دل سے جینے کی لگن بھی جاتی رہی تھی۔ شارق کو کہیں ہی سے فوج میں جانے کا شوق تھا۔ اور اسی شوق میں وہ صرف گرجن میں ہی کر کے۔ ددی امان فوج میں جانے کے تحت خلافت تھیں اور کسی طرح اعزاز تھی ہی دیتی تھیں۔ لیکن جب ان کا استقبال ہو گیا تو شارق فوج میں بھرتی ہو گئے اور اب وہ پورے پانچ سال بعد چچی جان کے یہاں آئے تھے۔ ایک تو دادی امان کے انتظار کی وجہ سے ان کا یہاں آنے کو دل ہی نہ جاتا تھا اور دوسرے اپنی کسی فوجی بزنس کے سلسلے میں وہ بالائی بالائی ملک سے باہر چلے گئے تھے اور تین سال وہاں گزار کر گئے تھے۔ ظاہر ہے پانچ سال کا عرصہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ ایک دنیا بدل جاتی ہے، شارق کی شخصیت میں بھی ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ دیکھ کر دل گئے تھے۔ نظروں میں بدل گیا جاکر اپنی ہی کبھی سمجھی وہ حیران ہو کر سوچتی

اس قدر باتوں پر خود مسرا اپنی ہی بات دور کئے والے غرور اور تکبر میں ملوث بن کر
بصر اور حواس کی خلعت پہن کر باہر ہوتا سنجیدہ و ریزہ و لو کہ کچھ سمجھتے تھے۔
وہی جان سمیت تقریباً سب ایسا ان سے شرعاً نظر کرتے۔ وہ تو یہ سب سوس
کچھ ہی جاری تھی کہ اب یہ آئے ہیں تو نہ جانے کیا کیا بھلائیوں کے۔ کسی کی
طرح میری تختہ کے سامان کر کے مگر انہوں نے توجہ دینا تو کہا۔ اس کی
طرف دیکھا مگر نہیں۔

جو یہ تھوڑا سا کام کریں۔

”نہیں بیٹی گھر لڑی تو لڑی کوئی چاہیے۔ یہ کوئی بیٹی نہیں بڑی بڑی بادشاہ نادراں کرتی آئی ہیں، پھوپھی جان بولیں اور جب بیٹا لڑو کے ساتھ باہر جانے لگی تو عرفان مسکرا کر بولے۔

”اپنی نظر انداز نہ کرنا غصہ اور عداوت ہے۔“

گورخان نے بہت آہستہ سے کہا تھا مگر زہرتہ نے تن لیا اور جرم سے اذہم بولی۔ ”کہہ دل آئی جان سے کہ عاجز اس نے بہت ہاتھ پر رکنا لینے ہیں۔“

”کہہ دو۔ میں نے کوئی ایسی غلط بات کہہ دی۔ عروغ کی ایسی رہی ہیں۔“ عرفان نے ڈھٹائی سے کہا شادق نے بات کرتے کرتے بڑی معنی خیز نظر دے ان کی طرف دیکھا اور وہ جلدی سے فریج کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

عرفان اسے پس و لاوارث دیکھ کر ہی تو اس کے جذبے سے کھینچا جا رہے تھے۔ اسے غریب احساس تھا کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ مگر شادق کے سامنے ان کا یہ بے اختیار ساز و باز اس کیلئے ناقابل برداشت بننا جا رہا تھا۔ لیکن کبھی کیا کتنی تھی، آٹ کھانے کی مجال نہ تھی۔ ان دونوں وہ ایک عجب کی کشش سے دو جا رہی تھیں۔ ایسی بیٹی اور افسوس تو اس کی زندگی میں کبھی پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں عروس ہوتا تھا جیسے سوہا ہوا پس اس اپنی اہلی شہت سے جاگ اٹھا ہو۔ اور اس مال جاگ جائے تو اس ان کو رکھنے بیٹھے نہیں دیتا تھی تو یہ احساس کہ اس کی پرواہ نہ کرے والا کوئی نہیں ہے اسے ایک ایسی کسک دے جا کر وہ ”خرب چڑپ اچھی۔“ میرے اندر تو کوئی خلش ہے رنگن۔ بھریہ دین دین سی رہی تھیں اتنی خوشنکاح کیوں گئی ہیں۔ میں ان کیلئے عادی تھے ہوسے بھی ان سے کیوں گھبراتی ہوں۔ مجھے تو اپنے گریہ کیلئے نفرت کی اس غبار سے پیار ہونا چاہیے۔ پھر اپنی فوڈیوں کا احساس سکڑل کو بھید کیوں جا رہا ہے۔ ان دونوں وہ اس قدر اس ہونے لگی تھی کہ اس کی صحت بھی متاثر ہو نہ لگی۔ منہ پر تو خوشی کی جہرں لگی تھیں اب خیالات بھی اکادہ ہو کر چلنے پھرنے۔ ایک دن وہ اپنے اچھی خیالات میں اچھی اچھی کو ریڈو سے گزرتی تھی کہ کاجک وفات نے سامنے سے نمودار ہو کر اس کا ساتھ لے لیا۔

”آؤ کیا بات ہے عرو۔ تم مجھ سے اس قدر ترن کیوں ہو۔ میں تو تم سے بات کرنے کو ترن رہا ہوں ان تم ہو کہ کسی موت تو ہی نہیں دیتی۔“ بظاہر عرفان نے بڑی عاجزی اور پناہیت سے کہا مگر ان کی بات کے چہرے

جو تھکا کر رہا تھا اسے وہی غصہ جانتی تھی۔ وہ جرم سے اذہم بولی۔ ”میں آپ کی نظر کرم کے قابل نہیں عرفان بھائی۔ مجھے بیسے حال پر چھوڑ دیں تو بیسہ ہوگا۔“

یہ تو کوئی میسڈل سے سوچے کہ کس کس قابل ہر شہر تھیں میری فوج پر اہل تہذیب ہو تھو مجھے ان باکسی تھی ہو عرفان کا ہوجہ بانی ہو گیا۔

”شادق کے تہذیب کر لیا ہے مجھے روم کے رہیں گے، لیکن۔“ عرفان بھائی میں بے پس خرد ہوں مگر بے عزت نہیں۔۔۔ بلکہ مہاراستہ چھوڑ دیجئے، اسے کیم تار لیا مگر عرفان نے اپنی جگہ سے خیش بھی نہ کی۔

وہ بے ہنگ نظروں سے اسے دیکھنے لگا کہ اسے تو پتہ نہ تھا کہ وہ اس پر تہ لگی مگر جیسے ہی سامنے نظر پڑی شادق کو کھڑا کھڑا کیم کو کھڑا گئی۔ اب تو کسی نے فتنے کا کھڑا ہوا باقی تھا شادق نے سب کچھ دیکھ اور اس لیا تھا عرفان اس کی سوانی کے سارے سامان کر چکے تھے۔ وہ خاموش کھڑے کچھ دیکھ رہی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہوں کی تھیں

کون سے محسوس تو کیا مگر لگاؤ تھا کہ ان کی طرف دیکھنے کی بہت نہ پڑی اور جب وہ اپنی خاموشی سے چلنے کے تو وہ اپنے کانٹے جود کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی شادق کی غیر معمولی خاموشی خطرے کی علامت تھی اور عرفان کھنے کچنے جہاں کہ اس کے کچھے ہو گئے تھے اور اب تو وہ اپنے جذبات کا اظہار کلمہ کلمہ سب کے سامنے کرنے لگے تھے۔ ”نہیں تو کئے یا

تنبہ کرنے والا کوئی تھا کہ کوئی نہ دھرتے اور سب سے بڑھ کر چاہا جان کے کلمے لاؤں بیٹے۔“

پھوپھی جان اپنے گھر واپس جا رہی تھیں اور فریج بھتیجی کو عرو بھی ان کے ساتھ چلے عرو کھلا اپنی مرضی سے کہیں جانے کی قدرت کہاں رکھتی تھی، وہ انکار ہی کرتی رہی۔ آخر فریج کو بھی جان سے کہنا پڑا۔

”مافی جان عرو کو ہاے ساتھ بھیج دیجئے۔ ذرا اس کی آب ہوا تبدیل ہو جائے گی۔“

وہ کیسے جاسکتی ہے بھلا۔ بیچوں کے استمن نزدیک ہیں، بیچا طبیعت اچھی نہیں رہتی گھر کے کاموں کو رنگے بھی جان سے خدہ پیش کیا فریج کو ان کی بات بہت ناگوار گزری۔ ”تک کر بولی۔“

”گھر کے کام تو جرم ہو بھی کر سکتی ہیں۔ آخر ہلا بھی تو اس پر کچھ ہے۔“ ہاں حق تو سب ہی جانتے ہیں لیکن ساری ٹھیکیز تو ہیں نے بھگتی ہے۔ شادق بھائی نے تو لاڈلوں کی طرح بھر پر جھوڑ کر کہانی

کی خبر تک نہ لی۔“

”ہاں ہاں آپ کو جرم نہیں آتا کیسے نہ میرے کہہ رہی ہیں۔“ انہر کے ”ہاں۔“ وہ لاوارث کہیں بہنے لگی۔ وہ اصل تصویر سارا ان کا ہے اپنا کہہ رہا کہ وہ اپنی اولاد کو بھی بھول گئے۔ ایک تو جرم کرم کی ہی ہے ان کی۔ لیکن پھوپھی جان اگر ایسا ہی ہے تو وہ عرو کو اپنے پاس کیوں نہیں لے آتے جو بھاری آبی سارا بوجھ ڈال رکھا ہے۔ وہ بھگت ہی تقدیر کے مال کی کرم کو بھی جان نے بڑے بڑے ہائی اذہم میں کھل

”تم چپ بخت، خبردار عرو بڑل کے پیچ میں بولیں۔“

پچھ جان سے بھلا سب کیسے کوارہ ہوتا۔ ہل کھا کر دیکھیں ”ہاں۔“ ہاں بخت، تم خاموش رہو، پچھ جان نے بھی بخت کو نوک لاس بھی کر تھا چھ جان نے سارا فخر چھ جان ہوا رہا۔

”تم تو خوار ہو بولیں بیٹی۔“ یہ لوگ تو سب ایک منہ ہو کر دوسر کو نکو بتا دیتے ہیں مگر میں ساری باتیں خوب بھتیجی ہوں۔۔۔ یہی ساری بخت ہوں کچھ بول رہا ہے۔ جب باپ نے اسے دھککا دیا تھا تب اس کی کھٹا نہیں پڑی تھی۔“

”اسے پس رہنے دیجئے بھائی جان انوار کو تو کھلا لے سے کیا فائدہ۔ مگر ان بچوں کو تو بد نظانی نہیں سکھائیے۔ آج میرے منہ لگی ہیں

کھن۔“ پھوپھی جان اتنا ہی کہہ پانی تھیں کہ شادق خنص کے عالم میں کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ اور ان میں اختفا دیکھ کر سب کو مارا ہوا ہوا تھا۔ عرو فریج کی طرف فریج کے پاس کھڑی ساری باتیں سن رہی تھیں شادق جاتے جاتے اس کے اوپر سے متشرفانہ اذہم میں بولے۔

”خدا کی جزا تو تم عرو پر تھی تمہاری وجہ سے اس گھر کا چین کون سب ان پکڑا ہے۔“

الفاظ تھے باہر میں مجھے تیرے جو ایک ساتھ دل پر لگے تو کھنوں میں سوئیاں میں جیسے دھن دھن کھائیں اٹھا کر بڑی بھاری گئی سے ان کی طرف دیکھا مگر شادق نگاہیں کتر کر تیری سے باہر نکل گئے اور وہ

”ہوں۔“ چرچہ چرچہ دل لے۔ اپنے فرائض انجام دیتی رہی اس کی جڑ سے بننا نہ ملنا، احوال کدھر ہو چکا تھا لیکن یہ کدھر تو اس ایسی کدھر تھا تم

”وہ نہ بولتی تھی جان انچوں میں تو میں باتیں ہوتی رہتی ہیں جہاں وہ تھکتے ہیں کھڑے کھڑے خود ہی آہیں کی چڑچڑ اور

”ان کے اچھوڑ سب ایک ہی رہتے ہیں۔ ناخوشی سے گوشت کب سامنا ہے۔ ناخن گوشت تو وہ بھی تھی، مگر ایسا گوشت جس کی بغیر

”ملے۔“ ان کے ہی دیتے۔

پھوپھی جان چلی گئیں۔ عرفان کچھ انوں کے لئے اور گئے

گروں کی گھر میں موجود گھر کے لئے سخت تکلیف کا باعث تھی بخت اور زہرتہ اپنے کچے اور شادق ڈیوٹی پر چلے جاتے اور عرفان رقت اس کی نگاہیں بہتے لوکب موقع ملے اور کب وہ اپنے ناشائستہ جذبات کی ترانہ کریں مگر یہ کوئی موقع ملنے کی نہیں حسرت ہی ہو گئی سختی کو ان کی زندگی کا وقت گیا۔

گروں بات دھان وقت اس کے گھر سے منہ چھپے وہ کھنے کے لادے سے اپنے بستر پر لیٹ ہی تھی۔ بہت دیر میں نے حرکت کیا اور ان کی

گود دھانے پر کھڑا بڑی بے تکلفی سے کھانا دیکھ کر وہ سوچ گئی۔

”تم تو شاید بات کرنے کا کبھی وقت ہی نہ دو اور میں کس صبر جاہل ہوں اس لئے آج اپنے ان تقاضوں سے محروم ہو کر رہا رہا۔“

عرفان نہایت دیر سے اس کے گھر سے بولے۔ ان کی اس جرات پر وہ پڑی عرو کو فخر آ گیا۔ کیا اب اس گھر میں ہی عزت بھی محفوظ نہیں رہ سکتی اس نے سوچا۔ اور پھر بولی۔

”عرفان بھائی۔ میں تجھ کو ملے بہت نہیں۔ آپ شاید اس حقیقت کو بھول رہے ہیں کہ اگر آپ فوراً نہ گئے تو میں بھی پیمان کو کران سے آپ کی شکایت کر دیتی۔“

”اؤ۔“ یہ جرات تیری شکایت کرنے کے ناکام بھی جاتی ہو کر گیا ہوں گے ہاں تو ذلیل خوار رہ گئی۔ اپنی بخت بھول گئیں کیا۔ مہم ہو جانو تو کوئی تم پر سوسے گا بھی نہیں۔“ عرفان کا دھمکاؤ ”میں جو اخلاق سے گرا ہوا ہوں

تھا مگر انہوں نے جو کہا تھا وہ غلط تھا۔ جہاں میں عرو سسک پڑی تھی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ کچھ نرم ہو گئے۔ وہ سب دیکھ کر تو میں نے سوچا تھا کہ کہیں ان پتہ میں سے نکالوں۔ کہیں اپنی محنت دیکر۔“

وہ روتے روتے ان کی بات کاٹ کر بولی۔ ”نہیں نہیں۔ خدا کے لئے مجھے کسی کی بخت چاہیے نہ نفرت۔ میں اپنی تقدیر پر شاکر ہوں خدا آپ۔ آپ۔ یہاں سے چلے جائیے اس وقت کوئی آگیا تو کیا ہوگا۔ اس خیال سے وہ سخت ہل رہا تھی باہر کچھ آہٹ ہی ہوئی جسے نہ کھانا

چلیز جاتے بولے۔

”تم بھی اس سوچ سمجھو۔ بعد میں میری ریا دتی کا گھر نہ کرنا۔“

ان کے جانے کے بعد عرفان نے اپنی ساری کام کرتی۔ اپنی بھگت پر ہی لگی تھی۔ دولہے پر بھاری جوتوں کی بہت ہوئی تو وہ اپنے غریب خیالوں سے جو تک پڑی۔ شادق۔ اپنے چہرے پر بڑا سارا تڑپنے لگے نظر کرنے اس کا کام نکلیں کہ وہ گلیا تیری سے بہتے ہوئے اس کو بھی تک بھگتے جرم کا

سلاخوں جیسے کسی نے چھڑا لیا۔ ایسے میں ان کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر ہوتی۔ جرموں کی طرح سر جھکا رہے تھے، نگاہیں نیچے کمری رہی اپنی بخت

پراس کا دل خون ہوتا تھا ان کے منہ سے سخت سے سخت بات نکلنے کے انتظار میں۔ ان کی مسلسل خاموشی بڑی مہربان اور جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اب تک دو دنوں سے ہی کھڑے تھے۔ ایک سوڑھمی کے عالم میں اس کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے ایک عیب ساز اثر ان کی آنکھوں سے پیدا تھا جس نے اسے بونے پر مجبور کیا۔

”شارق بھائی۔ میں۔ میں بالکل بے قصور ہوں یقین کیجئے“

شارق بھائی وہ... وہ خود... باقی الفاظ وقت اور الجھاپٹ کی وجہ سے اس کے گھسے میں ہی لپک کر رہ گئے۔ شارق کے تجزیہ پر جس پر بھی ہلکی ہلکی کڑواہٹ کھیلنے لگی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ دیکھنے کی گہرائی سے بولے۔ بات کا منہ پر واضح نہیں تھا اس پر یہ دلی دہائی کی صورت تھی۔ وہ بھاری کی تصویر پر ہی توجہ دے کر نظریں نکالتی۔ تو ایک دوسرے میں جھک کر گئیں۔ زندگی میں پہلی بار لگا پڑا تھا وہ۔ دل نشینی کی تمام تر خصوصیات سمیٹ لیا تھا۔ یہ عارضہ ظاہر کرنے ان کی تین نظروں کے نامعلوم قوتوں میں بدل گئے۔ مگر اس پر تو بے یقینی و استہجاب کا عالم کہ اس شدت سے طاری تھا کہ اب کچھ سمجھ نہ سکی نگاہیں پرانگی۔ ”تم کہہ تو ہیں یہی ان صاحبزادے کا وارث دوست کر دوں؟“

شارق کے منہ سے یہ الفاظ نکل کر اسے اپنی طاقت پر یقین نہیں آیا۔ وہ شخص بن سے سدا اس کی مخالفت ہی کی تھی۔ وہ زبان جس نے سبکے سامنے اسے جوتی کھڑکھڑیل ڈھونڈ لیا تھا۔ اس روز بھی سبکے سامنے اسی زبان نے یہ زہر مسیبت الفاظ لگائے تھے۔ ”سادا کی جڑ تو تم پر ڈھیر ہے۔ وہ زبان ان میں کی ہمدردی کے ساتھ ساتھ ایک کسان کی داستان بیان کر رہی تھی۔ دل میں دوسلوں کا جرم لئے اس نے ہنسیا رنگا ہونے سے کئی طرف دیکھا۔

”نہیں شارق بھائی۔ نہیں۔ آپ تو اس گھر میں میری حیثیت سے واقف ہیں۔ اس کا بوجھ بھائی اور دل شکن تھا۔ شارق اس کی طرف بڑھتے چلے آئے۔

”وہ بات تمہارے منہ سے نہیں شارق کی زبان سے نکلے گی“

کہا میاں سارا تھیں کافی نہیں۔ وہ اس کے بالکل قریب آگئے اور اس کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حصار بنا دیا تو وہ ان کے کشادہ سینے سے مڑ کر پھرت پھرت کرنے لگی۔ شارق ہمارا دینے کی بات کر رہے تھے، اتنی بڑی اور ناتواں یقین بات۔ یہ گھر بڑی شارق کی ہی بات کا دل زلزل تھا شاید!

”میاں سارا کہیں... ڈوٹ حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے گا۔ چچا اب تھک چکے ہوں۔ انہیں دیکھ کر سخت غمزدگ ہے۔“ وہ خود ہی الگ بٹ

کھڑے۔ اور دیکھ اپنی اس بے ساختگی پر رشک کرتے۔ سونچنے کے لیے کوشش کرنے لگی۔

”وہ دل ہلکنے لگا۔ آئندہ میں تمہارے اس گھر واپس آنا کا تمہیں ہر گھون گاہے ان کے لیے میں ان کا مخصوص حکم چمکے گا۔ ہاتھ مالک وہ بے ہمتا ہمدردی سے کہہ رہے تھے۔ دنیا یوں بھی بدل جائے گی عید کو کسی طرح یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ مگر کراڑیوں سے تم اور وہیں کھڑے ہو پوٹوں کا سین غلاف ڈھانپنے وہ اپنی انگلیاں مڑھنے لگی شارق کو معلوم تھا کہ جذبات کا یہ سہارا تو عمل کے ساتھ ہی کا توجہ ہے۔ وہ تو اس روز ہی اس کے زیر نظر سے گھاٹ ہو گئے تھے جس دن وہ ان کے سامنے سانسو بڑھ کر ایک انوکھی سچ و سچ سے آئی تھی۔ ان کے اور اس کے درمیان فاصلوں کی یہ باتیں طویل تر تھیں۔ جسے آسانی سے دیکھا نہیں مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ جی تو خاموشی کا لہجہ اس کی ایک نامورش تماشا کی کی طرح وہ حالات کا ہنر نہ رہے تھے۔ مگر عرفان نے بیچ میں کود کر دراپنے آدھے جذبات کا اظہار کر کے ایک ہی پس میں سامنے خاتمہ کر کے رکھ دیے۔ انہوں نے زیادہ کہہ کرنا سنا ہے سمجھا اور اسے یوں ہی حیرت زدہ و سوگوار سا چھوڑ کر چلے گئے۔

حیرت و استہجاب کا غلبہ کم ہوا تو قص پر چھائی و خند چھنے لگی۔

”کیا میاں سارا تھیں کافی نہیں۔ یہاں روک نہیں ڈوٹ حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔“ الفاظ کی بازگشت نے اسے سراسر ادا کر کے رکھا۔ نہیں نہیں یہ ممکن ہی نہیں۔ میں کیسے یقین کر لوں۔ ایک وہ اڑا تھا۔ میرا ہاتھ بھڑکنا ہوا شعلہ۔ اور ایک یہ انداز ہے۔ جیسے دھوپ کی تازہ تازہ چھلنے لگے پھولوں پر پھٹی ٹھنڈک کا پھلا یا کھدی گیا ہو... ان خدے یہ سب کیلئے وہ خود اپنا ہی سر کھینچ کر مجبور ہو گئی۔ یہ جیسا میٹھا سادو یا انسانی ہی توجہ پر دلی ہی خلش، جس کی محرومیوں میں جینا کہاں سے اگر شامیل ہو گئی تھی۔ شارق کی خاموشی پتھر کے تھپتھے میں ہی تھی۔ شارق کی اتنی خیر نفرت کے باوجود اندر ہی اندر اس نے انہیں ڈوٹ کر چا بھٹھا۔ مگر اب جبکہ یہ چاہت بے انتہا ہو کر سامنے آ گئی تو پھر یوں کا خیال اس کو حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔

کیا بالکل ہی برباد ہونے کا ارادہ عید۔ دل کے کسی گوشے سے سرگوشی ہی ابھری۔ محبت، اُپاشار سے دلوں سے دلیسین شارق بھی انہیں چاہتے ہیں۔ کیا ان کی چاہت کے وہ منہ سے کہیں نہیں دیکھیں۔ عید۔ جنہیں دیکھ کر تھپک لگی ہو جاتی تھی۔ وہ شاید فوجی ہونے کی وجہ سے بعض وقت بڑے بے باک انداز میں اپنے جذبات کا

ظہار کرتے تھے۔ محبت ان کو تم غمناک کی کوئی حسیں بائی لگ رہی ہو۔

”نہیں۔ نہ نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے۔ محبت ان تین تین پرستہ ساتھ ساتھ بچہ بچہ کی بات تھی۔ وہ جو میں بڑھت نہیں کر لوں گا۔ وہ کتنی دلیک سے اپنے سامنے اپنی دل جذبات کو زبان دے دیتے تھے۔ اولیہ کہتے ہی اس میں بے باک تھے۔ پھر وہ کیسے شارق کی اس ہمدانہ بات کی تھپتھپانے کی بات تھی۔ وہ خود یوں کا کشادہ فوجی کی طرح سرور میں آ رہا تھا۔ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ شارق کو اس نے دیکھا تھا۔ شارق نے دیکھا تھا کہ وہ اس کی دوسری سے اتنی دور تھے کہ اب تک پہنچنا بھی جا ہی تو نہ پہنچ سکتی تھی۔ روتیلوں، مجبور یوں اور بچا گئی کی غلیب حالت تھی۔ شارق نے اتنی ہی کما تھا کہ تھمائی اس گھر میں عید ہی کہیے۔ یہ سب کچھ شارق کی کسی انتہائی جذبے کی تسکین کی خاطر یہ خطا کی گئی تھی۔ یہ بول یا پھر نے یہ عورت بنا جا جا رہی۔ وہ کسی صورت میں شارق کو دیکھ کر نہ تھکتی تھی۔ پھر کئی دن وہ ان سے جیسی جیسی پھری۔ اس واقعے کے بدلان سے شادمانہ کی تاب کہیں تھی۔ پھر یہ احتیاط بھی ملحوظ رہی کہ ان سے سامنا ہونے پر خیالات بھٹک نہ جائیں۔ لیکن اس روز جب وہ دلپے کا کوا۔ فارغ ہو کر ان کی طرف جا رہی تھی بھاری بوٹوں کی آواز نے اسے ہر کارا دیا۔ وہ بیڑھیاں بھڑکے گا بھڑکے گا بھڑکے گا بھڑکے گا بھڑکے گا اس کی طرف بڑھے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی دیکش مسکراہٹ لے، فوجی دلی میں ہنس۔ وہ اتنا تھپتھپتہ کہ رہے تھے کہ وہ ان پر سے نگاہیں نہ ہٹا سکی۔

”بائی بچہ پر شک کر رہی۔ وہ سیدھے اس کی طرف چلے گئے۔ بڑے ناست پر جو کر سب لوٹ کیا اور تھوڑا سا مہم ہو کر بولے۔

”بلبل عید گھوڑوں یا جان آرزو؟ بات کے اختتام پر ان کی انارٹ ہو گئی۔ کیسا دلیرانہ انداز تھا۔ دل کی دھڑکن میں سے قبلیو کر تھیں۔ عید کی مرقی سے سین عارض دیکھ گئے... لگا جیسا پارکر ہٹ سکتیں مگر صرف چٹانوں کے لئے حقیقتوں نے بھی پھری تو یہ شرف ہی تہ کہہ سکی۔

”میری بے بسی کیوں چھاپا ہے شارق بھائی۔ شاید آپ میری واقف ہو گئے۔ تمہارے بھائی کی طرف دیکھو۔ وہ تیزی سے برکد سے کی جا میں ہو کر دل ان میں چلی گئی اور وہ مکت سے کھڑے سے جانا چاہتے تھے۔ پھر اسے کوہ ایک بار پھر اس کے کوسے میں کھڑے تھے۔ کی نعمت باخبر ہو کر فوجی کی نظر لگ رہی تھی۔

”پہلے یہ تیار کر لیں۔ انہیں ناگوار تو نہیں لگا۔ اگر ایسا ہر تین روزہ پہلے ہوا تو۔“ وہ اس کے قریب کھڑے ہو چکے تھے۔ ان کے

اس میں پہلے اختیار اس کا دل جا ہا کہہ سکتے۔ نہیں، بھلا آپ کا اتنا مجھے ناگوار نہ دیکھا ہے۔ میں تو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتی ہوں۔

گمراہان پر تو مصالحتوں کی بھر پوری تھی۔ جو غلوں پر مجبور یوں کے قتل پرستے تھے۔ پھر اس کا اس کے جذبات سے کھلا جا رہا ہے۔ اس کا دل خون کر دیکھ کر کوہ تھلا آئے اس قدر غمزدگ ہو کر شادمانہ بولے۔

”چھاپو جلا با تھوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو۔ میرا دل اس کا کرنے میں تم کی حق بات ہو۔ انہوں نے جانے کیلئے قدم بڑھایا تو نہ جانے کہاں سے بہت جیتنے کے کہ وہ بول اٹھی۔

”آپ کی آمد اگر عرفان بھائی کی آمد کا سادو رہے کہیں ہے تو میں یہ کچھ بغیر نہ کر لوں گی کہ آپ جا سکتے ہیں۔“

اس کی جرات مندانہ بات میں اس کی ایک لٹے کو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہے مگر دوسرے ہی لمحے ان کی پیشانی پر ناگوار کی کی تھپتھپانے بھر آئیں۔ ”کیوں۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“ انہوں نے نیچے پنا سے سوال کیا۔

”کم از کم ان حالات میں تو بالکل نہیں جنہیں آپ ایک دلت سے نبھا رہے ہیں۔“

اس کی بات سن کر ہی گہرائی تھی اور اس کا اظہار تکلم کتنا دلیرانہ تھا۔ مگر حقیقت پرستی۔ اس نے محبت اور دلپے کے شے پر جوت کی تھی ان کا سبب شامانہ یقین تھا۔ مگر طبیعت کی مضبوطی آئے آئی۔

”مگر تمہیں اتنا تو معلوم ہو گا کہ میں کچھ کہتا ہوں وہ گزرنا پڑا۔ انہوں نے کچھ غروب کرنے والے انداز میں کہا۔

”ہاں۔ یہ تو معلوم ہے۔ یہ کچھ وقت کے بعد اس نے پست آواز میں جواب دیا۔

”پھر۔ پھر اس نے بھارتی کی وجہ سے ان کا سوال تھا۔

”خود میرا کپاس ہے شاید جس کی وضاحت سے میں تاہم ہوں وہ دلپے ہی ان سے غروب نظر نہیں رہا تھی۔

”مجھے کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔ میں تمہاری جڑوں سے واقف ہوں۔ عید۔ خدایا مجھے کہنے کی کوشش کرو۔ میں بھٹک رہی رہ جاؤں گا۔ محبت سے میری دلیکھی محض ایک محکمہ تھی۔ یہ فہم میں جانے کیلئے کھلا آ رہا تھا۔ مگر تم نے اپنا کسا ہوا روبرو کر کے میری دلیکھی میں غمزدگی جم نے۔ جسے ہزاروں غمزدگیوں کے باوجود میں نظر انداز نہ کر سکا۔ یہ کوئی وقتی کیل نہیں۔ زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے۔ تم سمجھتی ہیں نہیں؟“

بات کے اختتام پر انہوں نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔



”کیا تم جانتے ہو کہ یہ جو ایک دو دن گئے ہیں ان کی صورتوں کو کبھی نہ ملے گا۔ میں نے اب سے نہیں دس سال سے وہاں نہ ان کے کسی ہے جب میں نکلیں گے تو اس وقت کیا تم سو رہے تھے۔“ پھر چوکی جان نے سخت برہمی کے عالم میں پوچھا تو شارق آہستہ سے بولے۔

”جی ہاں آئی جان۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔“

”اے یہ تیرے والدین کی طرح آپ بھی نہ رہیں۔ جی طرح میں ہوں، جو تم چاہ رہے ہو کہ میں نہیں ہو سکتا۔ قیامت کے میں ہو سکتا ہوں۔“

جان ان کے دھیمے لہجے سے نافذ آٹھا کر لیں۔ ”تو نہیں کہہ کر حلال لگیا۔“

”ٹھیک ہے آئی جان۔ اگر میں نہیں ہو سکتا تو وہ بھی ہرگز نہ ہوگا جو آپ چاہ رہی ہیں۔“ انہوں نے ناگوار کی شکلیں لے کر بے ضبط لہجے میں کہا تو پھر چوکی جان آندہ ہو کر لیں۔

”خدا کی شان ہے بیٹے۔ جو آج تم سے زبان چلا رہے ہو۔ خیر خود مروتیہ کے ہو۔ مگر تم نے اگر اس معاملے میں خرمی دکھائی تو ہمارا کتا دو دنہیں بکھڑے گا۔“

”آئی جان۔ شارق بڑے سچائی سے میں نے اپنے پھر فطرتی طور پر بولے۔ میں اسے آخری بار دیکھتا ہوں۔ آئی جان کو اپنے فیصلے کو بدل دیکھئے۔“

”جیسے آجک کوئی خوشی نہیں دیکھی ہے۔ میں اس کا دن خوشیوں سے بھرنے کا نہیں کر کے آیا ہوں۔“ آخر وہ بھی تو آپ کی جیتی ہے۔ خدا دارا۔“

”ان جالیے آئی جان۔“ چلا میں آپ کے سامنے خرمی کا خیال بھی دلایں نہیں لاسکتا۔ ورنہ وہ آپ کی اجازت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔“

پھر چوکی جان کو بیکہ کی صداقت یقین آگیا۔ مگر وہ اپنے فیصلہ بدلنے پر کسی طرح راضی نہیں۔ یہ پہلی طرح معلوم تھا کہ ان کا یہ تجدید مزاج اور تھوڑے تھوڑے اور دیر میں جرات کہتا ہے وہ پھر کی گھر بولتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنی ضد پلائی رہی۔ اگر اس وقت نہ مروتیہ کو یہ بھی کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ ایک بھائی تو سب کو جھوڑ کر بیٹھ گئے، اب یہ دور مروتیہ کی بھی چوٹ مانیگا۔ انہوں نے سوچا اور سمجھ میں ڈالنے کی پکار کے لیں۔

”یہ ہمارا گھر میری جیتی ہے۔“ جگر تم اسے خوشیاں ملانے والے کہاں سے پیدا ہو گئے۔ اس کی قسمت میں اگر خوشیاں بھی ہوں گی تو کسی دیکھی طرح مل جائیں گی۔ کسی کا وقت ایک سال نہیں رہا۔ مگر تم میری خوشیوں کے کیوں دینے ہو۔ کیا تم نہیں اپنے ہر روز کا رچنے اور جی جادو کا مالک ہوئے کا رزم ہے۔ مگر میری بات سے تو تم ٹھیک تمہارا جی چاہے کرو۔“

”میں اپنی زندگی میں تو اپنی زبان سے نہیں بھرتی۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے آئی جان۔ میں اب اس معاملے میں آپ سے

کچھ کہوں گا۔ شارق نے ایک منہ کے عالم میں تناہا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ پھر چوکی جان کے بیٹے نے ان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ مگر یہ ان کا خیال خام ہی نکلا، جب زخمی نے ان کے سامنے پوچھا کہ جانانی جان اتنی جلدی واپس کیوں گئے تھے تو وہ اپنا دل تھا کر دلیں۔ مگر پھر اپنی کیفیت کا اظہار نہ ہونے دیا۔

”جیسے کہ شارق کا انتقال بڑا آرت تک تھا۔ جوں جوں گزرتے چلے جاتے تھے اس کی اندرونی فطرت میں اتنا بڑا جادو تھا۔“

وقت شارق نے کہا تھا کہ تمہاری خاتونیں خاتون سے بھی گریز کرنا چاہیں گے۔ لیکن اگر میں نے میری بات نہ مانی تو پھر میری دل چاہے گا کہ وہ کوئی نہ کہہ کر چلے جاسے۔ مگر میں تو معلوم ہے کہ شارق جو بات منہ سے نکالتا ہے اسے پورا کر کے چھوڑتا ہے۔ اور

انہیں الفاظ کی زنجیریں شارق کے آنے پر اس نے نافذ لگا دیا کہ پھر جان راضی نہ ہوئی ہوگی۔ مگر شارق اگر نہیں آئے تو کہہ دیجئے دو حرف کہہ کر حالات سے آگاہ نہ کر دیتے۔ اسے شارق سے سخت گھٹنا جو اب، باہمی میں بدل رہا تھا۔ اور پھر وہاں کا سلوک ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ بات بات میں ٹانٹ پٹکار۔ ٹھٹھٹے۔ جبر اہل اور کوسے۔ زندگی کسی جتنے ہوئے صومر کی مانند ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر ایک ایک غیر متوقع طور پر بھارت نے پاکستان پر ہمارے اور اس طرح شارق کے آنے کی رہی اس کی ایک باقی رہی۔ مگر ایک دن شارق کے بجائے ان کی ایک مختصر تحریر اس کے نام آئی۔ لکھا تھا۔

میری راہ دیکھتے دیکھتے تمہاری جگہ بھی ہوگی مگر میں تم سے آج بھی یہی کہتا ہوں کہ جو جی حالات نے اجازت دی میں تم کو لینے آؤں گا۔ اگر تم میری جگہ تو کیا تم پر انتظار کرو گی؟

تمہارا اور صرف تمہارا۔ شارق بھاء۔“

مروتیہ نے یہ خط شاید ہزاروں مرتبہ پڑھا ہوگا۔ پھر بھی میری جگہ ہوں ہاں میں تمہارا زندگی کی کافی سانس تک انتظار کروں گی شارق کا کئی دن دن جلدی آجائے کہ تم بوٹ آؤ۔

مگر جگہ کے دیکھتے ہوئے شعلوں نے وطن کی آواز کا اندازہ پھر شارق بھاء کے آخری تصور خواتن سے لیا۔ وہ مروتیہ کے ہونے شہید ہو گئے اور جب ان کی شہادت کی خبر میری کوساں گئی تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ یہ لوگ مجھے جلائے اور تلے کو یہ صوفی اطلاع دے ہے ہیں تاکہ میرا ہمارا جود انکا لڑ پڑے۔ اُن کیسے سنگدل لوگ ہیں۔ انہیں اپنے سگے بھائی اور

بھائی کے بے میں یہ افواہ ڈالتے جرم بھی نہیں آتا۔ ہاں وہ تو ان کی نگاہوں

میں ایسا نہ کیا کہ انہوں نے مجھ سے پکار لیا ہے۔ وہ اپنے ٹھٹھے ہوئے دل میں وقت گزرتی دیکھتی۔

جگہ میں نے کئی ادا ہو چکے تھے۔ غازیان اسلامک کے کالڈر سے اپنے اپنے کھانوں پر واپس آچکے تھے مگر انے تو شارق۔!

انہوں نے کہا تھا۔ میں ایک دن نہیں لینے ضرور آؤں گا۔ اگر مجھے انے میں دیر ہو جائے تو کیا تم میرا انتظار کرو گی؟ جو کہ ہے حالات نے انہیں ایسے پاس آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ جگہ سے پہلے بھی تو وہ کئی ماہ سے غائب تھے۔ مگر اسات

دل کو دھکا۔

وقت پھر چکے چکے کہ جگہ سے اب زندگی ایک نیا فائنل ہو چکے۔ اب سے کم نہ تھی۔ شارق کی اس پروہ جے میں جادو تھی۔ اب تو انکا

انتظار کرنے کے لیے ایسے کھینچے تھے کہ انہیں دل تو پہلے ہی انہوں سے جڑ چلا تھا۔ اب تو یہ اس کی کچھ نہ کہہ کر چلے جاسے۔ جیتی جیتی مروتیہ۔ وہ مکہ

آنا ہوئی تھی۔ کیا کھانے دھتے جادو نے دینے ہوئے۔ اب تو ان کا غطاؤں کا بھی اتنا بڑا ہو گیا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس کی دوست نے

ان کی جگہ پر جان کر مروتیہ کا دیکھنا۔ انہوں نے انہوں کی یاد دہانہ تھی۔

ان کی ایک گھر سے مروتیہ کو پڑھا جیگا کہہ لینے اور پھر جس کا جو

اب سے اب سے جوں جوں آئے۔

پھر جب ایک دن جی جان نے نکلتے کی شادی ایک نیا نیا



۱۹۵۷ء میں فرانس کی ایک خاتون ارسینا نے ایک بی بی دیکھی تھی۔ ایک بار بی بی نے تین بچے دیے جو تیس دن ہی مر گئے۔ بی کو اپنے بچوں کی موت کا بیت انفس ہوا اور وہ ہر وقت کمرے میں بند رہنے لگی۔

چند روز بعد جب ارسینا ایک بار اس کمرے میں گئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ایک بڑا سا بی بی کا دودھ پل رہا ہے اور بی بی کے کھیل رہا ہے۔ اُس دن کے بعد وہ بڑا ہر وقت بی کے ساتھ لے لے لگا۔ بی نے بچے کو اپنے بچوں کا نام بدل کر کھانے کا پلنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ چپے اور بی کا یہ عجیب و غریب میل جول تقریباً چھ ماہ تک رہا اور اس عرصے میں دُور دُور سے لوگ اس بی اور بچے کو دیکھنے آتے رہے۔

موسل (مختصر) ۱۹۵۷ء

بی بی کا بچہ ہوا

آندہ ہو کر کچھ رہ گئی۔

پھر بی بی کو کچھ جان کر اس کے ساتھ کی بی بی اپنی مائی نانیوں کی زیادتیوں اور سختیوں کا جیسے ایک دم خیال آگیا پھر کیا تھا جی جان نے اس کی خاطر داری اور دل جوئی میں کسر نہ تھا کھی۔ ہر وقت نہایت اور شرفانگے کچھ پھرتے اور جی جان صدمے داری جاتیں۔ سب کے سامنے بی بی زیادتیوں کا ذکر نہ کرنا ضرورت مند نہیں کرتیں۔ ہاں جی جان۔ ماں نے ذرا کی کچھ کرنا گھر لایا۔ اب نے زندگی بھر کبھی بدلت کر نہ بوجھ میں نہ پاتی تو یہ نہیں تھکتی ماں بھاری کی کیا شکر کرتی۔ اسی لئے تو شہناز بھائی کے ہانے کے باوجود میں نے اسے وہاں نہیں بھیجا۔ مگر وہ کونسا بھی طرح رکھ لیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ شاید شہناز بھائی کی بے پروائی کا بدل میں اس نے قصور سے لیتی تھی۔ مگر شہناز جی اس کی کو کبھی بدلت کر جواب دینا نہ تو گناہ تھا اور یہی طرف دیکھا کہ میں خیر بھائی کے سوا کسی کی کد میں کون ہے۔ جیسے میں بھلے ہیں جیسے بھی ہیں ہم جی ہیں۔ اب اس کو نہ بہت آج سے کیسی کا کہو

ہاتھ نہیں لگائے گی۔ تم کو گھر کے سامنے کا بنگلہ نہیں ہوں گے۔ چکی پڑی
پلنگ توڑ کر تکی پر ہوتی۔

اور نہ بہت بجائے بڑا منہ کے نہیں کر سکتی۔ ہاں ہاں ہی جانتا
مجھے تو خود اس بات کا ایک عرصے سے احساس تھا کہ ان لوگوں ہی پر کیوں ساری
ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ یہی تو خبر توڑ لوگ تو ہی کہتے اپنے لئے ہیں اب
آپ بھی لڑی کی گئیے۔ عیوہ آپا۔

نہ بہت کہ آپ اور بھتیجی کا کہنا اور اسی خبریں کلامی سے
مطلب ہی کچھ بعد از قیاس بات تھی۔ ان لوگوں کے چاہک اور ایسے تو غیر
رقبے اور محبت کی باتیں میں لپٹی ہوتی تھیں تو اس سے عیوہ کہ اپنے دل کے چھلے
بچنے کو دل کچھ تازہ ہوتے نظر آتے۔ اب تو چالیسوں ہوا چچی جان نے ٹھیکہ
کر خیریت کی۔ اتنے عمو اٹھنے کو اپنے اور اتنی وافر مقدار کو لوگوں نے
خوب تعریف کی۔ عیوہ کہ اب محبت کا مکروہ دانش کے لئے بدل گیا تھا بہت
اپنی پسند سے اس کے لئے نئے نئے جوڑے سلوا کرے پینے پر مجبور کر رہی اور
اُسے اس قدر خاموش اور کھو ہا کھو دیکھ کر دھوکے کے طور پر کہتی۔

آپ کو اپنی غمزدہ رہنا چھوڑیں عیوہ آپا۔ چچا جان نے واقعی
آپ کے ساتھ بہت افسانیاں کی ہیں اور اب وہ آپ کو اس دنیا میں ایک
تہا پھوڑ گئے۔ لیکن تم تو ہیں آپ کے۔ صبح آپ کو افسردہ دیکھ کر بڑا رنج
ہوتا ہے۔

اتنے عرصے میں ایسا کبھی کسی کے منہ پر شارق کا ہانا نہ آیا تھا۔
کبھی کبھی بلانیا راس کا دل چاہتا کہ چچا کو سب کے میرے حال شارق
کی جلدی میں ہوا ہے اب تو موت سے نہیں بڑھ کر مجھے نہیں معلوم کہ ایک بیٹی کو
باپ سے کیسی محبت ہوتی ہے۔ مگر وہ خاموش رہ جاتی۔

پھر کیلن ان ظاہری چاؤ جو چکلوں اور محبت و خلوص کا پردہ
بھی چاک ہو گیا۔ جب چچی جان نے ایک چھوٹی سی تقریب کے لئے کسی انگلی
میں لٹکی کی انگلی ڈال کر کبے سامنے کہا۔ ”میں اپنے گھر کی دولت کو گھری
میں رکھنا چاہتی ہوں۔ میری بہو تو ہر بار ہر لاکھوں میں ایک۔ تب کہیں
جا کر عیوہ یہ حقیقت کھلی کہ یہ سب پارہ اخلاص اس کی دولت کو گھر میں
رکھنے کے سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ شارق بے وفائی اُسے کسی طرح گوارا نہ
تھی، مگر عرفان کو جس سے اسے سخت نفرت تھی اس سے منسوب کیا جا رہا تھا
دل جا ہانگلی سے لگتی تھی تا کران سب کے منہ پر دے ماسے مگر ہمیشہ کی
طرح بے بسی کی تصویر ہی خاموشی سے سب دیکھتی رہ گئی۔

عرفان تو بیسے لٹکی کے بعد اس کے سہلہ و سفید کے ایک بن بچے
تھے۔ اگرچہ اسے اس قدر خیر اور مکر اور کھوکھو کھوکھو کہنے کی ہمت نہ پڑتی مگر ان کی

ہاں ہاں ہی جانتا
مجھے تو خود اس بات کا ایک عرصے سے احساس تھا کہ ان لوگوں ہی پر کیوں ساری
ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ یہی تو خبر توڑ لوگ تو ہی کہتے اپنے لئے ہیں اب
آپ بھی لڑی کی گئیے۔ عیوہ آپا۔

نہ بہت کہ آپ اور بھتیجی کا کہنا اور اسی خبریں کلامی سے
مطلب ہی کچھ بعد از قیاس بات تھی۔ ان لوگوں کے چاہک اور ایسے تو غیر
رقبے اور محبت کی باتیں میں لپٹی ہوتی تھیں تو اس سے عیوہ کہ اپنے دل کے چھلے
بچنے کو دل کچھ تازہ ہوتے نظر آتے۔ اب تو چالیسوں ہوا چچی جان نے ٹھیکہ
کر خیریت کی۔ اتنے عمو اٹھنے کو اپنے اور اتنی وافر مقدار کو لوگوں نے
خوب تعریف کی۔ عیوہ کہ اب محبت کا مکروہ دانش کے لئے بدل گیا تھا بہت
اپنی پسند سے اس کے لئے نئے نئے جوڑے سلوا کرے پینے پر مجبور کر رہی اور
اُسے اس قدر خاموش اور کھو ہا کھو دیکھ کر دھوکے کے طور پر کہتی۔

آپ کو اپنی غمزدہ رہنا چھوڑیں عیوہ آپا۔ چچا جان نے واقعی
آپ کے ساتھ بہت افسانیاں کی ہیں اور اب وہ آپ کو اس دنیا میں ایک
تہا پھوڑ گئے۔ لیکن تم تو ہیں آپ کے۔ صبح آپ کو افسردہ دیکھ کر بڑا رنج
ہوتا ہے۔

اتنے عرصے میں ایسا کبھی کسی کے منہ پر شارق کا ہانا نہ آیا تھا۔
کبھی کبھی بلانیا راس کا دل چاہتا کہ چچا کو سب کے میرے حال شارق
کی جلدی میں ہوا ہے اب تو موت سے نہیں بڑھ کر مجھے نہیں معلوم کہ ایک بیٹی کو
باپ سے کیسی محبت ہوتی ہے۔ مگر وہ خاموش رہ جاتی۔

پھر کیلن ان ظاہری چاؤ جو چکلوں اور محبت و خلوص کا پردہ
بھی چاک ہو گیا۔ جب چچی جان نے ایک چھوٹی سی تقریب کے لئے کسی انگلی
میں لٹکی کی انگلی ڈال کر کبے سامنے کہا۔ ”میں اپنے گھر کی دولت کو گھری
میں رکھنا چاہتی ہوں۔ میری بہو تو ہر بار ہر لاکھوں میں ایک۔ تب کہیں
جا کر عیوہ یہ حقیقت کھلی کہ یہ سب پارہ اخلاص اس کی دولت کو گھر میں
رکھنے کے سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ شارق بے وفائی اُسے کسی طرح گوارا نہ
تھی، مگر عرفان کو جس سے اسے سخت نفرت تھی اس سے منسوب کیا جا رہا تھا
دل جا ہانگلی سے لگتی تھی تا کران سب کے منہ پر دے ماسے مگر ہمیشہ کی
طرح بے بسی کی تصویر ہی خاموشی سے سب دیکھتی رہ گئی۔

عرفان تو بیسے لٹکی کے بعد اس کے سہلہ و سفید کے ایک بن بچے
تھے۔ اگرچہ اسے اس قدر خیر اور مکر اور کھوکھو کھوکھو کہنے کی ہمت نہ پڑتی مگر ان کی

ہاں ہاں ہی جانتا
مجھے تو خود اس بات کا ایک عرصے سے احساس تھا کہ ان لوگوں ہی پر کیوں ساری
ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ یہی تو خبر توڑ لوگ تو ہی کہتے اپنے لئے ہیں اب
آپ بھی لڑی کی گئیے۔ عیوہ آپا۔

نہ بہت کہ آپ اور بھتیجی کا کہنا اور اسی خبریں کلامی سے
مطلب ہی کچھ بعد از قیاس بات تھی۔ ان لوگوں کے چاہک اور ایسے تو غیر
رقبے اور محبت کی باتیں میں لپٹی ہوتی تھیں تو اس سے عیوہ کہ اپنے دل کے چھلے
بچنے کو دل کچھ تازہ ہوتے نظر آتے۔ اب تو چالیسوں ہوا چچی جان نے ٹھیکہ
کر خیریت کی۔ اتنے عمو اٹھنے کو اپنے اور اتنی وافر مقدار کو لوگوں نے
خوب تعریف کی۔ عیوہ کہ اب محبت کا مکروہ دانش کے لئے بدل گیا تھا بہت
اپنی پسند سے اس کے لئے نئے نئے جوڑے سلوا کرے پینے پر مجبور کر رہی اور
اُسے اس قدر خاموش اور کھو ہا کھو دیکھ کر دھوکے کے طور پر کہتی۔

آپ کو اپنی غمزدہ رہنا چھوڑیں عیوہ آپا۔ چچا جان نے واقعی
آپ کے ساتھ بہت افسانیاں کی ہیں اور اب وہ آپ کو اس دنیا میں ایک
تہا پھوڑ گئے۔ لیکن تم تو ہیں آپ کے۔ صبح آپ کو افسردہ دیکھ کر بڑا رنج
ہوتا ہے۔

اتنے عرصے میں ایسا کبھی کسی کے منہ پر شارق کا ہانا نہ آیا تھا۔
کبھی کبھی بلانیا راس کا دل چاہتا کہ چچا کو سب کے میرے حال شارق
کی جلدی میں ہوا ہے اب تو موت سے نہیں بڑھ کر مجھے نہیں معلوم کہ ایک بیٹی کو
باپ سے کیسی محبت ہوتی ہے۔ مگر وہ خاموش رہ جاتی۔

پھر کیلن ان ظاہری چاؤ جو چکلوں اور محبت و خلوص کا پردہ
بھی چاک ہو گیا۔ جب چچی جان نے ایک چھوٹی سی تقریب کے لئے کسی انگلی
میں لٹکی کی انگلی ڈال کر کبے سامنے کہا۔ ”میں اپنے گھر کی دولت کو گھری
میں رکھنا چاہتی ہوں۔ میری بہو تو ہر بار ہر لاکھوں میں ایک۔ تب کہیں
جا کر عیوہ یہ حقیقت کھلی کہ یہ سب پارہ اخلاص اس کی دولت کو گھر میں
رکھنے کے سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ شارق بے وفائی اُسے کسی طرح گوارا نہ
تھی، مگر عرفان کو جس سے اسے سخت نفرت تھی اس سے منسوب کیا جا رہا تھا
دل جا ہانگلی سے لگتی تھی تا کران سب کے منہ پر دے ماسے مگر ہمیشہ کی
طرح بے بسی کی تصویر ہی خاموشی سے سب دیکھتی رہ گئی۔

عرفان تو بیسے لٹکی کے بعد اس کے سہلہ و سفید کے ایک بن بچے
تھے۔ اگرچہ اسے اس قدر خیر اور مکر اور کھوکھو کھوکھو کہنے کی ہمت نہ پڑتی مگر ان کی

اپنے بیڈروم کی طرف جا رہی تھی کہ شاذیہ کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس طرف گھوم گئی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو شاذیہ نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر کتاب میں چھپا دی۔ مگر آسیہ کی تیز نظر اس کی حرکت دیکھ چکی تھیں۔

آسیہ

”ابھی کس جاگ رہی ہو بیٹی؟“ اس نے بڑی نرمی سے پوچھا
 ”اودھ امی آپ ہیں“ شاذیہ کتاب رکھتے ہوئے بولی ”جی ہاں۔ ذرا پڑھ رہی تھی۔“
 ”میں بھی تو دیکھوں کو کسی ناب پڑھ رہی تھیں“ آسیہ نے مزید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

آئندہ تو یہ سید خاں

جان گویا تھا



کیا آپ جانتی ہیں؟

جہاں ساگ سبزوں کو ارزاں ہونے کی وجہ سے آپ جیت رہی ہیں وہ اپنے حیات بخش اوصاف کی بنا پر سونے میں تولنے کے قابل ہیں ساگ اور سبزیاں جاکھنٹ اجڑا کا خزانہ ہیں۔ جسم کے لیے ساگ سبزوں میں قیمتی پھلوں سے زیادہ مفید اجزاء ہیں۔ سب سے قدرتی گناہ سے دیکھی جانے والی ارزاں سبزوں میں صحت و زندگی بچانے والی صفات پر جس قدر اہم موجود ہیں۔
 دودھ سے ہم اعلیٰ غذا سمجھتے ہیں، انہی ساگوں اور سبزوں کا دوسرا روپ ہے۔ دودھ میں بھی سبز پتے خوش ذائقہ محلول کی صورت میں ہوتے ہیں۔ کچے ساگوں سے بہتر دودھ کا کوئی بدل نہیں۔ جہاں دودھ کی کمی ہو وہاں ساگ کے استعمال سے اس کی کمی ہو سکتی ہے۔
 بچوں کی نشوونما میں بھی ساگ سے بہت مدد ملتی ہے، اگر ان میں کم ہوتی ہے ساگ اور سبزی کی رغبت پیدا کی جائے تو یہ عادت ساری زندگی ان کی صحت کی حفاظت کرتی ہے۔

مُسرّت کا راز

ساری دنیا مسرت پانے، مسرت حاصل کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے یہی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مسرت کا راز کیا ہے؟ مشہور مفکر، ڈاکٹر مارٹن نے لکھا ہے ————— ”مسرت کے متعلق لوگوں میں عجیب غریب خیالات پائے جاتے ہیں۔ لوگ سوچتے ہیں مسرت دولت سے خریدی جاسکتی ہے، یعنی دولت زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ چیزیں خریدی جاسکیں گی اور اتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی، لیکن یہ یکسر وہم ہے کوئی آج تک دولت سے بھی خوشی خرید سکا ہے؟ دولت و ثروت، جاہ و محنت سے بھی حقیقی مسرت نہیں حاصل ہو سکتی ————— دوسروں کو مسرت دینے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ دوسروں کو خوشی دینے سے خوشی ملتی ہے۔ بلکہ خیالات اور دوسروں کی بھلائی سے خوشی ملتی ہے۔
 مسرت کا یہی راز ہے ————— خود غرض، خود پسند، تنگ دل اور حریفانہ انسان مسرت سے ہمیشہ نا آشنا رہتا ہے۔



جی ائی۔ وہ تاریخ کی کتاب ہے؟ شاذیہ نے لوہکار
 ہاں ہے پہلے کتاب پڑھ کر پتا چلا۔ لیکن کتاب آسیر کے ہاتھ سے ٹھوکر
 نیچے گر پڑی۔ ساتھ ہی اس کے اندر بھی ہوئی تصویر بھی۔ دوسرے لمحہ
 آسیر جھک کر تصویر اٹھا چکی تھی۔ شاذیہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ آج اس
 کی جوری بڑی گئی تھی۔ وہ مڑ جھکا کھڑی ہو گئی اور قیامت ٹوٹنے کا
 کا انتظار کرنے لگی۔

”یہ کس کی تصویر ہے بیٹی؟“ خلاف توقع آسیر کا ابھ
 بڑا نرم تھا۔

پہلے اس کے دل میں بھی مچی ہوئی تھی۔ یہ بھلا خوار
 نہیں تھا کہ شاذیہ کی کتاب میں اس تصویر کی موجودگی کیا مینے لگتی ہے
 اس کے تصور میں خود اپنی جوانی کا زمانہ گزر گیا معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ
 اپنے آپ کو ڈیر رہی ہے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا جو ابھی
 کھمک خاموش تھی۔

”میں پوچھ رہی ہوں یہ کون ہے؟“
 ”آئی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میسرے کا بچہ میں ایک لڑکا پڑھتا ہے۔“
 ”زیر۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ اس کی تصویر ہے؟“ شاذیہ پھلائی۔

”کیسے جانتی ہو اسے؟“
 ”میں کوئی پانچ چھ بیٹے سے؟“
 ”اس کے ساتھ گھومنے بھی جاتی رہی ہو؟“
 ”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“
 ”اے پسند کرتی ہو؟“ آسیر نے ٹوٹنے والی نظروں سے
 بیٹی کو گھورا۔

شاذیہ نے بڑی جھٹ کی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”اگر یہ بات تھی تو تمہیں مجھے پہلے بتا دینا چاہیے تھا بیٹی
 زندگی کا یہ دور جس سے تم گزر رہی ہو بہت نازک ہوتا ہے۔ جذبات کا
 غلط ہواؤ قدموں کو تباہی کے راستے پر بھی لے جاسکتا ہے۔ میں ان دنوں
 میں سے نہیں ہوں جو اولاد کے جائز فیصلوں میں دیوار بنا کرتی ہوں۔ اگر
 تم واقعی زیر کو پسند کرتی ہو تو اسے میسرے کے لئے کوڑو۔ لیکن کو پھل
 ایک نایاب دن پر اسے گھونٹنا ہوتا ہے اگر میں نے محسوس کیا کہ تمہارا
 انتخاب درست ہے تو تمہارے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس فرض سے
 بھی سبکدوش ہو جاؤ گی؟“

شاذیہ چاہنے آپ کو کھنت و طامت سننے کے لئے تیار
 کر رہی تھی مگر یہ الفاظ سن کر مسرت سے چھل پڑی۔ دفعتاً اس کے

دل میں اپنی اُمی کے لئے بے پناہ پیار اُٹھ آیا اور اس نے بے ساختہ
 آسیر کے گلے میں اپنا ڈال دیا۔
 ”اوہ۔ میری پیاری اُمی جان۔“ اس نے آسیر کی گود میں
 منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

آسیر نے بیٹی کی پشالی پر بوسہ دیا اور اسے آرام کرنے کی
 ہدایت کرتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ اس کا ذہن ابھی تک ماضی کی
 یادوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دل کی گہرائیوں میں بھی ہوئی وہ جہن
 جسے اس نے پچیس سال کی مدت میں بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر لایا
 تھا اب ابھر نہیں بن کر ابھر رہی تھی۔ ابھی اس نے بھی جنت کی
 تھی بھی اس نے بھی کسی کو چاہا تھا۔ مگر کتنی نادان تھی وہ کس جنت کو
 جھوٹے غرور اور درشت مزاجی کے مہروں میں چھپاتی رہی۔ صرف اس
 لئے کہ اطہر تہمت تھا۔ غریب تھا اور اس کے والدین کی سرپرستی اور امداد
 سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یا پھر شاید اس نے کاپی امارت کے زہر پینے
 اُسے ضرورت سے زیادہ غرور بنا دیا تھا اور وہ ایسے نوجوان کے سامنے جس
 کا مستقبل غیر یقینی تھا اعتراض جنت کی پتی تو ہیں بلکہ اپنی شکست تصور کرتی
 تھی۔ لیکن اس کی ہمارا قرین نہیں تھا۔ شاذیہ بھی یہ بات اس کی بھوس
 اُس وقت آئی جب اطہر اس سے یایس پکڑا اس کی دسترس سے بہت دور
 چلا گیا۔ اور آسیر نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے دنیا کی کتنی بڑی مسرت
 ٹھکرا دی ہے۔ اطہر کے بعد مہربان اس کی زندگی میں خوشیاں بھی آئیں
 مگر وہ جنت کا پہلا آج تک نہیں بچیں سکی تھی۔ اب جس کا کہ بیٹی
 بیٹی نے اسی رستے پر قدم بڑھائیے تھے وہ کسی جھوٹے بندہ کو اس کے دل کی
 خلش بنا کر ماضی کی غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

شاذیہ نے وہ رات بڑے سہرے خواب دیکھتے ہوئے گزاری
 اور محسوس پہلے ہی کالج جا پہنچی۔ اور اس درخت نیچے بڑی بے قرار
 سے زیر کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ جہاں زیر اپنی کا کھڑی کیا کرتا تھا
 اور پھر جیسے ہی زیر آیا اس نے اس کے اترنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور
 اس کے پاس آگئی۔

”آج تم بہت دیر کو زیر پڑو؟“ وہ بولی
 ”زیر۔۔۔۔۔ زیر نے اترتے ہوئے قہقہے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے
 کہ آج میں کچھ پہلے آگیا ہوں۔“ اس نے غصے سے شاذیہ کی طرف دیکھا۔ یہ
 آج آسمان کے بجائے اس شاداب چہرے پر شمع کیوں چلی ہوئی ہے؟
 ”میں آج بہت خوش ہوں زیر شاذیہ ہلک کر بولی۔

”اور اگر نہ پوچھوں تو؟“ زیر شاذیہ سے سکریا۔
 ”تو نقصان آپ ہی کا ہوگا۔“ شاذیہ نے بڑے سرسری
 لب میں کہا۔ ”تو کتنے ہیں میری بیٹی کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے؟“
 ”اے۔۔۔۔۔ زیر نے ٹپکیں جھپکائیں۔ ”نوبت یہاں جا رہی ہے۔“
 ”پھر تو پوچھنا ہی پڑیگا۔“
 ”آئی نے آپ کو گھبرا دیا ہے؟“ شاذیہ مسکرتے ہوئے بولی۔
 ”مگر انہیں میسرے کے بچے کے لئے معلوم ہوا؟“ زیر نے
 ہرگز نہ پوچھا۔
 جواب میں شاذیہ نے گوشہ رات کی تمام باتیں اس کے
 سامنے دہرائیں۔

”تمہاری اُمی تو واقعی بہت سچا درخا خون معلوم ہوتی
 اب۔۔۔۔۔ زیر نے تقریر کی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا ہے۔“
 ”اس میں شک کا کیا ہے؟“ شاذیہ نے غصے میں کہنا۔ اب
 دیکھنا یہ ہے کہ جتنا کہے یا جان کتنی سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہیں؟“
 ”ان کی کھمک داری کا ایک ثبوت تو میں تمہارے سامنے
 آکر دوں۔“ زیر نے شرارت سے کہا۔ ”میرا حال یہ بتاؤ کہ ب تشریف لاؤں
 یا کیلا ہی آؤں یا باجگا جا بھی سادہ ہو؟“
 شاذیہ شرعاً لگی۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے
 ”اے۔۔۔۔۔ ہے کہا۔“
 ”آج شام کو۔“ اور اس سے پہلے کہ زیر کوئی جواب دیتا
 وہ اپنے کاس روٹ کی طرف جھگا گئی۔

شام کو زیر اپنی کار میں شاذیہ کی کوٹھی پہنچا تو آسیر بھی نہیں
 تھا۔ بلکہ والدین صاحب بھی اس کے منتظر تھے۔ آسیر نے گزشتہ رات ہی
 راتیں بڑی ہوشیاری سے سب کچھ بتا دیا تھا اور اس بات پر کراہ
 اور اتنا کہ اگر لڑکا اچھا ہو تو قلعہ میں شاذیہ پر چڑھنے کے بجائے اس کی
 زندگی کے خیال سے اس کی بات مان لینا چاہیے۔

زیر کو دیکھ کر اس کی باتیں سن کر اس کے لب و لہجہ اور
 لہجہ سے اس کی ذہانت اور شرافت کا اندازہ کر کے آسیر
 صاحب دونوں ہی کافی متاثر ہوئے۔ زیر نے انہیں بتایا کہ اس
 ان کا لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور اس کے والدین جو ایک
 آدمی اور اسے میں جہل نہیں رہا۔ نئی پوری فرض ہماری طرف سے خودی

ہے۔ آسیر ایک لڑکی کی ماں تھی وہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ چوٹی اس نے
 اپنی بیٹی کو عشق لڑائے پکڑ لیا ہے اس لئے اب یہی بہتر سمجھتی ہے کہ
 ان دونوں کی شادی ہو جائے لیکن پھر بھی اس نے شادوں کنایوں میں
 زیر پر پڑا فحش کرنا کہ وہ ہرگز مرنے خیال اس کے والدین نہیں ہیں اور اگر ان
 کے بچے ان کے مشو سے کوئی فیصلہ کریں تو وہ بھی ان کے آڑے آنے
 کی کوشش نہیں کریں گے۔ زیر کے مستقبل کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی اور
 اس نے بتایا کہ بیٹی اس کی کرنے کے بعد اس کا امداد کوئی ٹیکسیشن ٹرنگ۔
 لینے کا ہے کیونکہ وہ آئندہ انجینئر بننا چاہتا ہے۔ آسیر نے باتوں باتوں
 میں اسے دعوت دی کہ وہ کسی دن اپنے والد کو ساتھ لیکر لے کے لے۔
 یہ اتفاق ہی تھا۔ ایک دن آسیر نے سوچا کہ اگر وہ
 زیادہ تجسس ظاہر کرے تو کہیں اس کی ضرورت سے زیادہ خاموش نہ سمجھ
 لیا جائے۔ کہ تمام باتیں تو ہوئی رہیں لیکن مذہم صاحب کو یہ خیال آیا
 اور آسیر کو کہ وہ زیر سے یہ پوچھ سکے کہ اس کے والد کس ادارے میں
 جزیل مقرر ہیں یا ان کا کیا نام ہے۔ زیر کے رخصت ہونے پر مذہم صاحب
 کو احساس ہوا بھی لیکن آسیر نے کہا کہ اب اگلے اتوار کو وہ آئیں گے تو ان سے
 بھی تعارف ہو جائے گا اور اس کے زیادہ چچان بین کرنے کی کوئی ایسی
 ضرورت نہیں تھی۔

زیر بھی شاذیہ کے والدین سے مل کر اور ان کا رہن مہن
 دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ اُسے اپنے اُمی کی بہت پرانا تازہ تھا کہ اس
 نے نہ صرف گھر واپس چلتے ہی ان سے سب کچھ کہہ کر ایک آئندہ اتوار کو صبح
 سے ان کے بچے بڑ گیا اور اس وقت تک نہیں مانا جب تک وہ باپ اس
 تبدیل کر کے اس کے ساتھ کار میں نہ آئیے۔

گیٹ پر مذہم صاحب ان دونوں کے استقبال کے لئے موجود
 تھے۔ جیسے ہی زیر کے والد کا رے اترے وہ انہیں دیکھ کر کچھ چہرے
 زدہ رہ گئے۔

”ارے اطہر صاحب آپ؟“ وہ جلدی سے ہاتھ جھپکا کر گئے
 بڑھتے ہوئے بولے۔ ”زیر کے والد آپ ہیں۔ کمال ہے۔ اتنے دن سے آپ کے
 ساتھ جہاں کاروباری تعلقات ہیں لیکن کبھی آپ نے ذکر نہ کیا کہ
 آپ ایک ہونہار بیٹے کے باپ بھی ہیں؟“

”جی ہاں۔ گویا اپنے بہت بتا دیا تھا کہ شاذیہ جیسی اچھی
 لڑکی آپ جیسے گرم دھنک آدمی کی بیٹی ہے؟“ اطہر صاحب نے مسکراتے
 ہوئے جواب دیا پھر خود ہی بولے۔ ”مذہم بیٹی آج ہم لوگوں کے دیکھنے
 سننے اور بتانے کا زمانہ نہیں رہا۔ نئی پوری فرض ہماری طرف سے خودی

انجام دے لیتی ہے۔

”درست کہا آپ نے بہر حال تشریف لے چلے؟“ ندیم صاحب نے ڈرائنگ روم کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔

ڈرائنگ روم میں شاذیہ نگہان میں بچوں کی ساری تھی۔ اپنے والد کے ساتھ زہرا و ندیم صاحب کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے ساڑھی کا پلو سر پر ڈالتے ہوئے جب تک کہ سلام کیا۔ اس کا خوبصورت چہرہ شرم کی مٹھی سے گلزار ہو رہا تھا۔

”اگر صاحب یہ ہے میری بیٹی شاذیہ؟“ ندیم صاحب نے بتایا۔
”جی ہاں چچی! اگھر صاحب نے اُسے دُعا دی اور ندیم صاحب کی طرف دیکھا۔ ہماری بھانجی کہاں ہیں انہیں بھی تو بلائیے۔“

اسی لمحہ آسید نے کمرے میں قدم رکھا۔ اگھر صاحب دروازے کی جانب سے پلٹ کے کھڑے تھے۔ دروازے کی آہٹ سن کر گھوٹے آسید کی اورنگی نظر میں گرائیں۔ اور آسید کے دل و دماغ میں ایک طوفان اُٹا۔ اُس کا سر چلایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانٹ لگا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی پیشانی کی طرف اُٹھ گیا۔ اور گرنے سے بچنے کے لئے اُسے قریبی صوفے کا سہارا لینا پڑا۔ اگھر صاحب کے چہرے پر ایک پل کے لئے تیرے کیے تاثرات اُبھرتے اور بھر پور تھے اُن کی جگہ ایک طنز پر مسکراہٹ نے لے لی۔ ندیم صاحب نے اپنی بیوی کی ریاضیت دیکھی تو گھبرا کر آگے بڑھے۔

”کیا بات ہے آسید؟“ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔ شاید چکر لگایا تھا۔ آسید بہن سہارا نکھیں بند کئے ہوئے تھی۔“

”میں نے خیال سے آپ اپنے کمرے میں آرام کریں تو بہتر ہے۔“ زہرا نے کہا۔

”نہیں بیٹے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔“
”ٹھیک کہاں ہو۔ ذرا اپنی حالت دیکھو۔ چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا ہے۔ ہاتھ برفن ہوئے ہیں؟“ ندیم صاحب اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے شاذیہ سے مخاطب ہوئے۔ بیٹی اپنی انی کو اُن کے کمرے میں لے جاؤ۔

”میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“ زہرا نے نیر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹے۔ آسید نے آنکھیں کھول دیں۔ معمولی سی بات ہے۔ گھوٹو دکا ایک کلاس پی کر تھوڑی دیر

کے لئے لیٹ جاؤں گی تو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ بیٹی شاذیہ ڈرائنگ روم سہارا دو۔“

شاذیہ اپنی امی کی اس بگڑی ہوئی حالت پر بے حد حیران اور پریشان تھی۔ یہ اچانک ای کی ہو گیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر آسید کا بازو پکڑا اور اُسے سہارا دیتی ہوئی کمرے سے باہر گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر آسید نے اُس کی اپنے بستر پر ڈال دی۔ اُس کا چہرہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے امی؟“ شاذیہ نے سہرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”گھبراؤ نہیں بیٹی میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ آسید نے نفاس سے جواب دیا۔ ”تم جاکر ہانوں کو پائے پیش کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

شاذیہ چلی گئی مگر آسید کے دل میں جو طوفان برپا تھا اُس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شاذیہ اور زہرا کی محنت نے دل کی گڑباز میں دفن میں دبی ہوئی چنگاری کو کڑیا تھا اس وقت اچانک اور غیر متوقع طور پر اگھر صاحب کے سامنے آ جانے سے وہ چکاری بڑھ کر شعلہ بن گئی تھی۔ اور ان کا تپتے ہوئے شعلوں کی چادر پر آسید کا قصور اُن یادوں کو ابھرتے ہوئے دکھ رہا تھا جنہیں اُس نے کبھی نہیں برس میں جی جان سے بھلانے کی کوشش کی تھی مگر بھلا کی تھی۔

اُن دنوں وہ سینکڑوں میں بڑھ رہی تھی۔ ایک دن کالج سے واپس آئی تو اُس نے گھر میں ایک نئے ڈرک اضافہ پایا۔ اگھر صاحب بہت حسین پُرفار شخصیت کا مالک۔ اُس کی سیاہ جھکا آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی اور باتوں سے مناسبت۔ وہ اس وقت بی کام فائنل کا طالب علم تھا اور اُس کی امی کے بقول اب تک ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن نے کر پاس ہوتا رہا تھا۔ اگھر صاحب سالہ بچوں کے باوجود آسید اُس کی محنت و محنت سے حقیقت سے مسحور ہو گئی۔ اور پھر اسی گھر اُس کی امی نے بتایا کہ اگھر کے ماں باپ اچانک ہی ایک بڑے زمین امتلا کر گئے ہیں۔ اس کے والد آسید کے والد کے گھرے دوست تھے اس نے کوئی اور قریبی عزیز یا مرید نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔

”اب اگھر میں رہے گا۔“ امی کی امی نے کہا۔ گھر کا کچھ کمرے کا اور بڑھتا بھی ہے گا۔“

گھر کا کچھ کمرے گا۔ آسید کے ذہن کو ایک جھٹکا سا گھبراہٹ ملا۔ اور اُس کا پہلا حسین تاثر امارت کی دلہیز پر ہو گیا۔

”اے“ وہ بڑی خوش ہوئی۔ میری یہ کتابیں اگھر صاحب کے اندر رکھ دو۔“

اگھر صاحب کا شاد و پیشانی پر مسلوں پر لگیں۔ آنکھوں میں ایک کرب و انحراف کیفیت نمودار ہوئی۔

”مخل مجھے اپنا بیٹا کب کہاں لائے ہیں؟“ اُس نے نرمی سے کہا۔ ”بیٹوں کے لئے گھر کا کام کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن آپ نے جس لیے مجھے میں مخاطب کیا اس سے انسانیت کی توہین کا یہ پلو نکلتا ہے۔ آپ خود اپنی کتابیں کمرے میں چاکر کر دیں۔ میں کام نہیں کر سکتا۔“ آسید کے ذہن کو درد سرا جھٹکا لگا۔ تو یہ نفس خود داری کا دم بھرتا ہے کوئی سخت جواب دینے والی تھی کہ اس وقت اس کے آجائے۔ انہوں نے اگھر کی بات سن لی تھی اور اس پر ناراض ہونے کے بجائے مسکرا رہے تھے۔

”شاید بیٹے۔ ایک خود دار باب کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے کھڑے۔ یہ لڑکی اپنے آپ کو نہیں کیا سمجھتی ہے۔ تم نے اسے بڑا اچھا جواب دیا۔“

آسید پر لگی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی جھلاہٹ زیادہ دن برقرار نہیں رہ سکی جلد ہی اُس نے محسوس کر لیا کہ اس کے آبا جان اگھر کو اس کے نہیں سمجھتے اور نہ اس کے لئے تیار ہیں کہ کوئی اور اسے کٹر سمجھے۔ رفتہ رفتہ وہ اگھر صاحب کے چالے بھی لگ گئی۔ اس کے ساتھ کالج بھی جانے لگی۔ بننا برون کے تعلقات میں کوئی کافی اتنی نہیں رہی لیکن اگھر کی خود داری نے اُسے چوٹی کی نکتہ دی تھی وہ ایک گروہ بن کر اس کے شعور میں چھپ گئی۔ اپنے کالج کی حسین ترین لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ لڑکوں سے نامزد داری کی غازی تھی۔ اگھر کا خود دارانہ طرز عمل اس کی امارت میں نہیں اس کے دُشمن کی تذلیل بھی تھا۔ یا کم سے کم اس وقت اس کا یہ بھی تاثر تھا۔ دن اسی طرح گزرتے گئے۔ اگھر صاحب کام کر دیا۔ وہ بی بی میں آگئی۔ اگھر صاحب اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی اُس کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا کہ وہ آسید کو اپنے مرنے اور سرپرست کی بیٹی سے کچھ زیادہ محبت دیتا ہے۔ لیکن اس کی پسندیدگی اتنی خاموش اور خود اس کی طرح بڑھتا تھا کہ آسید کو کچھ اور جھلاہٹ میں جھٹکا لگتی تھی۔ اکثر یوں جوتا کہ باتیں کرتے کرتے اگھر صاحب لڑکی کی نظروں سے اُٹھ جاتے گستاخ کے جوت کچھ کہتے کہتے آسید کے دل کی دھڑکیں تیز ہونے لگتیں وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اگھر کی زبان سے کچھ ایسے الفاظ سننے کیلئے جیتا ہوا گھٹی جاس کے چہرے پر بھیلی

ہوئی مٹتی کچھ اور گھر کر سکیں لیکن اگھر کو نہ جانے کیا ہو جاتا کہ وہ وقتاً اپنا ارادہ تبدیل کر کے کوئی بہت ہی بے بسی بات کہہ دیتا اور آسید اپنے ہونٹ کاٹتی ہوئی اٹھ کر چل دیتی۔

اور پھر نہ جانے اسے کیا سوچا کہ اُس نے کالج کے لڑکوں سے غلط کرنا شروع کر دیا۔ آج اس کے ساتھ گھونٹے جاتی۔ کل کسی اور کے ساتھ کچھ دیکھتی اور پھر اس کی اور کے ساتھ کسی رستہ میں چائے پی رہی ہوتی۔ اگھر کا ایم کام کا اور اس کا لے کے کا آخری سال تھا۔ وہ پہلے آسید کو اُس کے کالج چھوڑنا اور پھر خود کو بیوروٹی چلا جانا اسی طرح واپسی میں وہ لے کے کالج سے لیتا ہوا گھر پہنچتا۔ لیکن اب اسے بڑی بڑی دیر تک کالج کے گھر پر آسید کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کی یہ تازہ عرصہ فتنیں اگھر کی نظروں سے بھی چھپ نہ سکیں۔

ایک دن وہ ایک لڑکے کے ساتھ گھوم کر واپس آئی تو سر پیر کے پانچ بج چکے تھے۔ حسب توقع اگھر کا لے اس کا منتظر تھا۔ ”اپنی فوج میں دوسرے کے وقت کا بھی خیال رکھا کرو؟“ اگھر نے نیچے دیکھ کر کہا۔ ”میں دیکھتے تھا۔ انتظار کر رہا ہوں۔“ ”آئی ایم سوری۔“ وہ ہونٹ مسکراتے ہوئے ”میں ذرا سیلم کے ساتھ کافی ہاؤس چلی گئی تھی۔“

وہ دروازہ کھول کر کچھ سیلم پر بیٹھ گئی۔ اگھر نے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ہونے کا اشارہ لگا۔ کالج کے کچھ کا فاصلہ چھ سات میل سے کم نہیں تھا۔ اگھر کو خود خاموشی سے کار چلا کر آیا۔ ”آج کل جس رستے پر چل رہی ہو آئیے وہاں تیس کی خطرناک موٹر تک بھی لے جا سکتا ہے۔“ آخر اس نے نرم لہجہ میں کہا۔

”تمہارا شاؤ غائب کیسے اپنے کلاس کے لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے ہے۔ مگر یہ تو اُن تہذیب میں شمار کیا جاتا ہے؟“

”گھر مٹتی تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتی۔“ ”مٹتی تہذیب تمہارا مطلب اگر گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر بیٹھا جاتا ہے تو میں اس پر نکتہ سمجھتی ہوں۔“ ”انتہا پسند کی تہذیب کے لئے بھی مفید نہیں ہوتی برا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اُس نے کچھ تیزی سے پوچھا۔ ”تم جن لڑکوں کے ساتھ باہر جاتی ہو وہ اپنی غنڈہ گردیوں کے لئے بدنام ہیں۔“ اگھر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ”میں خود اسی کالج میں پڑھ چکا ہوں اور ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کے

ساتھ تم کسی دن ایسی صورت حال سے بھی دوچار ہو سکتی ہو جو تمہاری ساری زندگی کو ذلت و رسوائی سے دوچار کر دے۔
 ”اگر وہ جتنی کرے گی“ اپنی حد کے اندر رہو۔ کیا اچھا ہے کیا برا۔ میں خود بھی سمجھ سکتی ہوں۔ تم بیک وقت ذاتی معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟
 ”اچھا کہیں اپنے والد کی جگہ سمجھتا ہوں“ اگلے ہی ٹری سنیوگ سے جواب دیا۔ ”اور یہی مطلق مجھے مجبور کر رہا ہے کہ تمہارے سخت الفاظ کے باوجود تمہیں تباہی کے اس گڑھے سے بچانے کی کوشش کرنا چاہیے کی طرف تم بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہو؟
 ”اس فوارش کا بہت بہت شکریہ سزا اگر“ اس نے بڑے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”لیکن لوگوں کے ساتھ گومنا چھوڑنا تباہی بڑا ہے تو پھر جواب کی اپنے سامنے کیا رائے ہے آئی جانی تو میں آپ کے ساتھ بھی ہوں۔“
 اگر کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے بات سن کر انتہائی تکلیف پہنچی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہ گیا۔ گراہک بار پھر اس نے بڑے ضبط کا ثبوت دیا۔
 ”میری بات دوسری ہے۔ یہ کسی ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو تمہاری عزت و وقار کے خلاف ہو۔“ اگر نے بڑی تیزی سے کہا۔
 ”تصور تو آپ بھی کر سکتے ہیں سزا اگر“ اس کے ہلے میں طنز کی شدت ہی نہیں جھلکا ہوا تھا۔ ”یہ دوسری بات ہے کہ آپ اپنے تصور کو عملی حیثیت دینے کی جرات سے محروم ہیں۔ بہر حال اپنی جگہ اس بند کر دیں۔ مجھے آپ کے مشوروں اور نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔“
 اگر نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گیا۔ اس بات کو ابھی زیادہ دل نہیں گڑھے تھے کہ ایک اتوار کو وہ غسل کر کے نکلی تو بال سکھانے کے لئے لان میں آجیٹھی۔ اس وقت اس نے سفید سا ریشی باندھ رکھی تھی۔ اس کے لائے سیاہ بال شانوں سے کرکٹ ہل رہے تھے۔ اس کا سرخ و سفید رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا اور وہ یقیناً بے حد خوبصورت اور دلکش نظر آ رہی تھی کہ لڑکے لڑکیوں کے بعد پہلی مرتبہ اگر کے جذبات اس کی بھید کی پر غائب آگئے۔ اس نے گلاب کی کاریوں سے ایک بڑا سا سفید پھول توڑا اور جھکتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔
 ”آسیہ“ اگر نے آہستہ سے کہا۔

”فرمائیے“ اس کا بچہ سب عادت بڑا فتح تھا۔
 ”اجازت ہو تو پھر بچوں تمہارے باؤں میں لگ دوں۔“
 آسیہ کا سر غرور سے تن گیا۔ آج اس نے اگر جیسے انسان سے اپنے حسن کا خراج وصول کر لیا تھا۔
 ”سزا اگر“ وہ نے نظروں سے گھسیٹتے ہوئے بولی۔ ”میں اس کی ہمت کیسے ہوتی؟“
 اور یہ کہتے ہوئے اس نے اگر کے ہاتھ سے پھول چھین کر اسے اپنے پیروں سے سل دیا۔ اگر کا خوبصورت چہرہ اکدم سفید پڑ گیا۔
 ”میں نے کوئی ایسی گستاخی تو نہیں کی تھی جس کا جواب اس طرح دیا جاتا۔“ وہ بھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اور پھر اس پھول نے تمہارا کیا جگاڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں پھول پسند ہیں۔“
 ”جنگل کے پھول پسند نہیں۔“ گریٹھے والا پسند نہیں۔“
 ”آسیہ آخر تم اتنی مغرور کیوں ہو؟“
 ”میری مرضی۔ تمہارے مزاج پر شک ہے؟“
 ”تم نے سچ کہا آسیہ۔“ اگر نے ایک عجیب سی سیلی میں ایک لمحہ کے لئے اپنی حیثیت بھول گیا تھا۔
 ان الفاظ کے ساتھ وہ تیزی سے گھوما اور جھپٹکا نے ہوئے کوئی میں چلا گیا۔ آسیہ کے سخت الفاظ کے بعد وہ اس کے علاوہ کچھ اور کبھی نہیں سکتا تھا مگر دھانے کیا بات تھی کہ اس کے جاتے ہی آسیہ جی لان میں بیٹھا نہ جاسکا وہ بھاتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی اور بہتر کر گئے ہوئے کچھ میں مٹھ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔
 اور پھر اس کے دوستوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب یہ حالت تھی کہ کالج میں روزانہ اس کے بارے کوئی نیا اسکینڈل سننے میں آتا رہتا۔ یہاں تک کہ ان کی چاکریوں میں وہ بیٹھے فائنل میں نہیں ہو گئی۔ دوسری طرف اگر نے نہایت شاندار نمبروں سے ایم بی پاس کر لیا۔ آسیہ کی جھلکا ہوا بد مزاجی اور اسی کے ساتھ اس کی آواز گردی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر ایک دن وہ بھی آگیا جب ان اسکینڈلوں کی مدد سے بارگشتہ اس کے والد کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اور انھوں نے نہایت دانشمندی کے ساتھ آسیہ کو کالج سے اٹھانے کے ساتھ ہی اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اگر کے ساتھ۔ اس کی اتنی جو ممکن ہے پہلے اگر کی غریبی کے باعث اسے زیادہ قابل توجہ نہ سمجھتی ہو اب ان چار پانچ برسوں میں اس کی اتنی گودیدہ ہو چکی تھیں کہ انھوں نے اس فیصلہ پر اعتراض کرنا تو کجا اس پر اپنی سرت کا انجبار کیا اور

”ان کوئی پکارا سیر سے بات چیلو۔“
 ”بھئی ایک نایک دن لوگوں کو ماں باپ کے جدا ہونا ہمارے شرم جہاز کی آکھنی چلی ہو اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسے بولنے کا ایک ایسا فیصلہ کیا ہے کہ شادی کے بعد بھی ہم دونوں نہیں ہونا پڑے گا۔ تمہارے ابو تمہارا بااثر اگر کے ہاتھ میں بنا رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اگر بہت زیادہ دیر کا ہے اس کا مستقبل بہت شاندار ہے اور وہ تمہارے لئے بہترین شریک حیات ثابت ہو سکتا ہے۔“
 ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں اتنی؟“ آسیہ نے ناک سکڑ کر ترش لہجہ میں کہا۔ ”جو شخص ہمارے گروں پر رہا ہو اس سے اپنے شوہر کے روبرو میں نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کی اور ان کی نظروں میں اتنا ناہمی قابل اور چوڑا کیوں نہ ہو کہیں مگر بات آپ اتنی طرح کہہ رہی ہیں کہ میں مجاہدوں کی گراہی کے ساتھ شادی نہیں کروں گی؟“
 اس دیر دیر کے ساتھ اس نے اپنی شادی کے مسئلہ پر اتنے دھچک کر اس کی امی سے زبردہ رہ گئیں۔ انھوں نے پھر بھی اتنا نہیں لے اور دن کے کچھ کوشش کی لیکن آسیہ کا انکار اقرار میں وہیں بال سکیں۔ کچھ دن اور گزر گئے۔ اب وہ اگر سے بات کرنا بھی ان تو بہن خیال کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف اگر کا یہ حال تھا کہ جیسے وہ ان بات اس سے کہنے کے لئے موقع کا مستلاحی جو بار بار اس کے قریب آتا اور کچھ کہنے کی کوشش کرتا لیکن آسیہ بڑی بے اعتنائی سے منہ پھیر کر ہاتھ دیتی۔ پھر اس نے ایک دن اپنے ابو اور امی کو باتیں کرتے سنا۔ اگر نے ان بہت بڑی غیر ملکی فزم میں ملازمت کر لی تھی اور وہ فزم اسے وہ انسانی کی مزید تعلیم کے لئے اپنے اخراجات پر باہر بھیج رہی تھی۔ ان کے ابو انھیں کر رہے تھے کہ اتنا اچھا لڑکا ہانچا کر نکالا جا رہا ہے۔ آسیہ زیادہ نہیں سنی تھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ زمین کا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی عزیز ترین شے اس سے ہٹ چکی ہو۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”کون ہے؟“ اس نے پڑ پڑ سے لہجے میں پوچھا۔
 جواب میں دروازہ کھلا اور اگر اندر داخل ہوا۔ وہ اتنا دوش بڑا افسردہ اور عجیب اچھا سا نظر آ رہا تھا۔ آسیہ کیوں اس پر اس جیسے کوئی اس کے دل کو اندر ہی اندر مسموم رہا ہو۔ اپنی باتیں میں اگر اسے اتنا پیارا لگا رہا تھا کہ ایک لمحہ کے لئے آسیہ کا

جی چاہا اس اگر کو اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں اس طرح چھپالے کہ پھر وہ بھی وہاں سے باہر نہ نکل سکے۔ لیکن دوسری لڑکی اس کے غور نے پھر اس کے مزاج پر قابو پایا۔
 ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس نے بڑے رشک سے کہا۔
 ”آسیہ“ اگر نے بڑے کرکے سا سوچا۔ ”کیا تم زندگی میں ایک بار بھی مجھ سے نرم اور ہنس بات نہیں کر سکتیں؟“
 ”میرے لچکے بات چھوڑ دو جس کام سے آئے ہو۔ کہو اور چلے جاؤ۔“
 ”میں اگلے ہفتے تمہارے گھر سے جا رہا ہوں۔“
 ”بڑی خوشی کی بات ہے۔“ آسیہ نے طنز کیا۔ ”پھر وہاں نہ آنے کا وعدہ کرو تو مجھے اور بھی خوشی ہوگی۔“
 ”کیا تمہیں میرے جانے کا اتنا سا بھی افسوس نہیں ہوگا۔“
 ”کیا سچ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے؟“
 ”میرے دل میں جگہ تو تمہارے لئے یہ خوش فہمی نہیں

کب سے ہو گئی؟

کیا نہیں معلوم ہے کہ انہی تہاڑی شادی میں سے ساتھی کرنا چاہتے ہیں؟

"اُمی نے مجھے بتایا تھا مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا تھا اور اب تم بھی کان کھول کر سن لو کہ میں تم جیسے مجلسِ نوجوان سے شادی نہیں کر سکتی۔ آخر تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔ تمہارے پاس ہے کیا؟

"میں نے کہا کہ میری شادی ہے۔ میں نہیں دل وہاں سے چاہتا ہوں۔" اُمی نے ہنستے ہوئے کہا کہ میری واپس اس کے علاوہ جہاں تک دنیاوی دولت کا تعلق ہے تو تمہارے من لیا ہوگا کہ میں مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ جا رہی ہوں۔ تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہی میں صلاحیت ہو تو تو وہ اپنا مستقبل جتنا چاہے شادمان بنا سکتا ہے۔

"مجھے خواب دیکھنے کی نادت نہیں ہے اور جہاں تک جنت کا تعلق ہے تو میں اسے بجا سمجھتی ہوں۔ اس نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں ہے۔ تم جیسے خود غرض لوگ کبھی اپنی جہاں کو اور کبھی کسی دنیاوی مفاد کو اس خوبصورت فطرت کی آڑ میں چھپانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن میں اس کا راز کیسے قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میرا کوئی تعلق تم سے اس کے سوا نہیں ہے کہ تم میرے گھر میں میرے والدین کے بچوں پر پرورش پال رہے تھے۔"

اگرچہ وہ پہلے سفید اور پھر غصہ میں انتہائی سرخ ہو گیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی بے ذہنیت کی مالک ہو۔ وہ بڑی کوشش سے اپنے غضب پر قابو پاتے ہوئے بولا: میں کبھی تمہارا تہاڑی بڑا بچہ نہ تھا۔ میری جھلاہٹ ایک پردہ ہے جس کے پیچھے تم اپنے دلی جذبات چھپانے کی کوشش کرتی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں مجھ سے جنت ہے اور چوکیں میاں ہو کر اس جنت کی پذیرائی کرنے سے قاصر ہوں اس لئے تم مجھے جلائے اور ستائے کے لئے دو سو لاکھوں کے ساتھ گھر چلی ہو لیکن آج معلوم ہوا کہ تم غریبی نہیں خود سر اور خود غرض بھی ہو۔ تمہاری آوارگی خوفناک نہیں تمہاری اپنی فطرت ہے۔"

"شٹ اپ! آئیڈیوٹ! آؤٹ!"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ اور میری کوشش یہ ہوگی کہ اُنہی زندگی میں بھی تمہاری صورت نظر نہ آئے۔" اُمی نے پہلی مرتبہ غصہ کی تیزی سے کہا۔ لیکن میری بات یاد رکھنا آئیڈیوٹ نے اپنی ذہنیت تبدیل نہیں کی تو ہنسی زندگی؟ ہم نہیں جانے کی جنت انسانی فطرت کا ازل و آخر۔

واحد ہے۔ اور نہ میری مدد ہو جس یا مفاد پرستی نہیں وہ پاگل بے فرائض جذبہ ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں ہو سکتا۔ میں آج پہلی اور آخری بار تمہارے اس جذبہ کو بیدار کرنے آیا تھا۔ اس توقع میں کہ اگر اب بھی تمہاری طرف کوئی ایسا فرائض رکھتا ہو تو شاید ایک دن ہم ساتھ مل کر زندگی کا سفر کر سکیں لیکن یا تو تم اعتراضِ جنت کو اپنے غرور و انانیت کی غمت سمجھتی ہو یا پھر تمہارا پیتر دل اس گداز سے واقعی محروم ہے۔ دروڑوں و بوزوں میں تمہاری حیثیت ایک زندہ لاش سے زیادہ نہیں۔ اور اُمی بھی زندگی کی حقیقی منزلوں سے آشنائیں ہو کر تھیں۔ اُمی چاہیگا۔ آئیڈیوٹوں محسوس ہو جیسے کسی نے انتہائی تیز رفتار کی پتھری سے اس کے دل کو جھٹکے ہوئے ہے۔ اور ہرگز ایک نیا دل ہی کہ اُمی کی جنت میں دھڑلے ہو۔ غرور و انانیت کے دیرینے جوش نے اپنے چاروں طرف کھلے کر کھلے کھلے آگے کی آن میں گر گئے۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اُسے اُمی کی جنت ہے کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

"اُمی! اُمی! اُمی! اس کا دل ہی جیت اُمی! مت جاؤ اُمی! تمہیں سچ کہا۔ میں تم سے جنت کرتی ہوں مرنے سے۔" گلاب کر کے کی بوجھن فضا میں اس آواز کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اگرچہ سچ ایک منہ بھر کے بعد لکھنا پڑا تھا۔ آئیڈیوٹ اس کے بعد اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ اُس کے اندر اتنی جنت ہی نہیں تھی کہ اُمی کے لئے کئے الفاظ میں محالہ کرنے کے بعد پھر اس کے سامنے جانے کا حوصلہ کرے۔ اس سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے۔ یہ کہہ کر اس کے گھر میں قدم رکھنے سے آج تک وہ اس سے نفرت نہیں جنت کرتی رہی تھی۔ اُسے اُمی کی کہ اُمی کے کم چلنے کے بجائے اُس سے ملنے آئے گا اور اس وقت وہ زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اُس کے قدموں پر پائس رکھ لے گی۔ شاید اس کا دل پیچ جائے اور بار بار جنت پھر بڑی جیت لے گا اور اس میں جہاں اس کے کان اُمی کے قدموں کی آہٹ پر اور نظریں دروازے پر رہیں مگر اُمی نہیں آیا۔ ایک بار پھر آئیڈیوٹ کا ردِ عمل خود کو وہ ثابت نہیں کر سکا جو کہ حقیقت میں وہ تھا۔ اس کے بچوں کے سر میں بندھے ہوئے کھلنے کی انتہا سمجھا اور خود بھی اپنی جنت کو نفرت کے جھان میں بند کرنے کے بجائے لکھنا چاہیگا۔ اس طرح کہ پھر اس کے پاس سے میں کبھی آئیڈیوٹ کو کوئی خبر نہیں مل سکی۔

اور پھر اُس کی زندگی بھر تبدیل ہو گئی۔ کچھ مدت بعد اُمی کے گھر سے اُس کا پیغام آیا اور اُس کے والدین نے اُسے منظر کر لیا۔ اُمی نے اُمی کی پھر آئیڈیوٹ سے پوچھا مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتی تھی۔ اور اس طرح اُمی کے ساتھ اُس کی شادی ہو گئی۔ مذہم صاحب بڑے دو تہہ گھر لے کر تھے تھے اور دو تہہ کی کئی عیوب ان میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ شراب اور کس کے بے حد سیانے۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں اُمی کی زندگی انتہائی تلخ گزری گروہ لے لے گناہ کا کفارہ کچھ کر پڑی خاموشی اور صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتی۔ پھر آہستہ آہستہ دس سال کے بعد مذہم صاحب کو جوش آیا۔ بچوں کی پیدائش اور اُن کی ذمہ داری نے انہیں کچھ سنبھالایا۔ آئیڈیوٹ کے بھانے پر انہوں نے اپنی تمام خراب عادتیں چھوڑ دیں۔ لوہے کی ایک آہٹیں برداشت کرنے بعد آخر آئیڈیوٹ کی زندگی میں بہا کی تھوڑی سی خوشی پیدا ہوئی۔ اُسے کچھ سکون نصیب ہوا اور وہ بچھے لگی کہ شاید اب اس کی باقی زندگی عین سے بسر ہو جائے گی۔

لیکن حالات نے پھر ایک پلٹا لکھایا اور کچھ سال بعد تقدیر نے ایک مرتبہ پہلے اُمی کے سامنے لا کر رکھا۔ اور کتنے مختلف انداز میں آج اس کی پیشانی کی خیر کے دم سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ زیرے۔ جو کہ اُمی کا بیٹا تھا۔

شام تک اُمی بڑی طرح بخار میں مجلسِ رحمتی۔ مذہم صاحب اُس کی خوب حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ فوراً ڈاکٹور کو لیا۔ دس جو بہتر سے بہتر علاج و معالج فراہم کر سکتی تھی وہ آئیڈیوٹ کے فراہم کر دیا گیا۔ آئیڈیوٹ تقریباً ایک ماہ تک بستر سے اُمی کے گھر پر آہستہ آہستہ اُمی کی طبیعت سنبھلتی گئی۔ اور اُمی کے بعد پہلی بات اُسے معلوم ہوئی وہ یہ۔ یہی تھی کہ اُس دن اُمی صاحب رشتہ کی کوئی بات کئے بغیر چلے گئے تھے اور پھر نہیں گئے۔ آئیڈیوٹ جانتی تھی کہ اس کی وجہ کیلئے گھرہ اپنے دل کو پہلا رہی تھی کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اُمی اپنی جنت کا انتقام اُس سے نہیں لے سکتا۔

دوسری طرف زبیر کی لپٹ والہ کی پراسرار خاموشی سے یہ ان تھا۔ اُس نے ایک دور دراز بات چیت کرنے کی جنت کی تھوپیٹے اُمی نے اُن کا جواب دیا۔ مگر پھر بعد میں کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ ابھی تو دروڑوں تعلیم حاصل کر رہے ہو۔ ہر بات اپنے وقت پر چلی گئی ہے۔ پہلے خود کو اس قابل تو بنا کر اپنے ساتھ کسی دوسری ہستی کا بار بھی سنبھال سکو پھر دیکھا



جھڑیاں

جھڑیاں پر جھڑیاں پڑ گئی ہوں تو ان کا آسان علاج یہ ہے کہ تھوڑے سے خالص شہد میں لیمو کا رس ملا لیجئے۔ اور دن میں ایک یا دو بار چہرہ پر لٹے اور آدھے گھنٹے بعد دھو ڈالئے، ایک بیٹے تک اس پر عمل کرنے سے جھڑیاں دور ہو کر چہرہ صاف ہو جائے گا۔



جائے گا۔ یہ ہی بات زبیر نے شادی کے اصرار کے جواب میں لے کر لائی اور جب شادی کے دن آئیڈیوٹ نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا تو آئیڈیوٹ نے اطمینان کی سانس لی کہ کم ہے کہ اُمی کی نفرت اس مقام تک تو نہیں پہنچی جہاں وہ دو ٹوک الفاظ میں دامن چھا کر الگ ہو جائے۔ کون جانے جس طرح وہ آج تک اس کی جنت اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے اُمی بھی اس سے نفرت نہ کرتا چھوڑا شادی اس بات پر آمادہ ہو جائے کہ شادی کی ماں نے جس سرت کے اس کی بھولی میں ڈالنے سے انکار کر دیا تھا وہ اُس کی بیٹی کے بچل میں ڈال دے۔

حالات اُمی کے رُخ چل رہے تھے کہ تقدیر نے ایک اور کڑوت بدلی۔ مذہم صاحب اپنی بڑس کے سلسلے میں جڑی پلے گئے اور پھر ماں سے واپس نہ آ سکے کہ اُمی کے ایک حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد ان کی لاش بھی اس قابل نہیں رہی کہ اسے دفن واپس بھیجا جاسکتا چنانچہ اُمی میں دفن کر دیا گیا۔ ایک سال سے اس کا امی کی خیر آئیڈیوٹ پہنچانی اور پھر اُس کی دلدوزی میں زینت و آسان بھی تھکر کر گئے اُس کا سبک لٹ چکا تھا۔ والدین نے زندگی کی کٹھن منزلوں سے گزرنے کے لئے اُسے جس رُخ سفر کے لئے کیا تھا وہ اُسے نصیب راتے ہی میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور مذہم صاحب کیلئے آئیڈیوٹ کے لئے آواز اُن کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ وہ تنہا ایک بہت بڑے کاروبار کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کا تو ہی امکان تھا کہ کوئی مجلس اور دنیا دار نگراں میٹر

نہیں آیا تو نوٹے کھوٹنے والے لاکھ لاکھ گھر کو خاک کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگا میں گئے۔ مدت کے دن پورے ہوتے ہی آس نے چاروں طرف ٹھکوں کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ عورت جو نے کی وجہ سے بدو خدا اس قاب قلمی اور شاذیہ نے وہیں سے باختر پہنچ گیا تھا جو ایک نئے کاروبار کو کھولنے سے پہلے۔ شاذیہ کا بھائی شاہد زمر تھا۔ زیر تعلیم تھا اور ابھی دس باو سال تک اس قابل نہیں ہو سکتا تھا کہ خود کو باک کا بٹنیں ثابت کر سکے۔ مرن ایک ہی محل میں تھا وہ شاذیہ کی شادی کر کے اور پھر اس کا شوہر کا وہاں بھی بھجوا لے۔ زیر تعلیم محسن کر چکا تھا۔ مگر ایک مرتبہ کے بعد اگلے دوبارہ کوئی میں قدم رکھا تھا اور وہ اس کی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے آئی تھی جس سے اس کا عذر معلوم ہو سکے۔

آس ابھی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ شاذیہ نے ماں کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے زیر سے اس کا ذکر کیا اور زیر ایک بار پھر اپنے والد کے سامنے سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹے تم شاذیہ کے لئے اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو؟“ اہل صاحب نے جواب دیا: ”وہ لڑکی اچھی ہے مگر مجھے وہ لوگ پسند نہیں ہیں۔ بہت مغرور اور دلکش تھے میں چور ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ اس کی ماں نے مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی تھی؟“

”آپ کو معلوم نہیں ابوان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ایک مہینے تک بھاری رہی ہیں۔ ورنہ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔ میں جب کہی جاتا ہوں بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتی ہیں۔“ زیر نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے؟“ اہل صاحب نے لاپرواہی سے کہا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر گھر والوں کی لڑکیاں ابھی بچی ثابت نہیں ہو سکتیں تو ہمارے ملے لڑکیوں کی کسی نہیں ہے ایک ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے؟

”مگر تو میں شاذیہ کو پسند کرتا ہوں؟“ زیر نے ہمت کر کے کہا۔ ”اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی ہے؟“

”ممکن ہے یہ عرض تھا ہارا اندازہ ہو؟“ اہل صاحب نے کہا۔ ”کالج میں پڑھنے والی دولت مند لڑکیاں فیشن کے طور پر فلرٹ کرنے کی عادی ہوتی ہیں؟“

”مگر شاذیہ ایسی نہیں ہے۔ وہ کالج میں میرے سوا کسی لڑکے سے بات تک نہیں کرتی تھی؟“

”تو تب یہ تھا؟“

”جی۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“

”تم کچھ بھی نہیں سکو گے“ اہل صاحب نے بات ٹالی۔ بہر حال ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ مجھے کچھ غور کرنے دو؟“

”مگر تو آپ جانتے ہیں کہ نیک صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ کوئی ماں کے کاروبار کو سنبھالنے والا نہیں ہے۔ شاذیہ کہہ رہی تھی کہ اگر ہماری طرف سے پیام نہیں ملتا تو۔۔۔۔۔“

”اگر انہیں ایسی ہی جلدی ہے تو شاذیہ سے کہو کہ اس کی اتنی خود انگریز سے بات کریں؟“ اہل صاحب نے زیر کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن لڑکی والے اپنی زبان سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”بحث کی ضرورت نہیں ہے؟“ اہل صاحب نے نرم کر چکا تھا۔ اہل میں کہا۔ ”پیر آخری فیصلہ ہے جب تک شاذیہ کی اتنی خواہشات نہیں کریں گی میں اس سلسلے میں غور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں؟“

زیر نے والد کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک کوئی معقول وجہ ہو اس کے ابو کی معاملے میں اتنا سخت رویہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ جرات ضرور تھا کہ آخر اس کو کسی بات ہے بھی نہیں اس سختی پر مجبور کر رہی ہے لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں شاذیہ سے بات کرے اور جیسا کہ اسے اندیشہ تھا شاذیہ نے سننے ہی کہا اس کی اتنی بات کے لئے ہرگز رضی نہیں ہوں گی۔

”مجھے اس کا احساس ہے؟“ زیر نے جواب دیا۔ ”لیکن بات کچھ ایسی آکر پڑتی ہے کہ کوئی اور صورت بھی نظر نہیں آتی۔ ابو کسی پر اسرار وجہ سے تھکے گھر جانا نہیں چاہتے۔ وہ تم کو گونگنہ اور فیشن پرست خیال کرتے ہیں۔ یہاں سے کہ حال میں انہیں تم لوگوں کو کتنے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا کہ جس کی بنا پر وہ کوئی رے اس سختی کے ساتھ قائم کر سکتے۔ ہیں اس کی جڑیں ماں میں تلاش کرنا ہوگی میرا اندازہ ہے کہ شاید ہماری اتنی ادھر سے لاپرواہی کسی ایک دوسرے سے واقف رہ چکے ہوں اس اندازے کی روشنی میں اگر ابھی ابی کی اس بیماری کو دیکھو جس میں ہم سے خیال کے مطابق وہ لڑکوں دیکھنے کے بعد ہی جتا ہوئی تھیں تو میرا یقین اور محبت ہو جائے۔ تم کو کوشش کرو۔ اس میں کسی یقین یا ذلت کا پہلو نہیں دکھاتا۔ کہہ کہ میں تمہیں اس کے لئے ہمراہ نہیں کہوں گا کہ تمہاری اتنی خود تمہارا رشتہ ہے کہ ہمارے گھر آتی نہیں۔ اس کے برعکس ہو سکتا ہے کہ اگر تمہاری اتنی ہمارے گھر آجائیں تو شاید ہماری کوششوں سے ماں کی کوئی بگڑی بات بھی بن جائے اور ساتھ ہی ہماری بھی؟“

شاذیہ سوچ میں پڑ گئی کچھ بھی اس نے اتنا وعدہ نہ کر لیا کہ وہ اتنی ہی ہے کہ بھر دیکھ گی۔ اور ایک دن موقع پا کر اس نے کچھ بھی کیا ات فوراً میری سے چھری تھی۔

”بڑا دعویٰ تھا تمہیں زیر کی محبت پر؟“ وہ دوپٹے میں بین اٹکتے ہوئے بولی۔ ”آخر اس کے والد پیغام کیوں نہیں بھیجتے؟ میں کہہ چکی ہوں کہ حالات مجھے جلد سے جلد تمہاری شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اگر ان کی طرف سے سلسلہ نہیں چھڑا لیا تو بعد میں مجھے الزام مت دیتا؟“

”اتنی آپ نے تو کہا تھا کہ میں زیر کو گھر لے آؤں پھر آپ خود اس کے والدین سے بات کر لیں گی کسی دن جلیں گا زیر کے گھر۔ اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں اچھا ہے بات صاف ہو جائے گی؟“

”کیسی باتیں کر رہی ہو شاذیہ؟“ انہیں عرض ہے تو موصوفہ نہ کر کہیں گے؟“ آس نے کچھ تیزی سے کہا۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے اتنی؟“ شاذیہ نے پکائی تھوٹے بولی۔ ”مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ابو نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک آپ ان سے بات نہیں کریں گی وہ کوئی بات نہیں کریں گے؟“

”ہوں؟“ آس نے ایک گہری سانس لی اور دل میں کہا ”اب تو تم اس طرح مجھے ذلیل کر کے اہل صاحبنا چاہتے ہو۔ مگر شاید میں اس کا حق پیچتا ہے۔ خیر تو یہی ہیں میں اپنی بیٹی کے لئے سوالیہ انداز نہ ہائے دیر ضرور ادا کر دوں گی؟“

لیکن وہ سونے میں جب وہ کونسی سے چلنے لگی تو ایک بار ”اس کے غور کرنے اس کے قدم روکنے کی کوشش کی۔ وہ اس شخص نے لہجہ نہایت ہی جسے اس نے خود اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس سے کچھ مانگا جا رہی ہے جسے خود اس نے کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے محبت کا واسطہ دینے چاہی تھی جس کے سامنے اس نے محبت کا مذاق اڑایا تھا۔ کیا اس کی سب سے بڑی شکست نہ ہوگی۔ ایک لمحہ کے لئے اسے لوں محسوس ہوا۔ آس نے اچھی کی راہ کو دیکھ کر پڑائی۔ آس ایک بار پھر زندہ ہو گئی ہو۔

اور وہ اس کی محنت اسے ہر مزاجی کے ساتھ۔ اور اس آس نے جا پا کہ لا رہی کو کونسی کی طرف موڑ دے۔ لیکن اس نے پلٹ کر دیکھا تو لڑکی کے انداز بگڑی ہوئی شاذیہ میں لے رہی وہ دوسری آس نظر آئی جسے تقدیر نے اسے ہر محبت اور غور میں سے ایک چیز انتخاب کرنے کا اختیار دیا تھا۔

”وہ اس آس کو میرے بچپن میں سال محبت کی آگ میں جھنسنے کے لئے نہیں لے گئی۔“

اور اس کے میں منٹ بعد اس کی کار اچکے بیٹھے میں

داہن چور ہی تھی۔ زیر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے ایک ملازم سے اہل کے کمرے کا پتہ پوچھا اور پھر سیٹی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس وقت سفید ساڑھی پہنتے ہوئی تھی۔ مگر آج اس کے بال پریشانی نہیں تھے اور نہ اہل کے ہاتھ میں کوئی گلاب کا پھول تھا۔ زمانہ ایک رُخ صدی سے آگے نکل گیا تھا۔ آس نے ایک بیالیس منٹ میں طے کر چکی تھی اور اہل بھی چھالیس سال کا ہو چکا تھا مگر آس کو وہ آج بھی پیسے جیسا اہل نظر آ رہا تھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں آپ کے شاذیہ اور زیر کے سلسلے میں بات کرنے آئی ہوں؟“ اس نے ٹوٹے ہوئے کہا۔

اہل نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”آسیدہ! تم نے بڑے انقلاب کیجھا؟“ وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مستے ہوئے بولا۔ ”تقدیر نے آج تمہیں اس جگہ بیٹھا دیا ہے جہاں کبھی میں کھڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے دست سوال دراز کرنے سے پہلے تم نے ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیا ہوتا۔ تو تمہیں خود اپنے سوال کا جواب مل جاتا؟“

آسیدہ لرزہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔ ”آپ نے مجھے کبھی کبھی مکان نہیں کیا اہل؟“ وہ گلو گراواڑ میں بولی۔ ”مگر یقین کیجئے آپ جس آسیدہ کو جانتے تھے وہ اسی دن مر گئی تھی جس دن آپ اس کے گھر سے رخصت ہوئے تھے۔ اور آج آسیدہ آج آپ کے سامنے کھڑی ہے وہ کسی کو کھونے کے بعد سکون کا ایک لمحہ نہیں گزرا سکی ہے۔ آسیدہ اہل کی نادان تھی۔ اس نے جھوٹ کہا تھا کہ وہ آپ سے نفرت کرتی ہے۔ وہ تو اسی دن سے آپ کو جانتی تھی جس دن آپ نے پہلی مرتبہ اس کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ وہ تو آپ کے جانے کے بعد ہی سال تک آپ کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ مگر آپ نہیں آئے۔ ایک نادانی کی اتنی بڑی منزل تو آپ کو نہیں دینا چاہیے تھی پھر اسے تو تقدیر نے بھی ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔۔۔۔۔“

آسیدہ کہتے کہتے لگ گئی۔ کچھ سنبھلی الجھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بہر حال میں یہاں آپ کے سامنے پناہ کا دروازہ نہیں کئی آپ بینک مجھے جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں۔ مگر میں اپنے لئے نہیں اپنی شاذیہ کے لئے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ وہ معصوم ہے اہل اسے اپنے زیر کی داہن بناؤ۔ وہ اس سے محبت کرتی ہے؟“

”محبت؟“ اہل نے ایک ہچکا تھم لگایا۔ ”خود تمہارے

اپنے الفاظ میں محبت ایک گواہ ہے۔ اس نام کی کوئی شے دنیا میں
موجود نہیں ہے۔
”خدا کے لئے اہل“ آسید نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔
”طنز کے زیرِ چوہر چلاؤ میرا دل پہلے ہی چلتی ہو چکا ہے۔ بیشک
کبھی یہ الفاظ میں نے کہے تھے لیکن اب اپنی بیٹی شاذیہ کی بات کر رہی ہوں۔
”وہ بھی تو بہارا ہی خون ہے آسید۔ زیر اس سے وفا کی
امید کیسے کر سکتا ہے“ اہل نے کہا۔ البتہ مجھے یہ جیت ضرور ہے کہ تم اپنی
بیٹی کو اتنی مختلف تعلیم و تربیت کیسے دے سکیں۔ تم نے اُسے یہ کیوں نہیں
بتایا کہ محبت محض گواہ ہوتی ہے اور لوگ اُسے صرف اپنی ہوس یا مہم
پورا کرنے کے لئے اختیار کیا کرتے ہیں۔ تم نے اپنی طرح اسے کالج کے ہر
لڑکے سے فرط کرنے کا سبق کیوں نہیں سکھایا۔ جو راستہ تم نے اپنے لئے
پسند کیا تھا اس پر بیٹی کو چلنے سے کیوں روک دیا۔
”کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ میں نے اپنی غلطی کو محسوس
کر لیا تھا۔“
”ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی تربیت میں دیگر حصہ
کا حصہ زیادہ ہو۔“
”یونہی امی مگر وہ آپ کو پسند تو ہے۔“
”ہاں شاذیہ اچھی لڑکی ہے لگھو تمہاری بیٹی نہ ہوتی تو میں
بڑی خوشی اُسے اپنی ہوتا کہ اس کو گھریں لانا۔“
”تو آپ میری غلطی کی منہ مری بیٹی کو دینا چاہتے ہیں۔“
”یہ ہی سمجھو۔“ اہل نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے
جواب دیا۔
”کیا اب کوئی صورت ایسی ممکن نہیں کہ آپ اپنا فیصلہ
تبدیل کر سکیں۔“
”نہیں۔“
”آپ کبھی اتنے سنگدل تو نہیں تھے۔ آسید نے آہستہ
سہ کہا اور پھر انتہائی بااؤسی کے عالم میں سر ہٹا کر واپس دروازے
کی طرف چلی۔ لیکن ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اُس نے شاذیہ اور
ذیر کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔
”شاذیہ! وہ جہیز سے بولی۔ تم یہاں کیوں آئیں بیٹی۔
اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔“
”زیر لے کر آئے ہیں“ شاذیہ نے بتایا۔ ”کہہ رہے تھے کہ

انکل نے بلایا ہے۔ آسید نے بیٹی کے اہل کی طرف گھومی۔
”آپ بتاتے ہیں جیسے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“
اُس نے بڑی کرکے ساتھ کہا۔ ”کیا کیا مان کو ذلیل کر کے آپ کے انتقام
کی تسکین نہیں ہوتی تھی کہ اب اُس کی بیٹی کو کسی تماشانا چاہتے ہیں۔“
”انتقام کی تسکین تو ہر جگہ ملتی آسید بیگم۔ خلاف توقع اہل
مسکرا رہے تھے۔ ”لیکن جیت کا تقاضا پورا نہیں ہوا تھا۔ افسوس صرف
یہ ہے کہ شاذیہ نے فون کرنے میں بہت دیر کر دی۔ ورنہ میں کلیفٹ
کرنے کی ضرورت نہ ہوتی میں خود آجاتا۔“
”میں..... میں کچھ بھی نہیں۔“ آسید نے جھپٹے ہوئے
چہرے پر جب تعب تھا تو ایک ایک بچہ کیس ایک دوسرے
ساتھ کھرا کر دیکھ کر اُسے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے اپنی غلطیوں سے کوئی
سبق نہ سیکھا ہے یا نہیں۔ بلکہ اس روز تمہارا طرز عمل دیکھ کر ظاہر ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ تم آج بھی بوجھ بات کرنے کی روادار نہیں ہو۔ لیکن جب
ذیر نے مجھے تمہاری بیماری کے بارے میں بتایا تو میں ہی سکول
میں خیال پیدا ہوا کہ یہ تمہاری پشامی کا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔ اس
خیال کی تصدیق کے لئے میں نے یہ شرط عائد کی تھی کہ شاذیہ کی
بات طے کرنے کے لئے خود تمہیں یہ سکر اس آنا چاہیے۔ یہ اتنی کڑی
شرط تھی جو کسی مغرور آسید کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی جب
وقت شاذیہ نے فون پر بتایا کہ تم یہاں آنے کے لئے گھر سے چل دی ہو
تو میں نے جان لیا کہ چونکہ میری محبت نہیں کر سکتی تھی اُسے بیٹی کی محبت سے
روکھ لیا ہے اور اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ذیر کو اپنا
بیٹا بنا لو۔“
آسید کی آنکھوں میں سرسکے آنسو اُمڈ آئے۔ اُس
نے بے اختیار اس کے بڑھ کر زہرا اور شاذیہ دونوں کو اپنے سینے سے لگایا۔
ذیر اور شاذیہ بہت خوش تھے چہرے پر جوش مسرت سے
تمہارے تھے اور آنکھیں مستقبل کی رنگیں ساعتوں کے تقو سے جھک
رہی تھیں۔ انھوں نے اہل اور آسید کو جھک کر سلام کیا اور دعا میں
سمیٹ کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے کہے سے ہر پہلے گئے۔
آسید نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے اہل کی طرف دیکھا۔
”اگر آپ دل میں یہ بات طے کر چکے تھے تو پھر اتنی دیر تک
مجھے پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔
”میں پرکھ رہا تھا کہ جس چیز کو سونا سمجھ رہا ہوں وہ کہیں

”ان اسامی کے تحت چڑھا یا ہوا ملے تو نہیں ہے۔“
”پھر آپ کیسے کیا پرکھا سونا یا ملے۔“
”معلوم نہیں۔“ اہل کو کی پر رکھے ہوئے گلہان کی طرف
”اب مجھے اپنی پرکھ پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔“
”اور اپنی محبت پر۔“ آسید نے سر جھکا کر پوچھا۔
”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں یہاں تک شاذیہ کی محبت
پہنچ کر آئی ہے۔“
”گو اب مجھے کے معاملے میں جتنے نا سمجھ آپ پہلے تھے اتنے ہی
اب بھی ہیں۔ آسید نے روبرو مسکرائی۔
اہل نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے بجائے انھوں نے
ش سے آگے بڑھ کر — گلہان سے توڑا ہوا پتھول آسید کے
پاس میں لگا دیا۔

”آج آپ نے پتھول لگانے سے پہلے اجازت نہیں لی۔ آسید
کی مسکراہٹ میں شوخی کی جھلک نمایاں تھی۔
”میں نے اپنی سمجھ داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔“ اہل کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ ہنس اُٹھی۔
آسید نے ہاتھ اٹھا کر جوڑے میں لگا ہوا پتھول نکال دیا۔
”یہ کیا کر رہی ہو۔“ اہل نے چونک کر پوچھا۔
”گھر آئے نہیں۔ آج میں نے فوج کر نہیں پھینکوں گی۔“
”تو پھر۔“
”اور جواب میں آسید نے جھک کر وہ پتھول اہل کے قدموں
پر رکھ دیا۔ کوٹھی کے باہر لان میں شاذیہ اور ذیر قہقہے لگاتے ہوئے
ایک دوسرے کو پکڑنے کے لئے جھاگ رہے تھے۔

رہزنا دور کرنے کی



خاص ترکیب

تین چوتھا ہیال میرا ہے۔ ایک ہر حال ہیال میرا ہی۔
اور خوب سنت آنا گو نہ دھیں۔ اب اس گدھے ہوئے آئے
کو دانت میرا ہی ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ جھک کر یا تھوڑا
تھوڑا کر کے چہرے پر لٹائیں اور انھیں سے مروڑ لیں
آواز دہیں۔ رواں ٹوٹ کر آئے ہیں پٹ کر اتر جاتے گا۔ یہ
خیال ہے کہ چہرے پر آٹا لٹے وقت ہاتھ صرف پیچھے اُدھر کی
طرف نہیں گردن یا تھوڑی سی پیچھے آٹا لٹے وقت ہاتھ اُدھر کی طرف
سے پیچھے یعنی سینے کی طرف لائیں۔ گردن کی طرف سے تھوڑی سی طرف
نہلے کر جائیں۔ ان باتوں کا خیال عام کر کے لٹے وقت بھی رکھیں۔
آٹے کا ٹیٹل بھی دن تک روڑ نہ کریں۔ تمام رواں ایک ہی
دن دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تھوڑا تھوڑا رواں روڑنا
آٹے کی مروڑیوں کے دور کرنے کے ساتھ دور ہوتا ہے گا۔
تھوڑے ہی عرصے میں تمام رواں ختم ہو جائے گا۔ باقی بچا ہوا آٹا
آپ باہول پر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ چہرے پر آٹے کا مکمل تھال
آپ کی جلد کو بھی نکھار دے گا، جو کچھ بھی آٹا چہرے کی جلد کیلئے
نبہت مفید ہے۔ استعمال سے ایک دن پہلے آٹا توندنا
ضروری ہے۔ یہی خیال رکھیں کہ اگر آٹا توند ہو تو رواں نہیں رہے
گا اور آٹا تھوڑی ہی دن چپک جائے گا۔



دوسری قسط

بشری رحمان

نانشے کی میز پر طرح طرح کے لوازمات پڑے تھے۔ نانشہ نہیں بلکہ کچی خاصی دعوت لگے ہی تھی اور بیگم ابراہیم اپنی شہر سے سماوی خاطر ملازمت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ باتوں کے دوران وہ حماد سے امر لڑی کرتی جاتیں کہ بیٹا یہ کھاؤ۔ وہ کچر۔ اسے تم تو بالکل کچے نہیں کھاتے میں کبھی کبھی آجکل کی ٹھوڑی لڑکیاں ہی ڈانٹا کرتی ہیں۔ تم تو ان سے بھی کچھ ہاتھ آگے ہو۔

حماد ایک عجیب سا لڑکا ہونے کے ساتھ بخیر پڑی سی دھن سے کچھ لیتا جس کی طرف بیگم ابراہیم اشارہ کرتیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اس نے ایک عرصہ سے نانشے کی عادت ہی ختم کر ڈالی تھی۔ صرف دو چار چائے کی کڑی پیالیوں پر ہی گزارا کرتا تھا۔ آج اپنی فوائض میں یوں بکھری بیڑ دیکھ کر اسے عجیب طرح کی الجھن اور کوف ہو رہی تھی۔ الجھن اس لئے کہ نانشے کے لوازمات میں اکثر اشیاء کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ بہر ایک آدمی کے لئے اتنا اہتمام کرنا اسے اچھا لگا۔ آخر ایک اکیلے آدمی کے پیٹ میں کیا کچھ سا سکتا ہے۔

اور کوف اس لئے ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ پیسوں کا ضیاع ہوا۔ گھر کے اقتصادی حالات سے اسلین نے اٹے آگاہ کر دیا تھا۔ اور اپنی ماں کی شاہ خرچیوں اور روایات کو برقرار رکھنے کے جنون کی داستانیں بھی سنائی تھیں۔۔۔۔۔ اسی لئے وہ خاموش بیٹھا تھا۔ کھانے سے انکار کر کے اپنی

اور خراب نہیں کرنی چاہتا تھا۔ کیونکہ بیگم ابراہیم اپنے ملنے بحث و جرح کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ یہ بات تو حماد کے علم میں بھی نہ تھی۔ صبح و فتر جاتے چھٹے اسلین اپنی ماں کو حماد کے خاندان کے متعلق سب کچھ بتا کر گیا تھا۔ بلکہ اسے مارا مار کر ہی بتا گیا تھا۔ تاکہ اس کی ماں کو حماد کے یہاں رہنے پر اعتراض نہ ہو۔ کیونکہ صاحب حیثیت لوگوں سے بننے اور ان کے ساتھ ملاقات رکھنے کی وہ بڑی شائق تھیں۔

ان کا خیال تھا کہ ایسے لوگوں سے ملنے بہنے سے اپنا STATUS (سٹیٹس) بھی اونچا ہو جاتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں اترتی رہتی ہے۔ پھر جہاں لڑکے لڑکیاں جوان ہوں۔ وہاں اور بھی فائدہ رہتا ہے۔

اپنے اسی نظریے کے تحت ہی انھوں نے بڑی لڑکی سیکینہ بیٹے امیر گھر لے میں بیاہی تھی۔ اور اب انھیں اس کے کہیں اٹک جانے اور اس میں گھر لگنے۔



اسی لئے جب کسی ایسی سرکاری ملازمت والا یا امیر خاندان کا لڑکا ان سے متعارف کرایا جائے تو پہلی ملاقات میں ہی وہ کچھ سمجھ جاتیں۔

اور ——— حماد کے خاندان کا قصیدہ پڑھنے کے بعد اسٹیشن لے ڈنٹے ڈنٹے کہا تھا۔
 "امی — میرا یہ دوست فی الحال میں سب سے گاہ۔ جب تک اسے کوئی مناسب گھر نہیں مل جاتا۔ میں تو وہ اچھے سے اچھے ہوٹل میں بھی رہ سکتا ہوں۔ مگر میں اسے زبردستی اپنے گھر میں لے آیا ہوں۔"
 "بہت عقلمندی کی گئی ہے۔ بلکہ دوستی کا حق ادا کیا تم نے۔ میں جانتی ہوں اچھے دوستوں پر کئے ہوئے احسان ضائع نہیں جاتے۔" انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا۔

"اور ہاں — پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔" کیا کام کرتا ہے۔ تمہارا یہ دوست —؟
 "امی — وہ ——— اسٹیشن ڈراما سار کا۔ پھر اس نے کچھ بولے ہیں ہی مافیت جانی کیونکہ یہاں وہ کرچیاں نہ جاسکتی تھی۔

"امی، حماد اخبار کے ایک دفتر میں ملازم ہے۔"
 "خبر کے دفتر میں ———؟ اور تم کتنے بولتے ہوئے باپ کا بیٹا ہے۔" بیگم براہیم نے ماتھے پر ہل ڈال کر خفا سے پوچھا۔
 "جی امی — ہے تو مجھے باپ کا بیٹا ہی — مگر اس کا باپ سرکاری ملازمت کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنا ایک اخبار نکالنا چاہتا ہے۔ اس لئے فی الحال اسے ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے یہاں لاہور میں ایک بہت بڑے اخبار کے دفتر میں ملازم کر دیا ہے۔ پھر مزید ٹریننگ کے لئے اسے یورپ بھیجے گا۔"

یہ کہانی اسٹیشن کی ڈانٹنے ڈھنڈے کھڑے گھر کی تھی۔ درزا اس کی ماں ابھی اسے باہر نکالنے کا نوبت صادر کر رہی تھی۔
 "مگر اس کی خواہش تو بہت بخیر ہوگی۔" بیگم براہیم نے براہ راست منہ دیا۔ "یہ گڑا دیکھ کر کتا ہوگا۔"
 "واہ امی ——— اسے بیویوں کی کیا پروا ہے۔ اس کا باپ اسے براہ راست کٹر قریبی دیتا ہے۔ جس پر اس کے کسی دوست ہل ہے میں۔ مگر ذرا فہم بول کر دیکھو۔ وہ اپنے اور فطرتاً درویش ہے۔ اپنی پوزیشن بنا کر نہیں رکھتا۔"
 "خیر..... خیر....." بیگم براہیم سنبھل گئیں۔ "مجھے اس سے کیا غرض۔؟ تمہارا دوست ہے۔ کچھ دن کے لئے آیا ہے۔ آخر چلا جائے گا۔"

"اور امی — اسٹیشن کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے ذرا خاطر تواضع۔"
 "ہاں ہاں — مجھے معلوم ہے۔ تم کو نہ کرو۔ کن کو نہیں بھی اس سے کوئی کام نہ پاسکتا ہے۔ میں کوئی گھر چھوڑوں گی۔"
 اسٹیشن اپنی ان کی عمارت سے راقبت تھا۔ ان کی برات اور حرکت میں ذاتی غرض شامل ہوتی تھی۔ وہ تو بغرض عبادت کی بھی قابل زمینیں نمازیں اور نکالت بھی انہی دنوں شدت سے بڑھتی ہیں جب انہیں کوئی آمد ضرورت آتی۔ مراد اگر کوئی براتی تو وہ نمازیں اور وظیفہ فوراً چھوڑ کر تیس مطلب برادری اور بلدیہ کی رسم کو وہ موجودہ دور کی سب سے بڑی "ضرورت" سمجھتی تھیں۔ ذاتی اغراض سے بالاتر، دوستی، رشتہ داری یا تعلقات کو وہ محض حالت اور قطعیت تھیں اس لئے ان کے سوچنے کے انداز کو بدلتا 10 اسٹیشن کے بس کی بات نہیں تھی۔
 اور اس کو کچھ سات بجے آئین پر پہنچا تھا اس لئے وہ جلد ہی گھر سے نکل گیا۔ انہوں نے اسے نظر سے نہیں آئی تھی ورنہ وہ اسے بھی کچھ ہدایات دیتا۔

تاہم بیگم براہیم نے حماد کے اسٹیشن تک آتے آتے ان کا انتظام کر لیا تھا کہ حماد بھی میز پر افواغ و انعام کی چیزیں دیکھ کر پیشاب آتا تھا۔ ذہنی طور پر وہ بھی نکالتا تھا کہ اس کی ہی دھما اور پھر جہاں قیام کرنا ہو وہاں گھر کو فضا ہونی چاہیے۔ گھر والے اگر غرض ضروری تو امتحان کا وہجہ جہاں کے ذہن پر چلتے چلے جاتیں۔ تو جہاں کو خواہ مخواہ شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ حماد کو بھی اسی قسم کی الجھن کا سامنا تھا۔ اور سب کچھ کھانا پکڑا تھا۔ اسٹیشن کا ٹکٹوں کا محل نظر تھا۔ ورنہ وہ اس وقت بھی اپنی صاف گوئی پر اترتا تھا۔

چنانچہ جس قدر اس کے پیٹ میں سانس تھا، اس نے کھایا اور سعادت مندی سے بیگم براہیم کی باتیں ہاں ملاتا رہا۔
 "اے — یہ آدھی صبح سے کہاں ہے؟ ابھی تک اس نے ناشہ بھی نہیں کیا۔" انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔
 حاشہ بھی ان کی تقلید میں سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا مگر اس بات کے جواب میں تو اسے بہر حال خاموش رہنا تھا۔ اور وہ کہتا بھی کیا۔
 "آج صبح ہی صبح..... میں نے اس کے دل کے چھوٹے چھوٹے مار غریب خلوص سے چیر دیئے ہیں یا۔"
 ایک پرسکون سوئی سوئی لڑکی کو اب حیات چکر کر چکا رہا ہے.....
 مٹا حاد کو صبح کے لمحات بے طرح یاد آ گئے..... اور اس لڑکی کو دیکھنے کو دل چلنے لگا۔
 "اے کوئی ہے..... چچی تو ہی جا بیٹا اور منوں آپا کو اگلے کمرے سے بلا لا۔" بیگم براہیم نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا۔
 اور پھر واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"یہ لڑکی بھی عجیب مزاج کی لاک ہے۔ دنیا کی کوئی شے اسے پسند نہیں آتی۔ ہر بات میں ان کا چڑھتا ہے۔ کھانے پینے میں دلچسپی نہیں لیتی۔" انہوں نے کرتوتی ہے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی۔ اس کا کیا ہے گا؟"

"جی ہاں ———" حماد سکڑا۔ اس عمر میں عام طور پر لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں؟
 "نہیں جی! یہ تو خروشا ہے ہی اور طرح کی ہے۔" بیگم براہیم نے اپنی اسی شان بے نیازی سے پھر کہنا شروع کیا "میری بیٹی! کہ تو بالکل ایسی نہیں تھی۔ شروع ہی سے ہر ایک کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی عادت تھی۔ دوشم میں کبھی کو گرویدہ بنالیتی تھی اور پھر قسمت کی "وہی منی نکلی!"

"جی ———؟" حماد نے سوالیہ نظر سے اٹھائیں۔
 "ماشا اللہ بہت بڑا گھرنا ملا ہے اسے۔" بیگم براہیم کے چہرے پر خوشیوں کا نور جھلک پڑا۔ "کسی شے کی کمی نہیں۔ لوگوں میں کہلاتی ہے۔ چنگ پر بیٹھے پرچر مٹی ہے اسے۔"
 حماد کا دل چاہا وہ ان سے پوچھے۔
 "کیا وہ اپنا بیٹے؟" مگر اس نے سنبھل کر کہا "کہاں ہوئی ہے ان کی شادی؟"
 "بہیں۔" بھی گلبرگ میں رہتی ہے میری سکنہ! محل ناکو شعی ان کی اپنی ہے۔ یہ لڑا مادا اپنا کاروبار کرتا ہے۔ ماشا اللہ! اپنے بیٹے میں میری بیٹی کے؟

بیگم براہیم اس بات سے خوش ہو رہی تھیں کہ حماد ان کی گفتگو میں ذہن تو لپسی لے رہا ہے، بلکہ آخر بھی جو رہا ہے۔
 "بڑی خوشی کی بات ہے خالہ جان!" اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "لڑکی اپنے گھر میں آسودہ ہو تو والدین دوری کا گھول جاتے ہیں؟"

"اجی! وہ تو سینکڑوں کو کھلا سکتی ہے اس وقت۔" بس سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ہے ہی قسمت کی دھنی۔ اور پھر ملنے کے حالات کو جانتی بھی ہے۔ اس کو احساس ہے کہ فی زمانہ جس کے پاس دولت نہیں، وہ کچھ بھی نہیں۔" انھوں نے براہ راست منہ دیا۔
 "اور یہ میری بیٹی امی ——— یہ تو کسی منہ کی بیٹی تھی ہے۔" ہاں ——— اس کا مزاج اپنے باپ پر گرا ہے۔
 "اے بیٹے زارے سے کہا۔" وہ بھی ہمیشہ کہتے تھے انسان کو پرکھنے کا یہاں نہ دولت نہیں اس کا کردار اور اس کا ظرف ہے۔ اور وہ بھی ہر وہ فائدہ ان میں ساتوں غیب نظر آتے ہیں۔"

حماد حیران ہو کر آخر ساری کھانے کھانے سے مطلب ———؟ مگر وہ چپکا بیٹھا رہا۔ اگر اسے اسٹیشن نے اپنی ماں کے اسٹیشن کناسے سے سب کچھ نہ بتا دیا ہوتا تو وہ ان کی پہلی گفتگو سننے کے بعد رو کر ہو گیا ہوتا۔
 "خدا کا دعائیں اس لڑکی کا کیا ہے؟ اس کی قسمت میں چائے کیا کھلا ہے؟" بیگم براہیم نے معذرتی تردید سے کہا۔
 "آپ کو وہ ہم کیوں ہو گیا ہے کہ اس کی قسمت ابھی نہیں ہوگی۔ یہ تو بے خدا کے اختیار ہے اور ہو سکتا ہے آپ کی بھی بیٹی آپ کے ہاتھ میں قسمت والی ہو۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے بیٹا۔ مجھے تو اس کی عادتوں سے خوف آتا ہے۔ اور کسی کو خاطر میں بھی تو نہیں لاتی؟" ابھی حماد اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ اُس نے دیکھا بھی آئندہ کا بازو پچھلے اُسے گھیسے لارہا ہے۔ اُس کو تاؤ دکھ کر حماد چائے کی پیالی بنانے میں مشغول ہو گیا۔

آئندہ قریب آئی تو اُس کا چہرہ مولے سے زیادہ بخیر تھا۔ اُس کی آنکھیں سوچ کر سرخ ہو گئی تھیں اور ناک بھی لال ہو رہی تھی۔ جیسے وہ خاما رو کوئی ہو۔

ان سب باتوں کے باوجود اُس کے چہرے پر ایک سوز اور ایک گھٹکتی تھی۔

حماد نے جب سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ اس کی نظروں کی راشے۔ اُس کے دل میں اُترتی چلی گئی اور وہ اُس کے خوبصورت چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا۔

وہ چہرہ جو اُس کے ہر خواب کی حقیقت افزا تویر تھا جیسے بارش کے بعد موسم نکھر جاتا ہے۔ ایسے ہی دل کا غبار نکال دینے سے اس کا صلیح چہرہ نکھر گیا تھا۔ بہا کے اس پہلے پھول کی مانند جس کا منہ ساری رات شہنشاہ کے موتی دھنستے رہے ہوں۔ اور موتی کی پہلی کرن نے اُس کے مصمم جلیوؤں کو جگا دیا ہو۔ حماد جانتا تھا۔ وہ روئی ہوگی۔ وہ ضرور روئی ہوگی۔ ایسی حساس اور پاکیزہ لوکیاں۔ ذرا سی ٹھنسی سے دکھ جاتی ہیں۔ کبھی تو اپنے خوابوں کو مینا پاکر اُن پر چہان طاری ہو جاتا ہے۔

یہ اپنی ساری زندگی ایک خوبصورت آس اور ایک طویل انتظار کے دامن کو تمام کر گزار لیتی ہیں۔ اُمید کی روشنی اُن کا واحد سہارا ہوتی ہے۔ گرجب اپنی منزل کو دو چار قدم پر دیکھ لیتی ہیں۔ تو انہیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ یا اپنے گمان کو یقین میں بدلے جھٹے ڈرتی ہیں۔ اپنی خوش قسمتی میں اپنے دل کو شریک نہیں کر سکتیں۔ اس سے پہلے پٹ کر اسے مبارکباد دینے کی بجائے اسے توہمات کے حوالے کر دیتی ہیں۔

اور خود پلکوں کی چوٹھٹ واکر کے آنسو بہانے پر اکتفا کرتی ہیں آنسو۔ جو ہر قسم کے جذبات کو دم مہم کر دیتے ہیں۔ راہیں کھول دیتے ہیں۔ غبار نکال دیتے ہیں۔ ہائے۔ یہ مصوم لوکیاں ۹۹ ان کی تنہا پوری نہیں ہوتی تو روئی ہیں۔

تمنا برکتے تو بھی روئی ہیں۔ ان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اُن کے اختیار میں صرف آنسو ہیں۔ یہ تو اپنے جنم دن سے ہی دوسروں کی دست نگر ہوتی ہیں۔ یہ تو اپنی قسمت کا فیصلہ بھی خود نہیں کر سکتیں۔ ان کے ذہنوں میں بس چور دروازے ہوتے ہیں۔ ان چور دروازوں کے رستے پر اپنے من کی دنیا بسا لیتی ہیں۔ اور پھر بقایا زندگی ان چور دروازوں سے آنکھ چولی کھیلتی رہتی ہیں۔ ان کی زندگی سب سے پہلے بند ایک موتی ہوتی ہے۔ جو اکثر غلط باتوں میں چلا جاتا ہے۔

یہ تو محض خواب دیکھنے کو پیدا ہوتی ہیں۔ کہانیاں بنانے کو پیدا ہوتی ہیں۔ کہانیاں بن جانے کو پیدا ہوتی ہیں۔ اُن کو منزل کے مل جانے کا بھی اتنا ہی غم ہوتا ہے جتنا منزل کے پھر جانے کا۔ اور ایسے وقتوں میں یہ روئی ہیں۔ جب ان کو مسکرایا چاہیے۔

خوشی کا خیر مقدم بھی آنسوؤں سے کیوں ہو؟ میری شہزادی! مجھے دیکھ کر مت رو۔ میں تجھے رلائے نہیں ہنسائے آیا ہوں۔ میں غلامی کے یہ طریق تیری گردن کا تار پھینکوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔

اختیار کرو مجھ پر..... ایک لائیں جاؤں گا یہاں سے۔

ہاں۔ چچا ہلاتے جھٹے اتنی ڈھیر ساری باتیں سوچ کر حماد نے جب نظر اٹھا ئی تو اُسی وقت آئندہ نے بھی اپنی لالہ کوئی نظر اٹھا کر پہلی مرتبہ حماد کی جانب دیکھا۔ اُس کی ڈری ڈری، اکتا کرتی ہوئی نظر جب حماد کی پر یقین اور ناک نظر سے ٹکرائی۔ اُن کا دل کچا کٹھا۔

ایک ٹانے کے اس تصادم میں حماد نے اس کو صاف کہہ دیا "اکیلا نہیں جاؤں گا یہاں سے۔" "تہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔" "مجھ پر بھروسہ رکھو!" اور آئندہ نے اُس کی خدا عطا دی کے آگے پھٹکتے ہوئے جیسے اپنا متقبل اس کے حوالے کر دیا وہ برلے نام سنا شکر کرنے میں مشغول ہو گئی۔ "پھر ہو گیا، تہیں زکام۔" بیگم ابراہیم نے اس کی روئی روئی آنکھوں اور سرخ ناک کو دیکھ کر کہا۔ "اپنی جہت سے زیادہ کام کیوں کرتی ہو؟ صبح سے اٹھ کر سردی میں جانے کیا کچھ کرتی پھر رہی ہو۔ مجھے یقین تھا تہیں کچھ ہونے لگا۔" ابراہیم خود کو بیار۔

پھر انھوں نے حماد کی طرف دیکھ کر کہا "کام کرنے کی اس لڑکی کو بالکل عادت نہیں ہے۔ جب بھی ضد کر کے کام کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا یہی ستر ہوتا ہے۔" ایک سوگوار سائیم لیون پر لیکر آئندہ نے اپنی ماں کی دوسرا کوئی پر معذرت طلب نظروں سے حماد کی جانب دیکھا۔ حماد بنیدگی سے ابراہیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر اُس نے اس چور کچھ کی پیش محسوس کر لی تھی۔ اس کا اندازہ آئندہ کو بھی ہو گیا تھا۔ "میں تو ابھی پہلی ہوں امی۔" آئندہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یوہی ذرا۔" "ہاں یہ تیری ذرا بہتر پریشان کیا کرتی ہے۔" بیگم ابراہیم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرانی کر کے ابھی درانی کھا کے بستر میں لیٹ جاؤ۔ زبان تیار ہو گئیں تو بنیالی نہ جاؤ گی۔" "بہار تو میں بالکل نہیں ہوں۔" آئندہ نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر آہستہ سے کہا۔ "اور ابھی بھی آپ بالکل نہیں ہیں۔" حماد نے اسی لمحے میں برجستہ کہا۔ آئندہ کی ٹھیکیں لرز کر رہ گئیں۔ دل دھڑک کر رہ گیا۔ اُس سے ٹھیکیں اٹھائی گئیں زکوئی جواب دیا گیا۔ اُس نے تو واقعی ایک بیماری سے عا بدہ کر لیا تھا۔

(۵)

بیگم ابراہیم ان عورتوں میں سے تھیں جو نام و نود کی خاطر اپنا گھر چھوٹ کر تاشاد بکیتی ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ کہنے کو تو وہ ایک بیوے کا رڈ کی بیوی تھیں۔ مگر ان کی باتیں سن کر یوں محسوس ہوتا گویا وہ کسی ریاست کی واکر ہیں۔ اہمکات کو اپنی گفت گو میں جگہ دیتے ہیں وہ ذرا نہیں جھجکتی تھیں۔ اور بعد از قیاس شہیاں بگھاتے جھٹے انھیں ذرا خرم نہیں آتی تھی۔ وہ بچاری جانے لگے احساں کسری کی ماری ہوئی تھیں۔ کہ اُن کے پیش نظر ہمیشہ اپنی ذات رہتی۔ اور وہ ساری دنیا کا اس ذات

یہ روز دیکھنا عین حیات سمجھتی تھیں۔ اور بد قسمتی سے جو اس کے برعکس تھا۔ بلکہ ان کی خاص ان خاص میلیاں بھی بیٹھ چکے تھیں ان کی منہی اڑاٹی تھیں۔ اما ہم صاحبہ سے ہی مدبر و متعن مزاج اور عشا راوی تھے۔ نیاز مندی میں ان کو کوٹ کوٹ کر بھیڑی ہوئی تھی۔ علم و ادب کے ریاہٹے مگر درجہ کار کی خاطر انھوں نے ہر دوسے کا درجہ بنا بھی قبول کر لیا تھا۔ ساری کی ساری تنخواہ وہ اپنی بیگم کی تعجبی پر رکھ دیتے۔ وہ اس بات کے ہر فرد حامی تھے کہ جتنی چادر دیکھو۔ لیتے پاؤں پھیلاؤ۔ کبھی اگر کم سے ان کی کھٹ پھٹ ہوتی تو صرف اسی بات پر ————— جب ان کی بیگم چادر کی دست کا خیال کے بغیر اتنے پاؤں پھیلاتیں کہ ان کے پاؤں ہر کس و ناکس کو نظر نہ لگتے۔ وہ انھیں بھتہ اور زمی سے بچھا بھیجا کہ تو تک مجھے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ ان کی بیگم کو اپنی آمدنی کے حساب سے خرچ کرنا چاہیے۔ اور کبھی پس انداز کرنا چاہیے کہ کوئی دوسرے کو کٹاؤ لاوے۔ بچوں کو تعلیم دلوانے کے شائق تھے۔ وہ کہتے تھے ان کی زندگی تو حق ایک مجبوری میں داخل گئی ہے۔ کم از کم وہ اپنے بچوں کو بہتر مستقبل دے کر اس کی تلافی کر جائیں۔ اس نے وہ اپنی بیگم کی نفوس خرچیں سے ہر دم لال رہتے تھے۔

اما ہم جب بھی ذیل غفلتوں میں انہیں تہیہ کرنے کو — ”بیگم تہاے اپنے چہ پنجے ہیں۔ پہلے انہیں تو تمام سوئیں ہیا کرو۔“

میں بیگم کو اتنی سی بات پر کراگ لگ جاتی۔

دونوں ابراہیم دائم المریض نظر آتے تھے۔

جائے وہ حادثہ ان کی ذہنی پریشانی کے باعث ہوا یا تقدیر میں یوں رقم تھا۔

تاہم ان کے انتقال کے بعد پراویڈنٹ فنڈ اور گزٹو جی کی اتنی رقم ضرور مل گئی تھی جس سے قرض ادا کر دیا گیا تھا۔ گویا مگر بھی ابراہیم خاندان پر ایک احسان کر گئے تھے اور اپنی تہمت زدہ داریاں سکون پسند اسمبلی کے کاندھوں پر ڈال گئے تھے۔

اسمبلی ان کا سب سے بڑا شین تھا۔ باپ کا عکس ——— زمرہ شکل و صورت میں بلکہ عادات و اطوار میں بھی ——— وہی کم گوئی ——— وہی تمقل مزاجی ——— وہی خساری ——— سوچ سمجھ میں توازن ——— فتنویا سے کنارہ کشی ——— ہمیشہ مستقبل پر نظر ———

وہ بھی اپنی ماں کی فتنوں خرچوں سے پریشان چٹھتا۔ مگر وہ کچھ کہتا نہیں تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے اُسے کچھ کہنے کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ اس صورت میں جبکہ وہ خود ان کے رحم و کرم پر بڑھتا تھا۔

جب ابراہیم کا حائلے میں انتقال ہوا تو اسمبلی ایم لے کے پہلے سال میں تھا۔ اُس کے پاپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد گھر کی زبوں حالی نے اُسے تعلیم جاری رکھنے سے روک دیا۔ اگر وہ بھی ریلوے میں ملازمت نہ کرتا تو یہ گھراؤں سے بچتا جاتا۔ اس سلسلے میں شہر میں نوکری تو جیسے ہی مل جاتی ہے لیکن اتنے بڑے کنبے کے لئے گھر تلاش کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ اُس کے والد کی خدشات کے عوض نے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی ٹی۔ ٹی کی نوکری مل گئی تھی۔ اور رہنے کو دی گھر ———

وہ بھی اپنی ساری تنخواہ ماں کی تبدیلی پر رکھ دیتا اور لڑکے کو بچپن کا کہاں اور کیسے خرچ ہوتی ہے سکینڈ اسمبلی سے دو سال چھوٹی تھی۔ سب بچوں میں بھی ایک لڑکی بیاہی ہوئی تھی۔

بگم ابراہیم اور سکینڈ ابراہیم کا خیر ایک ہی مٹی سے اٹھا تھا۔ دولت اور مرتبہ دونوں کی کمزوری تھی۔ امار کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا دونوں کو جنون تھا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے میں، جن میں کرتا جروں اور افسروں کی بیٹیوں کو سہیلیاں بناتی اور ان کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی کہ وہ بہت بڑے "لینڈ لارڈ" کی بیٹی ہے۔ محض نقش طبع کے لئے اُس کے ڈیڑی ریلوے میں ملازمت کرتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں تو ان کا محل ناگہر ہے۔ جو ڈھنڈا رہا پڑا ہے۔ چونکہ اُس کا اٹھنا بیٹھا کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ تھا اس لئے اس کے اخراجات کافی زیادہ تھے۔ وہ اچھا اور قیمتی لباس پہننے کی بہت دلدادہ تھی۔ آج کل کے زمانے میں جہاں لباس کی تخصیص ہی ختم ہو گئی ہے۔ جب تک بیش قیمت اور جاذب نظر لباس زیبنا جائے انفرادیت قائم رہ ہی نہیں سکتی۔

بگم ابراہیم اس امرات پر اُسے کبھی نہیں ٹوکتی تھیں۔ بلکہ یہ سب انہیں اس کے جائز مطالبات لگتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کسی نہ کسی طرح اسے کسی بڑی تبدیلی میں بیاہ دیں۔

اپنی بیٹی کو دولت مند گھرانے میں بیاہنے کے لئے بگم ابراہیم نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ ایک تو اُسے شہر کے بہترین کالج میں داخل کر دیا۔ پھر اُسے اپنے جتنے میں گھونے اور سوشل پارٹیوں میں شرکت کی آزادی دی اس کے علاوہ کوئی نہ کوئی مشاطہ ان سے امان نہ وصول کرتی رہتی تھی جو سننے و پڑنے میں رتیں راہوں کی تصویریں اور شجرہ ہائے نسب کے دن ان کو لا کر دکھاتی۔ لیکن دین پر بات ہوتی۔ آمد و خرچ کی ہر تہمتیں عائد کی جاتیں۔ باسے ایک نو دوجینے خاندان کو انہوں نے چھٹا ہی بیا۔ لڑکے نے تو صرف لڑائی دیکھنے کی شرٹا رکھی۔ مگر گھرانوں نے مطالبات اپنے نشانیاں پیش کئے۔

لڑکے کو لڑائی بنا سنا کر دکھائی گئی۔ اسے پسند آگئی۔

بگم ابراہیم کو تو جیسے دولت عظمیٰ مل گئی۔ یہی تو ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انہوں نے جہیز ان کے شایان شان دینے کا وعدہ کر دیا ابراہیم مرحوم نے ہم کو لاکھ بھجوا کر ہم ان کے ہم پل نہیں ہیں۔ پھر پانچ مزید بچوں کا بوجھ ہمارے سر پر ہے۔ ایک لڑکی کو دھوم دھام سے بیاہ کر ان پانچوں کا مستقبل تباہ نہ کرو۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہ کرو۔ لیکن دین پر جو جھٹے لے گئے جالتے ہیں۔ ان میں ذرا سی چوک بھی انجام کو بیاہ گیا بنا دیتی ہے۔

مگر بگم ابراہیم کو خدا نے ایک عرصہ بعد سر بلند ہونے کا موقع دیا تھا۔ ان کے سمدھی لاہور کے رئیس کہلاتے تھے۔ اگرچہ رئیس بنے ہی انہیں حمید احمد خان کا خون جھٹے تھے۔ اور کیا ——— یہ آٹھ دن کی مسافت تھوڑی سی تھی ——— بگم گھر میں ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی۔ ان کا بچنے والا ماد کی مرتبہ امر کی ہو گیا تھا۔ ایک لڑکی اور بچی جلد لگ گئی۔ تو دوسری کے لئے خود بخود کسی ذوالی خاندان کا روادا ہو جانے لگا۔ اور بگم ابراہیم اپنی برادری میں ان کی بچی رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ۔ جن لوگوں میں دم ختم نہ ہو، نہ تو وہ اپنے گھرانوں میں شہرے کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور نہ دھوم دھڑکے کے لئے دلا سکتے ہیں۔

سو دونوں ہاتھوں سے سو پر قرض لیکر وہ دھوم دھام کی شادی کی کریمیاں کی نوکری کے لئے پڑ گئے۔ بھلا ایک کارڈ اپنی بیٹی کو ایسا جبر کب دے سکتا ہے۔ وہ تو کھلے والے ابراہیم کی نیکی نفسی اور پاک طہنی کو بھی طرح جانتے تھے۔ درجہ جائے کیا ہوتا ——— لیکن اس دھوم دھام اور کروڑ کا سکینڈ کو تو فائدہ نہ ہوا۔ اس کا ہزاروں کا جہیز لیکر کسی کر دیتی کے ہاں جانا۔ بالکل ایسا تھا۔ جیسے کوئی کسی شہنشاہ کو چند چھوٹے موتی تھے میں دیدے۔

اُس کے سسرال والے اسے اجھوت ہی سمجھتے تھے۔ جب کبھی لینے دینے کی بات نکلتی وہ اُس کے میکے کی "سفید پوشی" کا طعنہ ضرور دیتے۔ اور تو اور اس کا شوہر بھی اکثر ڈھکے چھپے الفاظ میں طنز کے تیر چلا جاتا۔ حتیٰ کہ اُس کے میکے میں اگر انہیں ذلیل کر جاتا۔ مگر سکینڈ کو یہ باتیں کبھی بڑی نہ لگی تھیں۔

اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ہر وقت موتوں میں گنسی رہے۔ اور سونے کے بوجھ تلے دبی رہے۔ اس کے لئے اسے ہر گھنٹے سے گھنٹا بھر بھی منظور تھی سو وہ چپ بھی اپنے میکے آتی۔ سونے سے بوجھل آتی۔

اور جو ایک دو تھے زیور اس نے نوائے ہوتے۔ وہ بھی ساتھ لے آتی۔ اس کی ماں اس کے منت سے زیور بنانے کے شوق کا چرچا ملے ملے اور ساری برادری میں بڑے فخر سے کرتی تاکہ لوگ رشک و حسد سے جل جل مریں۔

سکینڈ کے بس دو ہی پند یہ کام تھے بچے پیدا کرنا اور نئے نئے زیور بنوانا۔ بول شہر بھر کے قیمتی کپڑوں کے اس کے پاس انار تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا شوہر صرف خود اس کے میکے جانا پند نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے بھی زیادہ دیر کے لئے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس میں وہ بچوں کو اس احساس سے بچانا چاہتا تھا کہ ان کے رشتہ دار اتنے غریب ہیں۔ اور ایسی غلط فہمی پر رہتے ہیں۔

کبھی کبھار دست و زاری کر کے سکینڈ اسے ایک آدھ دن کے لئے میکے ہی آتی تھی۔ اور پھر ریلوے کو رٹرن میں وہ دن دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔

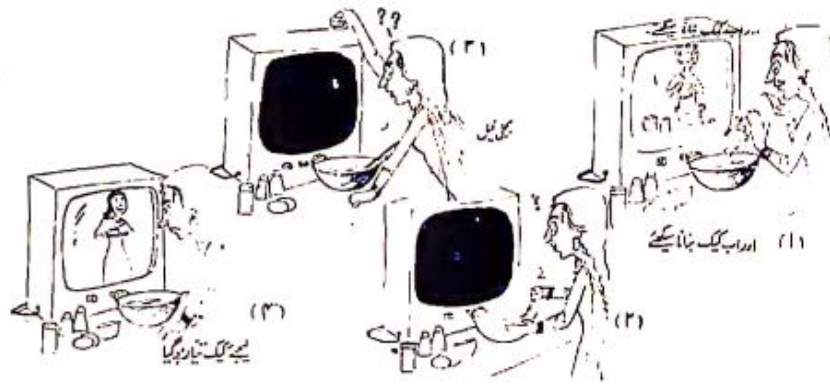
ان کے آنے سے پہلے مارے گھر کے فرش دھوئے جاتے۔ صوفوں کے خلاف اور بستر کی چادریں بدلی جاتیں یعنی ہر طریقے سے گھر کو ان کے رہنے کے قابل بنایا جاتا مگر اکھڑے ہوئے فرش اور بکدر کی سفید چادریں میں پٹا ہوا گھراس بوجھ کی مانند لگتا جس کا چہرہ کثرت آرائش کے باوجود صاف صاف کہے دیتا ہے کہ عمارت تو بیک بلی اب کھنڈرات ہی سے دل بہلاو۔

اور سکینڈ کو ہمیشہ میکے میں آتے ہی چادر اور طرف گندگی اور غلاظت نظر آتے گنتی۔ وہ بات بات میں اپنی ماں کو ٹوٹتی اور آواز کو ٹوٹتی۔ "اے اللہ لای۔ آپ کا گھر ہمیشہ ہی کتنا آگاہ ہوتا ہے۔ کبھی تو صاف رکھا کیجئے۔ تو بہ۔ تو بہ۔ اس قدر مکیتوں میں نہ جانے آپ کس طرح رہ رہی ہیں؟"

"اے بچو! اس طرف مت جانا۔" پھر وہ بچوں کے کچھے پڑ جاتی۔ اور کواڑوں میں غلط فہمی رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ چھی۔۔۔ چھی۔۔۔ زمین پر پڑ کر کچھے گندے کر رہے ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ کھیلنے کی ضرورت نہیں۔ اندسے کریمیاں لے جاؤ اور ان پر پچھ کر ان کا کھیل دیکھو۔

پھر وہ بچوں کی جان چھوڑ کر آمت کے سر پر سوار ہو جاتی۔

"آمت تو ہی نڈاس لکھ کر کا خیال رکھا۔ کہ خبر نہیں تو گھر سے بے پرواہ کیوں رہتی ہے تیری تعلیم کا کیا فائدہ ——— جب میں یہاں تھی تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ اب تو یہاں آتے ہوئے شرم آتی ہے؟ آمت ایک سو گوار سے سیم سے مل جاتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ گھر کے نقشے میں کوئی



پہلے پہل صرف اپنے گھر کے لئے اور پھر مارے ملے کے لئے
سکول سے کئی کئی دن غائب رہتا۔ رات گئے گھر آتا۔ گھر پر جس کے پیسے بھی ہاتھ لگتے اٹھا کر چپت ہو جاتا۔
بڑا کمپزہ لڑکوں کے ساتھ لڑ کر جو اٹھتا۔ اور دروازے کی بات پر آپس سے باہر ہو جاتا۔
جس وقت اس میں تباہ ہونے کے آثار پیدا ہوئے۔ اس وقت سارے گھر پر سیکینہ آپا کا راج تھا۔ اور ان کا ہر ناما تر خرچ
ہاں سڑھیا جاتا تھا کیونکہ ان کی شادی طے ہو چکی تھی۔
کوئی کی طرف کون توجہ دیتا۔

اس کی بڑی عادتوں کے طفیل اس پر لگا سارے برائے جاتے۔ ادھر وہ گھر میں داخل ہوا۔ ادھر اس پر لعنت ملا مت کا مینہ
برسنے لگا کبھی وہ چپکا ہو رہتا اور کبھی خوب ستا۔ اگلی صبح وہ گھر کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر بھاگ جاتا۔ جب لوٹ چھوٹے ہوئے زیوروں
نک جا پہنچی تو بیگم ابراہیم بوکھلا اٹھیں۔ پھلا مندری (انگوٹھی) تو وہ دل میں اٹھا کر ہوا ہو جاتا۔
پڑھائی کا یہ عالم تھا کہ چار سالوں میں وہ میٹرک بھی پاس نہیں کر سکا تھا۔ اس لئے سب نے اس کے حق میں یہ فیصلہ دے دیا
تھا کہ وہ پڑھائی نہیں سکتا۔

ابراہیم مرحوم کی زندگی میں وہ اتنا مدیدہ دلیر نہیں تھا۔ باپ سے ڈرتا تھا چوری کا اعتراف بھی کر لیتا تھا اور گھر میں سب کے
مرنے کا لحاظ کرتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنے اور اس کے درمیان چشم پوشی کا باریک سا پردہ حائل کر رکھا تھا۔ ہمیشہ محبت سے اس کی
انتہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ اور ان کی یہ بات بیگم کو بہت بڑی گنتی تھی۔
بیگم ابراہیم تو اسے دیکھتے ہی آپس سے باہر ہو جاتیں۔ اسے چھانوں کو سننے دینے لگتیں کبھی کبھار جوتا نکال کر مروت بھی کرتیں
۔ دیر سیر گھر آتا تو کسی کو اس کے کھانے کی فکر نہ ہوتی نتیجتاً وہ باورچی خانے میں گھس جاتا اور جیکوں کی مانند جو کچھ اس
کے ہاتھ لگتا۔ چُرپ کر جاتا۔

ابراہیم صاحب کی وفات کے بعد تو گھر والوں نے اس کے ساتھ نہایت غیر انسانی سلوک کرنا شروع کر دیا تھا حالانکہ باپ
لی روز ناک موت نے اسے بھی بھیج دیا تھا۔ اور اس نے جی جی میں "اچھا لڑکا" بن جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر یہ دنیا
انوں میں کہاں جھانکتی ہے؟

یہاں جس کے ماتھے پر ایک بار بڑی لائیل لگ گیا وہ سدا کو بڑا ہو گیا۔ اب جبکہ وہ سکول جانے لگ گیا تھا شوق سے
بڑھائی کرنے لگا تھا۔ مارا وقت گھر پر رہتا تو اسے تب بھی طرح طرح کے طعنے سننے پڑتے۔ جو اس کے باغی ذہن کو بچہ بگڑاؤ کے

تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی صرف سکینہ آپا کے ذہن میں آگئی تھی جھگڑک کی عمل ناک تھی اور ریلوے کو آرٹریز میں ایک طویل فاصلہ تھا اور اس فاصلے کو
پھلانگ جانا سکینہ آپا کے بس کا روگ نہیں تھا۔

آمنہ سکینہ سے آٹھ سال چھوٹی تھی۔ اس سے چھوڑا یعقوب تھا یعقوب سے چھوٹے دو اور بھائی تھے۔ عرفان اور سلمان بیگم ابراہیم کے
سامنے بچے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اور گھر کے ماحول کا اثر سب ہی نے مختلف انداز میں قبول کیا تھا۔ اسماعیل تو سامان لانے والا گھبراہٹ گیا
تخلص نے ان میں کرنی اور بوجھا اٹھائے چلتے رہا ہے اس پر سارے کہنے کا ساریاں بیکران کی مہارت تھانے منزل کی طرف رواں رہا ہی اس نے اپنی
زندگی کا فریضہ بنالیا تھا خواہ وہ دران سفر یا دل پر آئے پڑھائیں یا آئے رستے دیں۔

سکینہ انتہائی خود غرض تھی۔ اس کی اپنی ذات تھی اور اپنی ذات کو نیکوں میں سما کر وہ اس ماحول سے علی غی تھی۔

آمنہ — ۹

آمنہ کون تھی؟ اور یہاں کیوں آگئی تھی؟

وہ صاحبزادہ کوئی ہوئی تھی راستہ بھول کر یہاں آگئی تھی۔ اپنی حیران آنکھوں سے سارا تماشا دیکھتی اور ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹیں
نے سرگرم سفر راتی۔ اس کی بھٹی ہوئی بے ضرر روح کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جس وقت ابراہیم مرحوم کا انتقال ہوا آمنہ نے۔ اسے میں پڑھ رہی تھی۔ ابراہیم اپنے سب بچوں میں آمنہ اور اسماعیل کو بہت
چاہتے تھے۔ اس کا خیال تھا ان دونوں بچوں کو خوب تعلیم دواؤں گے۔ مگر ان کا یہ خواب بھی ادھوا ہی رہا کیونکہ ان کی وفات کے بعد گھر کی حالت دن
دن ویران ہوتی جا رہی تھی اسماعیل کی خواہش بھی اخراجات کو نبھانا نہ دے کی تو بی۔ ایڈ کے آمنہ نے ایک کونٹ سکول میں نوکری کر لی تھی۔

اپنی آرزوؤں کو اپنے پولیسوں پر دیکر آمنہ ایک ایسی راہ چل پڑی تھی جو اس کی منزل کو ہرگز نہیں جاتی تھی لیکن وہ اس بات کے لئے
شاک بھی نہیں کھتی۔ یہ راستہ اس نے خود منتخب کیا تھا۔ وہ گھر کی شکستہ کشتی کے سوراخوں پر بند بند بٹھ گئی تھی۔ اس کا فرض تھا اور پھر بے ہر دقت
دھڑکا لگا رہتا تھا کہیں سکینہ آپا کی مانند اس کا سودا بھی کسی نو دو بیٹے کے ہاتھوں نہ کر دیا جائے۔ اس سودے بازی سے بچنے کے لئے اس
نے اسانی بنا قبول کر لیا تھا۔

پہلے پہل اس کی ماں تملائی تھی۔ اسے خوف دلایا تھا کہ اس طرح اچھے رشتے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ ہمارے معاشرے میں ملازمت
کرنے والی لڑکی کی قیمت آدھی رہ جاتی ہے۔ نوکری کرنے والی لڑکی کو لوگ بول سمجھتے ہیں۔ جیسے گردی سے چھڑا یا ہوا مکان جو یا سو پر لگا یا بوزار پیہ۔
لیکن جب ایک بندھی گئی آمدنی گھر کی ضروری اخراجات کو نبھانا دینے کے لئے آہ بہ آہ گھر میں آئے گی۔ تو بیگم ابراہیم کا منہ آپ ہی
آپ بند ہو گیا۔

دیئے وہ اپنی عادت کے مطابق ملنے چلتے والوں سے یہی کہہ کر اپنی دھونس جاتیں۔ کہ

اس کو بھلا نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوٹا لگا دیا سب کچھ ہے میں تو بھتی بول گھر بیٹھ جاؤ۔ آرام کرو۔ مگر اب آپ سے
کیا بچانا۔ اس لڑکی کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ ان کی وفات کا غم اس نے یوں اپنی جان کو لگا یا کہ اس کی محبت خراب رہنے لگی۔ بس اس کی محبت
کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اسے نوکری کرنے کی اجازت دے دی کہ ذرا اس کا جی لگا ہے گا۔ ورنہ ہمارا ارادہ تو اسے ہم لئے کر دینے کا تھا۔
اب کوئی بچہ کبھی صحت کو ٹھیک رکھنے کا واسطہ رکھتا تھا یا نہیں ہے۔ اور کیا تفریح طے کسی اوسط طبقے سے نہیں ہے؟
اس منطق پر غور کرنا بیگم ابراہیم کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ یہ باتیں غریب آمد کو اور بھی تکلیف پہنچاتیں۔ پیہ نہ کہ اوپر پینڈو لگانا
کہاں تک جائز ہے؟

اس گھر کے ماحول کا آئینہ تو یعقوب تھا۔ وہ آمنہ سے دو برس چھوٹا تھا۔

سارے گھر نے میں بس دی ایک باغی فرد تھا۔ ذہنی طور پر اس نے اس نظام حیات کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ کسی بھول
یا گھپلے کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ابھی وہ نوکر تھا۔ اور اپنی ذہنی باغی کے باعث نہ تو اس خاندانی الجھن کو کوئی نام دے
سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس کی اصلاح کا پڑا اٹھا سکتا تھا۔ اس لئے وہ ایک بڑا لڑکا بن گیا تھا۔

بن جانے پر اساتے "عدسے بکھی" وہ اندر ہی اندر رکھو لئے لگتا کیا دنیا کی ساری پٹھکانیں میرے لئے ہی رہ گئی ہے۔
اور کچھ جس دن سینا پاپا اپنی سسرال سے گھر آجائیں۔ تو اس دن اسے بار بار رسولی پر لٹکایا جائے گا۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں
کہ سسرال میں ان کی کمائی کا باعث یہی تنگ خاندان ہو گا ہے۔

اگر اس کے طور طریقے کسی بڑے افسر یا رئیس زادوں کے سے ہوتے تو انہیں اسے اپنا بھائی کہتے ہوئے ڈرا بھی شرم نہ محسوس
ہوتی۔ ایسی ہی باتوں سے تنگ آکر۔ ایک روز وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ لیکن اس کی پرواہ کسی نے کی تھی؟
"چلا گیا ہے تو دفنان کر اس کو۔" جس کم چاں پاک۔ اس کے گھر میں رہنے سے ہمیں کوئی ساکھ تھا۔ ایسے فضول لوگوں

کو گھر کے باہر بھی کہیں گھمکانہ نہیں ملتا۔ دو چار دن خراب ہو کر۔ بے غیر قوں کی طرح خود ہی چلا آئے گا۔ خبردار جو کوئی اس کے پیچھے
گیا۔ سیکڑے آپا نے جب اتنا بڑا فتویٰ صادر کر دیا۔ تو پھر کس میں زبان لانے کی جرأت تھی۔

ہاں۔ اس گھر میں اگر کسی کو اس کی پرواہ تھی تو وہ آمنہ تھی۔ آمنہ بہروں اس کے لئے کھانا چھا کر رکھتی تھی۔ اس کو مائیکر
کا بہترین فرد بن جانے پر اس کا بھتی۔ اس پر اپنی جان بچھا کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال کرتی تھی۔ اپنی
جمع شدہ پونجی ہمیشہ اسے دے دیتی اس وعدے پر کہ وہ آمنہ چوری نہیں کرے گا۔

وہ وعدہ تو کر لیتا۔ مگر ایفانہ کر سکتا۔
اس کا دیوانہ ذہن آمنہ کے غلوں کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ اور اگر قبول کر بھی لیتا تو وہ کیا کرتا۔ آمنہ تو خود ببول
کی شافلوں میں لٹکی ہوئی انگوڑی بیل تھی۔

سو وہ گھر سے ہی نکل گیا۔
کہاں اور کیوں۔

ایسی باتیں اس گھر میں کوئی نہیں سوچتا تھا۔ اب بھی دو چار مہینوں کے بعد جب اسے گھر کی یاد تازہ کی تو وہ آمنہ کو ملنے کے بجائے
گھر چلا آتا تھا۔ آمنہ کے علاوہ اسے گھر میں کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ وہ چاہے کتنے عرصے بعد گھر آئے۔ اس کے وجود کو کبھی طرح نظر انداز
کیا جاتا تھا۔ اس کی پرواہ کرتا بھی کون۔
اسمیلن تو گھر کا گدھا تھا۔

گدھوں کے پاس ذہن نہیں ہوتا۔ بوجھ اٹھانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ آمنہ ملتی تھی۔ بس کڑھکتی تھی۔ جل جہنم تھی۔ انکے
علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔

بیگم ابراہیم کے لئے سیکڑے آپا کے صادر کئے ہوئے فتوے سے سر ہوا اخراج ناممکن تھا۔
باقی رہ گئے۔ عربی اور بھی!

بیگم ابراہیم نے اپنی زندگی کی ایک حسرت عربی پر بھی نکالی تھی۔ ان کے کسی بچے نے کوئی سکول میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ وہ جب
بڑے افسران اور امارہ کے بچوں کو لاہور کے بڑے بڑے انجریزی سکولوں میں پڑھتے دیکھتیں تو ان کے دل پر گھونسا لگتا۔ بچوں کے
سکولوں سے بھی تو (STATUS) کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے فکر کر کے عرفان کو لاہور کے ایک بہت بڑے سکول میں داخل
کر دیا تھا۔ داخل تو وہ ہو گیا لیکن جب اس کے یونیفارم اور فیصلوں کا تخمینہ لگا یا گیا تو پتہ چلا کہ اتنے پیسوں میں تین بچے آسانی سے تعلیم
حاصل کر سکتے تھے لیکن بیگم ابراہیم آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا وہ یہ خرچ اپنے ذاتی بچوں سے پورا
کر دیتی۔ گھر کی گاڑی پھر بیچتے دیتی۔

ایک سال میں عربی صاحب کا داغ بھی پلٹ گیا۔ وہ "صاحب لوگوں کے ساتھ پڑھ کر احساس برتری کا شکار ہو گیا۔ نلے
گھر کا ماحول اچھا لگتا۔ گھر کا کھانا۔
پھوٹے بھائی سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔

بڑوں کو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔

سکول میں سب کچھ مغربی۔

اور گھر سارا مشرقی۔

دو تہذیبوں کے درمیان وہ گیند کی مانند اچھلنے لگا۔

بیگم ابراہیم نے اپنی دانست میں ایک اور دانشمندانہ قدم اٹھایا یعنی اسے ہوش میں داخل کر دیا۔ کیونکہ گھر کا ماحول اس کی

دینی کے مطابق نہیں تھا۔

خرچہ اور بڑھا۔

ماحول میں کھانا اور بڑھی۔

ایک اور غلطی کا اثر خاندان پر پڑا۔

مگر اس کی قیمت کے ادا کرنا پڑی۔

اسمیلن اور آمنہ کو۔

جو۔ دونوں چپ تھے۔

اب عربی صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرتا۔ اور ان تین مہینوں میں پورا گھر ہی نہیں۔ سارا ماحول اس کے وجود سے متاثر
آ جاتا تھا۔ گھر کی ایک اک شے سے نفرت کے اظہار کے علاوہ وہ سارا وقت مار دھالا پر آمادہ رہتا۔ ایک مصنوعی پستول گلے میں اور ایک مصنوعی
خنجر ہاتھ میں پکڑے۔ آنکھوں پر بڑے بڑے خوں چڑھائے سارا وقت وہ "کاؤ بوائے" بنا پھرتا رہتا۔ اور محلے کے کسی کسی
بچے کے کان۔ آمنہ یا یازدوں سے خون نکلتا رہتا اس کے سکول کھلنے کے بعد سارا ماحول خدا کا شکر ادا کرتا اور بیگم ابراہیم بڑے آنسو پونچھ کر
لوگوں کو آواز میں کہتیں۔

جنتی ہیں کم سختیں میرے لعل سے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور سرخ و سفید ہے میرا بچہ۔ گھر کی
نوراک تو اسے گئی ہی نہیں۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا ہے کمزور ہوجاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں عربی بیگم ابراہیم اور سیکڑے آپا کی ایک چھوٹی سی شمشیر سی تصویر تھا۔
باقی رہ گیا۔ سلمان۔ تو اس کے مقدس میں وہی کچھ تھا جو اسمیلن اور آمنہ کے۔

آٹھ سال بھی بڑا معصوم اور صابر بچہ تھا۔ دھلا پیلا اور زرد رداس کے لئے ریلوے کا ٹکٹ سکول ہی کافی تھا۔ علی الصبح علیٹھا
کا یونیفارم پہنے۔ بسٹہ لعل میں دیا۔ وہ پیدل اسکول چلا جاتا۔ اور شام کو خود ہی آجاتا۔ جو کچھ ملتا کھا لیتا۔ اور جو پہننے کو
دیا جاتا پہن لیتا۔ وہ اگر اپنی حاجت میں ہر سال اول آتا تو بیگم ابراہیم کو سر دکارتا تھا۔

عربی کو عرش پر چڑھا کر انہوں نے بھی کو ایک انمٹ احساس کمتری بخش دیا تھا۔ اس لئے عربی کے گھر آتے ہی وہ ملازموں
کی طرح اس کی تابعداری کرنے لگتا۔ جس کے جواب میں اسے اپنے "ریشا نہ نہایت" رکھنے والے بھائی کی شہید نفرت اور لٹائی ملتی۔
اس کے علاوہ۔ حسب معمول ان کے غریب رشتے داروں کی درخواستیں اور رالبع بھی بیگم ابراہیم کے باورچی
خانے کی زینت تھیں۔ اپنی اس سرپرستیوں کے سامنے جنہیں وہ نوکرانیاں بنا کر پیش کرتی تھیں۔

اس طرح یہ ایک کتبہ تھا۔ جو اندھوں کی مانند ایک ہی لالچی کو تھامے۔ مستقبل کی پریچ اور معلوم
راہوں کی جانب رواں تھا۔

باقی آئندہ ماہ پڑھیے



نئے پڑوسی دکن کے شریف گھرانے کے لوگ تھے جن کے خاندان میں ایک غیر شاہی شہزادہ وجاہت "اس کی بیوہ" اس وقت جوان نہیں شامل تھیں۔ ان لوگوں کے برابر والد مکان میں لٹے سے ہماری بیگم کو جس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ مشکل ہے کیونکہ وہ وہیں سے اس مکان کے خالی ہونے سے پریشان تھیں اور بقول ان کے ایک کوئی ایسا ہمسایہ نہیں جسے کو وقت ضرورت پکارنا پڑے کیونکہ اس مکان کی دیوار ہائے گھر کی دیوار سے ملتی ہوئی تھی چنانچہ ان کا سامان بڑی جی آرتھ سے بھی نہ پایا تھا کہ بیگم وہاں پہنچ گئیں ان سے ملاقات کی اپنا تعارف کر دیا ان کا حال حال پوچھا اور پھر گھر واپس آ گئیں۔

سیدہ کو جب میں دفتر سے لوٹا تو دیکھا کہ وہ غیر معمولی طور پر چلنے کا انتظام کر رہی ہیں پہلے تو میں ہلکا سا بھانپاں کی سیلیاں آگئی ہیں لیکن ہب گھر میں دو دروازے ان کے اور اپنے بچے جلیس کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا تو میں جان ڈال گیا اور ان سے پوچھا "خیر تو بے آج یہ کالہ ہٹام کس کے لئے ہے نہ ان کو کوئی نظر نہیں آتا" یہ سیکس سال بڑے سکرٹس اور بلیوں کی آج بڑا بڑا لامکان آبا ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ان کا پورا سامان نہیں چلے ہے" "میاں کچھ دبا ہوا کتا نہ ڈوڑھ کی ہوئی لیکن اس خوشی میں موبائے سٹی لے گی یا نہیں؟"

"جی ضرور لے گی بلکہ پہلے آپ ہی لی لے لیں پھر میں جان بھجواؤں گی۔" اس بھی ابھی وہیں سے آ رہی ہوں بڑے اچھے لوگ ہیں ایک لڑکی لی۔ لے پاس کرپن ہے دوسری کالج میں پڑھتی ہے اور تیسری اسکول میں۔ باپ دیکھ ہیں بڑا ہمسائی سرپرست ہے اور ساتھ میں بیوہ ماں ہے" انھوں نے بیٹھنے کے لئے چائے پھانتے ہوئے تفصیل بتائی ہیں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا "اُن کی خوش اخلاقی اور خلوص کو جانتا تھا جس کی وجہ سے وہ پوسے حملہ آلی پانی ہوئی تھیں اور پچ تو رہے کہ لوگ کچھ زیادہ تر ان کے شوہر کی مہربانی سے جانتے تھے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خدا نخواستہ آدم پیراز اہل خلاق آدمی تھا بلکہ کراچی میں رہنے والے اور مردوں کی طرح میں گتھی نگہ دانت کا شکار تھا دفتر سے ٹھکے ہائے لٹے کے بعد گھر میں آتی سکتی ہی نہ ہوتی تھیں مجھے میں کہیں مکمل سکون لیکن اس کے باوجود درگرو کے ایک مکانوں میں میرا آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔

ہر گیت مجھے چائے ملا کر بیگم بھراؤں کے پاس پہنچیں سب اہائے پلائی۔ شام کو ان کا ذکر ہائے یہاں سے بانی لے گیا اور رات کو بیٹھ ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو ان کی چھوٹی لڑکی فرحانہ نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ میں نے کٹڈی کھولی وہ سیدھی بیگم کے پاس گئی اور بولی۔ "آپا! ماں نے کہا ہے کہ سچ کو اپنی جھوٹاری کو ادھر بھی بھیج دیجیے گا اور دروازے سے کہہ کر ہائے یہاں بھی میرے پروردگار۔" گلوادیکھنے کا۔

"تم اس کی نگرہ کر دکن انٹار رائٹ دونوں کام ہو جائیں گے" بیگم نے جواب دیا۔ اور جب لڑکی چلی گئی تو بولیں "یہ ان کی سب سے چھوٹی لڑکی فرحانہ ہے۔ ساتویں جماعت میں پڑھتی ہے۔"

غرض کہ چون توں کے رات گئی بیگم کو تو ہر گھر میں اپنا سکر جانے اور بیگمیں بڑھانے میں ملکر جا مل تھا۔ دوسروں بڑی ملاقات صاحب خانہ سے ہوئی جن کا نام وجاہت تھا۔ وجاہت واقعی اسم با سنی جوان تھا۔ دراز قد کا لی چو، کھلتی رنگت اور صحت مند جسم کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اگر کچھ اپنی بیگم کی بھائی یہ معلوم نہ ہوتا کہ کراؤں کی چھوٹی بہن سلطانہ کوئی لے پاس کر کے چھ سات برس گزر چکے ہیں تو میں شاید وجاہت کو بھی ملال علم ہی سمجھتا۔ غرض کہ وہ جھ سے بیٹے کا کے ملا۔ اور بتایا کہ وہ ایک مقامی فزم میں بہت اچھے ہسکر پر فارغ ہے باپ مر چکے ہیں اور اب ہی اپنے کنبے کا واحد کیشل ہے میں اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا اور جب یہ ضحمت ہونے لگا تو بڑی قوت اور یکا گت سے مجھ سے کہا۔

"اچھا انہیں بھائی خدا حافظ پھر انٹار رائٹ جانہ مروں گا"

رفتہ رفتہ دونوں گھروں میں ریلوایا ضبط پڑھنے لگا۔ میرے دفتر جانے کے بعد میری بیگم جب بھی تنہائی سے آتا تین نوران کی کسی نہ کسی لڑکی کو بلایا کرتیں اور جب ان لوگوں میں سے کسی کو کڑا اور خیر خیر کے لئے بانا رہا پڑتا تو بیگم ہی ان کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ میں نے چند ہی ہفتوں میں اندازہ لگا لیا کہ یہ لوگ شریف اور ملنا ہیں۔ وجاہت بھی خاموش اور نیک لڑکا ہے وہ صرف یہ کہ زبان سے مجھ کو انہیں بھائی کہتا ہے بلکہ اتنی بھی کو بڑا بھائی سمجھتا ہے۔ وہ گئیں میری بیوی تو وہ ایک عرصہ سے اس محلے کی مغرب پانچ تھیں جن کے صلاح مشورے کے بغیر کسی لڑکی کا چہرہ تیار ہوتا تھا نہ بیٹے کی بری کے جوئے سے تھے۔ باقی ربط و ضبط نے چند ہی دنوں میں دونوں گھروں سے پرے کا کھٹکھٹا کر دیا اور میں نے وجاہت کی تینوں بہنوں کو پکچا۔ بڑی بہن سلطانہ جو کئی برس پہلے کالج چھوڑ چکی تھی پڑتہ اور سیاہ فام تھی اس کے تیس برس کی جا نہایت زخمی یا اور بات ہے کہ طبیعت اور دل کے اعتبار سے وہ لڑکی میرا تھی جس کو لوگوں میں ایک نہیں تو بڑا ملا میں ایک کہا جا سکتا تھا۔ اس سے چھوٹی بہن یاسنا بولی رنگت اور درمیانہ قد کی تھی اس کی سلونی رنگ اور بک لٹے تھے اس کے چہرے کو پرکشش بنا

اس وقت تو بات ختم ہو چکی تھی مگر یہاں یہ سلسلہ طے کرنے کے لئے
 رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے بھی ان کی بڑھکاوٹ میں جانا تھا
 کہ اس شریف گھر کے کس قدر مسائل میں ہیں اور جاہت سے پر اپنی
 جائیداد اور محنت سے ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ آخر کار وہ بھی ایسا جب
 ریمانہ نے بھی اپنی تعلیم مکمل کر لی اور خاتہ اسکول چھوڑ کر کالج میں داخل
 ہو گئی اور اپنے کی شادی کی آرزو اور بیٹیوں کی قسمت کھٹنے کی متا ہو رہی
 ماں کے کہنے کا سامن ہو گئی اور اب ماں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ
 کر کے کہہ بیٹھی کا گھر آیا کہیں جاہت کو اپنی شادی سے کوئی
 لچھے بھی نہ ہو۔ میں نے یہ ذکر کرتے بارے میں اس کو داس پر کرنا خوش ہو گیا۔

ہم لوگ جانتے تھے کہ یہاں اور سلطانہ دونوں حکمران اور سلیقہ مند
ہی تھیں۔ لیکن اب میں بڑی خاموش اور متحکم مزاج، خفیا خفیا سلطانہ کا تو جواب
دی رہا تھا۔ یہاں سے تیارہ عزت گزارہ بلا واسطہ شواہد تھے۔ اسی لئے ہم دونوں
کے دماغ کی ایک جگہ جیسے اعصاب کے ساتھ تھے کہ سلطانہ جہاں کی کبھی اس کے والد
کی کوئی یاد تھی۔ اس لئے ہمارے یہاں آئے اور ہم نے ان کی یوں خاطر خواہ تھی
یہ سلطانہ اور یہاں ان کی اپنی نہیں ہیں اور کبھی اس کے والد خود وجاہت
یہاں پہنچے۔ ہر تیرہ سال کے وہ ہیں اس کے ایک بھائی کی بیوی کی اولاد کی بیویوں
کے ساتھ ہیں وہ بیگم کی کسی کام کی شگفتہ پسند تھی اور کسی کو اس کا قدر
نے ہی نہیں تھا۔ دیکھتے بھائے کے بعد کہا کہ ہمارے عرشے میں جواب میں گے

دنیا امید پر قائم ہے جہاں ملتے برس گئے چند دن اور گزرا
لے گئے۔ البتہ وجاہت کے لئے وقت بڑا دشمن اور بدگماں تھا یہ کین بھینچتی
راکے کا بڑا بھائی کو بیٹے آسماں سے پھرتے سماں کو کھینچا اور بڑی تفصیلی
گنگو کی معلوم ہوگا ان کو بھی لڑکی کی شکل و جھوٹ پر کوئی اعتراض نہیں
ہے لیکن وہ اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ لڑکی والے اپنے خراج برائے کو بھائی کو
نہ ان سمجھا دیں تاکہ لڑکے کا مستقبل سونہ جائے اور لڑکی کی زندگی بھی جی سے
بسم۔ ان کی بے شرط سون کر میں سناٹے میں آگیا۔ بہت جاگمگن کر تائیں کر تیں
بہت کوشش کر کہ وہ اپنا رشتہ چھوڑ دیں لیکن وہ سس سے سس نہ ہوئے۔
میری کوئی تاویل ان کے سامنے نہ چلی اور میں اپنا سامنے لے کر وہاں سے
واپس آگیا۔ شام کو جب میں گھر پہنچا تو چواہت کا میری شہتہا چلایا۔ میں
جاننا تھا کہ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا جس نے نہ رورستی
سکر لے لی کوشش کی اور سچ اس کو پنے ساتھ پلنے گھر کے اندر لایا میں نے
اس کی ہونٹ دیکھی جس پر امید باس کی گہری کشش تھی۔ اس نے میرا سوال

”اے بھائی میرا سر جیکر مارا ہے خدا کے لئے پانی پلا دیجئے“
میری بات سن کر وجاہت نے کہا اور میں نے اندر سے پانی لاکر اس کو پلاتے ہوئے
کہا ”تم بہت پریشان ہو دو جاہت بہت زہادو“ میں نے ان پر زور کر کے کہت

بھگیا یہاں تک کہ اگر لڑکا مسرہ سالے کی دولت پر لندن چلے گا تو اپنی بیوی کے مقابلے میں زندگی بھر اس کتڑی میں مبتلا رہے گا اور لازمی طور پر بیکہ کے دل میں بھی اس کی دھڑکت اور وقت نہیں بے گی جو اندھا جی زندگی کا سبب بنیائے وہ تو شوہر کا پناہ ضروری سمجھتی ہے گی۔

میری اس بات پر بیٹھے مہاں ساگھٹھے میں نے پھر ان کو کھنڈا کیا لیکن جو کچھ کہنا تھا کہ گرا۔ اور کون نہ کتا کوئی ذرا بھی توجہ ہوتی تو میں اپنی زبان رک لیتا۔ ایک طرف تو لوگ اس کا شکوہ کرتے ہیں کہ لڑکا پلا سے حیا اٹھ گئی ہے عورتوں میں شرم نہیں ہے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ عورتوں میں غیبت اور لوگوں میں حمت بھی ہے کہ کہیں نہ ناپا کوئی فیصلہ نارادہ نہ اپنی کوئی شخصیت نہ اپنے زور بازو پر بھروسہ جس لڑکی نے جینر بافٹر قمر کی صورت میں سب سے زیادہ بولی لگائی اٹھی کے ہاتھوں نیلام میں پکے گئے ہیں سوچنے کو اپنے اگے بھی لڑکیاں ہیں۔ معاشرے کے بار میں کسی نیلام گھر سے ان کے لئے بھی شوہر خریدے۔ میں نے جینر بافٹر کی سرگٹ سلگائی اور جانتا مانتا ہے آپ کی طرح خراب اٹھا۔ لکھا کہ بولا

”بس بس۔ خدا کے لئے بس کیجئے۔۔۔ انیس بھائی۔۔۔ میں اس سے نچوڑ نہیں سکتا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرے دل پر رحم کیجئے۔“

میں نے پشیم کہ اس کو دیکھا اس کا چہرہ خزاں بر پتے کی طرح زرد تھا۔ کشادہ اور بلند تھے پر سپین ہی پسینہ تھا۔ ہاتھ سر سے اور دل دھڑک رہا تھا۔

”اے وجاہت خیر تو ہے۔ نہیں کیا ہو گیا کیا میری کوئی پتہ بڑی لگی۔ تین کروٹیں سلطان اور ریکارڈ کو اپنی ہی نہیں سمجھتا ہوں؟“

نہیں نہیں انیس بھائی! آپ ایسا نہ کہیں۔ آپ بے بس لے دی کیلے جویر بڑا بھائی کر سکتا تھا۔ مجھے آپ کوئی شکوہ نہیں بلکہ میں آپ کا احسان مند ہوں؟

”ان باتوں کو چھوڑو۔ آخر تو کیا کیا ہو گیا۔ تمہاری آنکھیں کیوں نم ہو گئیں؟“

”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے میں اس وقت گھر کا آرام کروں گا کل آپ کے ملاقات ہوگی؟“ اس نے جواب دیا اور کرسی پر سے اٹھا۔

”میں تم کو اس حال میں پرکھ نہ جانے دوں گا، آؤ، میرے ساتھ باہر آؤ۔ کھلی ہوا میں یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر بیرون پر لے آیا اس کی صورت بنوڑ گئی جس پر عیب نہ تھا کہ حن و لال اور ابوی بر سر رہی تھی۔

”وجاہت خیر تو کوئی ایسی بات ہے جو تم سے چھپا رہے ہو۔ انسان کی در انسان ہونے کے بعد بناؤ تو وہی شاید میں یا، تمہاری آپا تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“

میسٹر نے سے ہڑکی کے چٹا لفظ سن کر وہ کچھ اور جذباتی ہو گیا میں نے فوراً کو تعلیم دیا کہ آؤ مجھے سے اپنے آنسوؤں کو پکڑ کر رکھو۔

”وجاہت تم مرد ہو۔۔۔ مرد کی طرح ہمت سے کام لو میں تمہارے مسائل تمہاری مشکلات جانتا ہوں لیکن غلط فہمیاں کا مقابلہ میری تواناں ہی کرتے ہیں۔“

”خیر کرتے ہیں لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے جو ایک کرد عورت کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں میں اپنی بار مانتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ سلطان اور ریکارڈ کی شادی اب کبھی نہیں ہوگی۔ اس چوکھٹ پر کوئی داماد ہرا باندھ کر نہیں آئے گا۔ میرے گھر میں شہنائیاں نہیں بھیں گی، ڈھولک پر تھاپ نہیں پڑے گی۔ بائیں کے وہ جسے گیتوں کے بول میں میری کوئی نہیں ملی کے دینے نہیں ملے گی۔ میری راج کے وہ کچھ بھائی ہیں کہ اس بات پر میرے وار میں بھی کچھ جائے گی۔ میری آرزو میں بھی میرا گئی۔“ میرے آواز اجلاؤ کام و نشان مٹ جائے گا اماں کی کوئی آرزو پوری نہ ہوگی۔ بیٹیوں کے گھر سامنے کاروان منیر لہو لکھنے کی تھا۔

”تم یہ کیا کہہ رہے ہو وجاہت! اس قدر دباؤ کی باتیں تمہارے منہ سے ابھی نہیں گئیں۔ میں نے اس کو پھرتی دی۔ تھے یہ۔۔۔ گم بھی آگئیں اور وجاہت کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ میں نے حقہ طور پر ان کو سب باتیں سنائیں وہ اندر نہیں۔ شربت کا گلاس لائیں اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر وجاہت کو تسلی دلا سائے گئیں۔

شریت پتی کراس کی طبیعت زرا سنبھل گئی باہر کھلی ہوا کے سرد ہونے کو اس کو فرحت بخشی شاید اس کو گھر چلنے کی اجازت سے دیتا لیکن بیگ اس کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی تھیں چنانچہ انھوں نے پھر کر دیا اور وجاہت سے دیکھ کر کہا۔

”آپا۔ میری نہیں بے گناہ اور بے تصور ہیں خطا وار میں ہوں اور میرے کیے کی سزا۔ لوگ بھگت یہ ہیں؟“

”تم نے آخر کونسا ایسا گناہ کیا ہے وجاہت! میں نے پھر اس سے پوچھا۔

”کیا ہے اور بہت بڑا گناہ کیا ہے جس کے بعد سے شادی کا ذکر میرے لئے سوا بان نہ رہا ہے۔ جس کے بچوں کا تصور میرے لئے وہاں

ہاں ہے کاش کوئی کچھ سنا کر میری بہن کو میرے ذرا سے تسلی کی کئی بڑی سزا مل رہی ہے میں جانتا ہوں اس کے خیر کی چکیوں سے نڈھال ہوں۔ اماں نہیں جانتی ہیں اس نے تقدیر کا شکوہ کرتی ہیں۔“

وجاہت بڑی گھمبیر لکھتا کہ ہاتھ میں اور بیگ دونوں کو شیشی میں چاہے سے تھے کہ کسی طرح کی وجاہت کے دل کی بھڑائی نکال جائے تو شاید اسی بات کا پتہ چلے چنانچہ بڑی ہی چوڑی تنبیہ کے بعد اس نے کہا۔

”انیس بھائی! آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد صاحب دکن کے متون اور سرکار و لوگوں میں سے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ یہاں آئے اور ان کو ایک مگر کی جگہ میں ملازمت مل گئی۔ میں اس وقت بارہ تیر برس کا تھا سلطانا چھ سات برس کی تھی اور ریکارڈ چار برس کی۔ فرحان پیدائش ہوئی تھی۔ اماں کو سرکاری ملازمت کے ساتھ چھوڑ کر ایک کارٹر بھی مل گیا اور ہم لوگ میں بسنے کے چند دنوں کے بعد میرا نام ساقس جاعت میں کھنڈا گیا میں پڑھنے جانے اور سال بعد سلطانا بھی پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ پرائمری اسکول میں داخل ہو گئی۔ کواٹروں کی زندگی سے تو آپ واقف ہیں ان میں زیادہ تر سرکاری ملازمت تھے سب ایک ہی حیثیت اور ایک ہی درجے کے ہوؤں کے ملک چھتے ہیں۔ بچوں کے مقابلے میں یہاں ملازمتی اور ان کے مراہم بھی کچھ زیادہ چھتے ہیں۔ چنانچہ میرے پڑوس میں جو لوگ رہتے تھے وہ کاجور کے تھے۔ ان کے ساتھ بچے لڑکیاں نہیں سب چھتے کتاب چند سے مانتا تھا۔ البتہ لڑکا کوئی نہ تھا۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی شریا اصل و کھانڈ کے برابر تھی لیکن اس کی دوسری سلطانا تھی ان دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ صبح کو کھانڈ سے فارغ ہو کر میری وہ میرے مہاں سلطانا کو لے آتی اور کبھی سلطانا اس کے مہاں چلی جاتی۔ اسی طرح اسکول سے اپنی بھی ایک ساتھ ہوتی۔ دونوں کا دل بھرنا تھا رہتا البتہ ہماری اماں کو ان کے مہاں جانے ان کی اتنی کوہا سے مہاں کٹنے کا وقت کم ملتا تھا بہر کیف وقت گزرا تھا اور ان دونوں کی دوستی شکم سے شکم ہوئی جا رہی تھی۔ شریا بڑی ہنس کھ اور بڑا ذوق لڑکی تھی جہاں چلی مصلحت کو لارڈ باندھتی باتیں کرتی تو نہ سے پہلے جھڑتے۔ وہ سلطانا کے ساتھ پڑوس لڑکیوں کا بیاہ جاتی شہد کا کھانا کھاتی اس عرصے میں میری سب سے چھوٹی بہن فرحان پیدا ہوئی اور اماں جوار لگ گئیں۔ اس ناکارہ موقع پر شریا کی ماں نے ان کا کسی طرح ساتھ دیا جیسے کوئی بہن بنی ہے۔ اس لڑکی کی پیدائش کے بعد بہت کم درد ہو گیا اور سچ تو یہ ہے کہ فرحان کی اتنی ہی کہ میرا ہی پٹی پڑھی۔ رفتہ رفتہ وقت اپنی منزل سے لے کر تار سلطانا اور شریا ایک ساتھ پرائمری اسکول میں چلی گئی اس میں شریک ہوئی تھیں لیکن شریا پڑھنے میں تیز تھی چنانچہ تین برس بعد وہ ساتویں پاس

کر گئی لیکن سلطانا چھٹی جماعت میں میری بھینس ان کی دوستی میں فرق نہ کیا اس نے کبھی نہ سوچا کہ وہ پڑھائی میں سلطانا سے کتنے ہے بصورت میں اس سے بہتر ہے۔ وہ جب گھر میں آتی میرا سارا گھر اس کی پڑھائی باتوں اور بھنگا راز گھٹوں سے گونجنے لگتا اور اب تو سلطانا کے ساتھ مجھے بھی اس کا انکشاف ہونے لگا جس شام کو وہ ناتی کا مہاں اس کو ڈھونڈ کر لائیں اور جب کتا نہ آجائی گھر مٹا مٹا لگتا اور اس کے کٹنے کے ساتھ ہی گھر میں ہمارا جاتی اور میں اس سے ہنس کر پوچھتا تھا۔ ”آج تم کہاں گئی تھیں؟“

”کام کر رہی تھی گھر میں۔“

”تم اور کام تو کر رہی۔۔۔ اچھا کیا کر رہی تھیں یہ تو بتاؤ۔“

”آج فوٹو نہیں آیا تھا کھانا کھا کر بھی تھی۔“

”تمہیں کھانا کھانا بھی آتا ہے؟“

”کیوں۔ نہ کھانے کی وجہ؟“

”کبھی کبھلا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ کبھی کتنا تکلیف بخو کچھ ہوا اور سالن میں کتنی شکر۔“

”یہ کمال فائزادہ آپ کی بیوی دکھائے گی اس کے راج میں نہ لیکن انکھیں بے گناہ اور نہ چلیا۔ اگر خدا نخواستہ کسی ہم آگاہ کس کاج کی ڈگری یافتہ مل گئی تو وہی آجیلے گا آئے ہی اس کا وارٹ کے باورچی خانے میں بھلی کے پتکے گولے گی۔ ایک ایک لفظ کالی کول کر طعنے جاتے گی اور پکائی چلے گی۔ ڈوٹی چلائے گی گھر کی دیکھ کر پھر سیکڑ دے گی پھر ڈوٹی چلائے گی؟“

”آہ ہے یہ کس کی تعریف ہو رہی ہے؟ سلطانا نے کہا۔

”وجاہت بھائی کی بیوی کی۔ شریا نے ہنس کر جواب دیا۔

لیکن اس کے بعد سے جب کبھی وہ گھر میں کچھ کھانی میسر لے ضرور لاتی اور چند دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں کی طرح اس کے پکائے ہوئے کھانوں میں بھی حالات ہے۔ اس کے ظلوں کی لذت اس کو ملتی دل چاہتی ہے کہ جس کو وہ خود پکاتی ہے کبھی کبھی میرا دل بے اختیار چاہتا کہ اس کے سینے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پھول کر شریا کی ماں اس کی ملازمت کیوں ہے لیکن کبھی ایسا نہ کر سکا۔ اور وہ دکن کے ساتھ ساتھ بیکس کی گھر میں اترتی گئی۔

اس عرصے میں سلطانا تعلیم میں تیز ہو گئی اور بائیس لکھ لکھ گئی لیکن اس کے باوجود ان دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا جیسے گھر میں بتا چکا ہوں شریا کی کئی بہنیں تھیں سب میں چوٹی زہین اور بھگتا تھیں لیکن باپ کے بڑھاپے کے لئے کسی بٹے کا سہارا نہ تھا بڑھاپا اس کے میرے والدین کے لئے

”اچھا ہرانا، اُس کو آپ کی غلات کا مار دے گی اور نہ جانے اس بیچاری کا کیا حال ہوگا۔“ ثریا نے بڑی خوفناک سی صورت سے وضوح دلا لئے میں پکارا اور زونا بھی آگئیں اور اوپر اوپر دھر کے تھکے۔

میں جوں جوں صحت یاب ہو رہا تھا زندگی معمول پر آ رہی تھی اماں کی بریانی کے ساتھ ساتھ شرا کی آمدورفت گھٹ رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بیسے دل کے بہت قریب آ کر بہت دور دھار رہی ہے۔ میں اُس کو اپنے سے کبھی جدا نہ ہونے دوں گا جُن صورتِ عظمیٰ سرت، تعلیم کی دولت اور پھر ملازمت سبھی کچھ تو ہے، اُس کے دامن میں لیکن نہیں یہ سب چیزیں اُس کے خلوص اور بے لوث محبت کے آگے بچھ ہیں۔ میں نکل ہی دوں گی کہا اور اپنا حریف مطلب بنان پر لٹے اور اپنا تدم غایبان کرنے کے لئے سلطانہ کا انتظار کرنے لگا۔

تختا۔ ہم لوگوں کے جانے کے بعد اس کا دل بھی اچاٹ ہو گیا لیکن وہ اپنے کام اور اپنی ملازمت میں لگی رہی اور رہا سے یہاں اس کی آمد و رفت اور سلطانت سے اس کے سب مل ملاپ میں کوئی فرق نہ پایا۔ بلکہ اس کے کچھ دنوں کو گنگو کے مواقع کچھ زیادہ ہی ملنے لگے۔ جبہ میرے یہاں اس کی سلطنت کے ساتھ لے کر شہر کا اس کے گھر تک چھوٹنے کے لئے جا کتا کھی رہا تھا یہی میرے ساتھ ہوئی اور کبھی ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہوتا اور ہم لوگ مسجد کے کنارے کلفنس کے باغوں یا منوٹا کے ساحل پر اپنی زندگی کے حسین خواب دیکھتے جس کو سنا کہ فرحت بخش ہوا تھا اور چاند کا ظہور دیکھتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں تو یہ جانتے ہوگا کہ اب میرا یہی رشتہ تھی میری زندگی تھی۔ مجھے ہر وقت یہی محسوس ہوتا کہ اگر وہ زندگی میں مجھ سے بچھڑ گئی تو میں عمر بھر خلا میں بیٹھتا رہتا ہوں۔ سلطانہ اور یہاں کے دونوں اس کا یہی ہمبھی بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں لیکن میری کتاباں بالکل خاموش تھیں۔ ان کی خاموشی کے باوجود ان پر مجھے بھرپور اعتماد تھا اور کتا کہ بھی شیا میری ہر بار کچھ سولے دسائیں گی۔ مجھے پوری طرح یقین نہیں لیکن یہ خیال مزید بے کراں ہے۔ میرے گھر کی پانی تھی سب لوگ ان کا جتنی بھی شہر میں کی طرح چمکے ہی تھے وہ اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے پوری مغل پرچائی ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ گاہوں سے اس کو کھینچنے کے لئے تیندیاں اس میں ڈالیں حسین اور پروردگار دکھائی دے رہی تھی اس کی آنکھوں میں بار بار یہی کاجل کی گہر تھی اور یہاں ہی اس کا مدلول کا بلوں میں آسانی جو ان کو کھنکھاتی تھیں، کافوں میں ہلکے سے آویڑے تھے اور ان میں پروکھن مسکراہٹ، میری نگاہیں ہر بار اس سے چارہوئیں میں آستے سے سرکایا اور وہ شہر کا اس اور سے باتیں کرنے لگی۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا کہ اب یہ تقریب ختم ہوا کہ میں شیا کو گھرواؤں لے جانے کا خوشگوار فریضہ انجام دوں۔ ظاہر ہے کہ چالنے کی دھتھ تھی میرا شام کو سات بجے ختم ہو گئی لیکن میں سیدھے سے پوچھنے کا اس دن سات بجے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں ایک ہی جگہ پر کھڑی ہو گئی ہیں، وقت اپنی رفتار کو سنبھال چکا ہے۔ سلطانہ کے علاوہ شاید کسی کو میری بچیوں کا ملازمہ جو غرض کہ خدا خدا کر کے مغل اعتماد ہو چکی اور میں نے اس کو گھر پہنچانے کے لئے اپنی گاڑی کی گارج سے نکالی۔ سلطانہ اور یہاں کے اس کو خدا حافظ کہا اور تھوڑی دیر بعد ہم لوگ نفرتی چاندنی کی دھن گھن گھن کے سنانے میں کلفنس کے ساحل پر پہنچ گئے۔

۸۔ آج چاندنی بڑی دلکش ہے۔
 ۱۰۔ اور تم اس سے بھی زیادہ دلکش اور محروک ہے!
 آئے یہ شاعری شرفِ کلامی۔

”چلو یہی اسی کاش میں تم کو اپنا دل چکر دکھا سکتا جس میں
تمہاری محبت اور تمہاری غفلت کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں ہے۔“
”میں جانتی ہوں لیکن... اُس نے مجھے کہا۔“

دوزخ کارخ

• زلزلے میں کوئی بڑی بے رحمی نہیں تھی۔ کوئی قیامت نہیں
کیا۔ میرے جوار کے لئے ہی ایک لڑکی و گئی ہے اس کو ایک ایک اچھی
دھن مل سکتی ہے؟

”یہ تو صبح چہاں مگر شریا... سلطان نے بیچ میں کہا
”شریاجیو بیٹوں بھرا کباب ہے ایک چھوڑا چار بیٹوں بیٹی ہیں
کل کلاں کو بپا کی آنکھ بند ہو گئی تو وجہ تہاں کہاں سب کو پاتا پھرے گا؟
اماں کے دل کی بات بان پڑ گئی اور باتے کہا
”سب اپنی اپنی تقدیر کا کھانا ہے کوئی کسی کو نہیں پاتا۔
اگر لڑکی آنکھیں بند ہو جائیں تو کیا وجہ تہاں اپنی بیٹوں کو گھر سے نکال دیا؟
”لے فوج تہاں آنکھیں بند ہوں۔ بہر حال وجہ تہاں یہ لڑکی؟
بیٹا ہے میں اس کی شادی سوچ کر فوج بچہ بھال کر کردی اور ابھی
مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔“

میرا دل ان باتوں سے سینے میں دھڑکنے لگا۔ ریح نامعلوم بوجھ
تسلے دیتی تھی اور سلطان نے عافیت ایسی ہی بھی کر اس وقت اس گفتگو
کو یہیں ختم کر دے۔

میں رات بھر اپنی باتوں پر غور کرتا رہا یہی سائل سوچتا رہا
دل کو باکی باتوں سے اُمید بند تھی اور اماں کی باتوں سے پھر بوسے کے دل
خند لائے گئے۔ یہ میں جانتا تھا کہ اماں کے فیصلوں اور رائے کے آگے ان کی
بہت کم جتن تھے لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ جب آپ کے فیصلے میں میری آرزوئیں
بھی شامل ہوں گی تو جو راز اماں کو چھپا دینا پڑیں گے۔

ہمیں سوائے کے کھانا ایسا نہ تھا کہ میں نے مجھے دوسرے
زیادہ چرچے تھے ابابھی کراچی میں تھے اور کبھی لاڑکانہ میں وہ ان تھک
محنت کر رہے تھے لیکن ان کو زرنی زینوں سے کچھ حاصل نہیں ہو پا تھا البتہ
اس دودھ و دھوپ اور وہاں کی گرمی نے ان کو بہت جلد بیمار ڈال دیا وہ علاج کے
لیے زیادہ تر وقت کراچی میں گزارنے لگے اور زمینوں پر کی ہوئی محنت خاک
میں ملنے لگی۔ مجھے ابابھی محنت کی فکر تھی اور گھر کے بڑھے ہوئے اخراجات میرے
لئے وبال بن چکے تھے۔ اس سب پریشانیاں اور تنگدستی میں اگر جاکا کوئی
فرحت بخش چیز کا تھا تو وہ شریا کی یاد کوئی دلاویز بات تھی تو وہ اس کا تصور
چنانچہ ایک دن موقع پاکر سلطان نے شریا کی ماں سے میرے رشتے کی بات چینی
اور میں بھی پوچھا تھا کہ ابابھی کی ماں میں یہ مرحلے ہو چکے ہیں۔ ورنہ ان
کے بعد کسی پھر نیچے کی اُمید نہ رہتی تھی۔

شریہ کی ماں میں کچھ دارا و چہاں یہ خاتون تھیں۔ بولنے
سے پہلے ایک ایک لفظ کو دل لیا کرتیں۔ سلطان کی بات پر وہ خوش تو بہت

ہوتیں لیکن جواب میں کہا
”سلطان بیٹی تہاں رشتہ اور خواہش میری سرکھوں پر لیکن
یہ گویا اور گڈے کا بیاد تو نہیں ہے؟ زندگی بھر کا سوا ہے۔ تہاں نے اپنا اتنی
کوئی پیاد ملا۔ ہمیں تو جس جواب میں ”ان کی اس عقل بات کے آگے
سلطان کی ایک جمل اور میں کچھ دلوں کے لئے خاموش ہو کر رونے کی تلاش
میں بیٹھ گیا۔ اتفاق سے ان ہی دلوں کو پھر لاڑکانہ کا بڑا بڑا۔ ان کی
صحت کو رد کر دیتی تھی اس لئے میں نے بھی دو تین کی چھٹی اور ان کے
ساتھ پولیا میسر لے کر نادر موقع تھا۔ شریا کو وہ پہلے سے پسند کرتے تھے
اس وقت میری باتوں میں ان کے اور پیاد کا رد نہیں کیا وہ گڈا لیا چنانچہ
میں نے اور سلطان نے بڑی ہنگامہ دو کے بعد ایک ایسی خاتون کو بچھا جو ہم
دونوں کے گھرانوں سے اتفاق نہیں اور ان کی بھی ہم سر کرنے کے لئے ہم نے
بیچ میں ڈال دیا۔

جب اماں کو معلوم ہوا اور باتے ان کو قائل کرنے کی کوشش
کی تو وہ پہلے تو چپ ہو گئیں جب شریا کی ماں کی طرف سے اُمید افزا جواب
ملا تو بولیں۔

”تم کو گول کی خوشی تھی ہے تو یہی ہے لیکن شریا کی ماں کا ان
کھول کر سن لیں کہ ان کو کبھی یہاں کے رسم و رواج کے مطابق دھوا کے
چڑھے کے کم سے کم سات ہزار روپے دینا ہوں گے۔ اور انھوں نے یہ
پیاد شریا کے یہاں بھجوا دیا۔

اس کے جواب میں شریا کی ماں خود ایسے آواز میں کہیں اور کہا
”میں مجبور ہوں میرے یہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے۔“

”نہی ہمارے یہاں تو ہے اور چلے جوئے کی رقم نہ ہی،
آپ یہی سات ہزار روپے نقد عیادت کو دیدیجئے تاکہ وہ اپنا گھر بنالے
یا لندن چلا جائے۔“

”میں سات ہزار روپے کہاں سے لاؤں؟ گھر کی حالت آپ
جانتی ہیں۔ میری لڑکی طبعی کبھی ہے میں نے ہزاروں روپے اس کی تعلیم پر
مرنے کیا۔ داہیہ ساتھ نہ تھے اور میرے بڑی بات یہ کہ لڑکی نوکر ہے تین
چار سو روپے تو وہ پاتی ہے اب آپ کو اور کیا چاہئے؟“

انھوں نے بہت قائل کرنے کی کوشش کی لیکن اماں اس سے
مس نہ ہوئیں ابابھی کے کہنے پر پھر وہ اخلت کی تواناں لے بیٹھ ہو کر کہا۔
”رشتے کی بات تم نے پھر میں خاموش رہی تہاں کہا نا۔ اب اس وقت تم
خاموش رہنا اور میری بات مانو۔“

اماں کے اس جملے نے میری ریح نکال لی میں نے آہستہ کہا

”اماں یہ تو آپ بڑا علم کر رہی ہیں۔“

”لے اس میں غلطی کی کیا بات ہے ابھی غلط کو سسرال سے
دس ہزار روپے کی رقم ملی۔ تہاں نے چکی ہوئی گوری حالت سات ہزار
روپے لائی۔ تو کیا میں اس سے کہیں بات میں کہ ہوں جو کم کولا وار فوں کی
طرح بیاد دوں؟“

”آپ کا کہنا سچ ہے لیکن میں پھر کا ان کے یہاں رواج ہی نہ ہو
وہ کیسے کریں؟“

”اور یہاں رواج چھوڑ دوں۔ تم بھی کہنا چاہتے ہو؟“
ان کی بات پر میری آنکھوں میں آنسو پھر گئے۔ ”تہاں یہاں
راکے بھی کر ہی کے غلط ہیں جو چوڑی رہتے ہیں۔ مجھے شریا کے الفاظ یاد آئے
پھر کلفٹن کی وہ شام گنگا میں گھوم گئی جب اس نے میری بات مجھ سے کہی
تھی میرا سر جھکنے لگا۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دوسرے دن دفتر پر پڑ کر نہ نہیں
فون کیا اور اس کی فریٹ تو بھی سب حالات بتائے اور وہ جواب میں بولی۔

”میں تو پہلے ہی سے جانتی تھی کہ یہ مرحلہ ضرور آئے گا۔ میں بہت
دلوں سے زندگی کی اس موڑ کے لئے تیار تھی۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں نے تو یہ باتیں خواب میں بھی سوچیں تھیں۔“
”عجب ہے کہ آپ اپنی ماں کی طبیعت کو نہ سمجھ سکے جس کی گود
میں پروان چڑھے۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے شریا۔ خدا کے لئے تاؤ ابابھی
کیا کروں۔ وہ اپنے فیصلے پر پڑی ہوئی ہیں اور ابابھی ان کے آگے سپر
ڈال چکے ہیں۔“

”میں کیا رائے دے سکتی ہوں۔ جو جی میں لے کیجئے۔“
”خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو شریا... مجھے کوئی راہ دکھاؤ۔“
میں نے پھر التجائی۔

”میں کیا رائے دوں آپ کے لئے وہی مدد نہیں ہیں۔ یا تو
مردوں کی طرح اپنی بات پر جان دیکھئے یا گھر و لڑکیوں کی طرح ہتھیار ڈال کر
اماں کی گود میں سو جائیے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور میں تنہا کھڑا رہا۔
دو بار فون کیا تو معلوم ہوا کہ شریا کو فرسے جا چکی ہے۔ میں پھر اپنا سر ہچک کر
بڑھ گیا۔ بڑی برکت اس کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کا آخری فقرہ بڑا دلخیز
اور عجیب تھا جو میرا دل چاہ رہا تھا اپنا سپر ڈالوں۔ غرض کہ ایک گھنٹہ
پہلے میں فرسے اٹھا۔ گھر پہنچا اور وہ دس کا ہوا نہ کہ بستر پر لیٹ گیا
تھوڑی دیر بعد سلطان نے چائے کے کرائی اس کی اُداس

آنکھیں اور وہی دلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت رنجیدہ اور دلگیر ہے۔ اس
نے بہت ادراک کیا لیکن چائے کا ایک گلوڑ بھی میرے حلق سے نہ اُترا اور میں
پھر منہ لپیٹ کر پڑ رہا۔ میری حالت پر ان کی کوشش ہوئی۔ ”قرب آئیں، اٹھا
چھو تو بدن گرم تھا گھر کو لوں“ لے ہے مجھے تو بھانپے۔“

”ابھی تو صبح تیار ہی ہے آگے آگے دیکھئے آپ کی خدا کی رنگ
لائی ہے۔ سلطان نے دایں جاتے جاتے کہا

”لے چپ رہ لو کہ تیری زبان بہت چل نکلی ہے۔“ پھر وہ میرا سر
دباتے ہوئے بولیں۔

”آج تہاں کچھ بھی جان آئی تھیں کبھی راکیاں ان کی نظریں
ہیں ایک ایک کھاتے پیتے خوش حال گولنے کی کیا ہر کہیں کی تو رگھو دت
سے بچ جائے گا۔ بہر حال اب تہاں سے اب اتنا کہ لے کر کسی جگہ ہیں تو ان کی بھی
بات ناپسند نہیں ہے لیکن وہ بھی میری اس بات سے متفق ہیں کہ کم کو کم سے کم
سات ہزار روپے جوئے کی رقم ضرور ملنی چاہئے۔ اے ہاں تم کا خاندان کے
کسی لڑکے سے کم ہو۔“

”خدا کے لئے اب اس ذکر کو ختم کیجئے۔ اگر آپ کے دل میں شریا
کی تعلیم تربیت، عمارت مزاج، سلیقہ، خلوص اور محنت کی کوئی قدر نہیں ہے
تو نہ ہیں۔“

”کوئی خلوص کہاں کی محنت؟ کیسی عمارت، کبسا مزاج۔
اے بے بوقت لڑکے وہ تو سہ لکھا داتا تھا تیرا دل مود لینے کے لئے تاکہ تجھ پر
ڈوبے ڈال کر تجھ کو تار میں کرے اور میں تیری شرم کی خاطر آنکھ بند کر کے
اُس کو بیاد لاؤں اور ان کے ابابھی ایک دم ہی بھی خیر نہ ہو۔“

”خدا کے لئے اماں ہوش کی باتیں کیجئے۔ خدا کے غضب سے ڈرئے۔“
”میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں باپ کے پلے نہ بیہیے
نہ کیا۔ لڑکیاں سب ذکر ہیں تو ہر کہاں سے ملے؟“

”اماں جان! میں نے بڑے کرے کہا
”ایسی ہی بیٹیاں بیاری ہیں تو نکالیں ہر گز سے روپیہ؟“
کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ گھر میں چوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اور خواب
بٹنے دیکھتی ہیں؟“

اماں کی اس تیر و نشتر کی باش کے بعد میں دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔
میرا نرم و گلاڑ کچھ آنسوؤں کی کمی جذب کر رہا۔ شریا کے الفاظ پھر کراؤں
میں گونجے۔ ”لڑکیوں کی طرح ہتھیار ڈال کر ماں کی گود میں سو جائیے“ نہیں
نہیں یہ میں سمجھی نہ ہوں۔ دلوں کا یہ ہرگز نہ ہوگا میں پھر سے بے شرم کی
طرح ہستہ اٹھا میری غیرت کے کچھ لکھا دیاں لے ایک گلاس پانی پیا اور

ماں سے کہا
"آپ کو کچھ کہنا تھا کہ نگلیں اب میری بھی سن چکے وہ یہ کہ
اگر میری شادی ہوگی تو میرا ہی سے ہوگی ورنہ سب سے پہلے کے بھول
کبھی نہ کھلیں گے۔"

"تو میں کب کہتی ہوں کہ تم اس سے شادی نہ کرو۔ ضرور کرو۔
میں خود اس کو یہ کہہ کر لٹنے پر تیار ہوں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ تم کو سات ہزار
نقد ملنا چاہیے،" میرے آخری جملے پر ماں ہم ہلکے ہوئیں۔

"جب مجھے اس کی بڑا نہیں ہے تو آپ اس قدر اصل رکھیں
کر رہی ہیں؟" میں نے دیکھتے ہی دیکھتے کہا

"میں اس نے امراد کر رہی ہوں کہ سب سے تین لاکھ
ہیں کل ان کے دان چنے کے لئے کہاں سے لے گا؟
ان کی اس منظر پر میں خاموش ہو گیا۔

کسی نے بچہ کہا ہے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میری
اور ماں جان کے درمیان مجھے والی تھی گفتگو کسی دوسری طرح ٹپک
ہو چکی تھی۔ اس کے تارک اور محبت سے دل پر کیا گری ہوگی میں جانتا تھا
لیکن اس نے مجھ سے نہ کہیں کہیں لائی تھی نہ گھر میں کسی بھی نہ دفتر میں
آخر کار میں نے سلطان کو اس کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ شریا بھائی جان
تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لئے ان سے بات نہ کرو۔ جواب میں اس نے
کہا یہاں جا کر اس سے سات ہزار روپوں کے پیرانے کیسے لے سکتی ہوں؟ اس
کے اس جواب پر سلطان نہ تھلا تھلا تھلا بہت کوشش کی لیکن اس نے
مجھ سے نہ بات کرنا تھی نہ کی۔

اس شخص میں اب بالکل صاحب فرس ہو گئے۔ کچھ آراغی کی
پریشانیوں کچھ گھر کے مسائل، کچھ میرا خیال، کچھ میری کی زندگی کا خیال غرض کہ
وہ بستر سے اٹھ کر پھر نہ اٹھ سکے۔ شریا اپنی ماں کے ساتھ آخری بار اپنی
موت پر میرے پاس آئی۔ دہی انداز دی گفتگو وہی ملناری، سلطان کو
گلے لگا کر دیکھ دیتی رہی۔ اس کے بعد جب یہ لوگ رخصت ہوئے گئے تو شریا کی
ماں کو میں نے خدا حافظ کہا۔ انھوں نے میرے سر پر طے پار سے ہاتھ پھیرا
اور کہا "خدا تمہیں زندہ اور خوش رکھے، اپنے بعد تم ہی اس کیسے کے سر پرست ہو
اللہ تمہاری بہنوں کا نیک نصیب کرے اور تم کو جلد ان کا سہرا کھنا نصیب ہو"
ان کے یہ جملے میرے دماغ پر الفاظ کی سیسکوں کی طرح پڑ گئے کہ
گرے۔ اب اگر ہم کے الفاظ کا دل میں گونجے کہ اگر میری کچھ بند بڑھنے تو کیا
وجہ بات اپنی بہنوں کو گھر سے نکال دے گا؟ اور اس کے ساتھ ہی میں پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔

ان کی موت سے ہم کو بڑا زبردست دھچکا لگا۔ آراغی کی مقدار
باری شروع ہوئی میری ناچنے پر کھاری سے گھر کی تمام چیزیں جھٹکا کیوں کی بھینٹ
بڑھ گئی۔ میں نے مجبور ہو کر پہلے سانس کی رہائش ترک کی۔ پھر پانی کی
فروخت کی اور پھر پھر خاندان کی سب سے بڑی۔ آئی۔ لی کاوٹی کے ایک مکان میں
اٹھ آیا۔ اس عرصے میں سلطان برابر شریا سے ملتی رہی۔ اس کو سلطان سے
گہری ہمدردی تھی ہم لوگوں کی حالت پر افسوس تھا۔ البتہ میرے اور اس کے
درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن اس کا دور میرے جانتے
دلے تمام لوگ جانتے تھے کہ ہم دونوں کی شادی ضرور ہوگی اور اگر یہ رشتہ نہ
تو کس قدر بے بسی ہوگی اس کو کوئی لڑکی والوں کے دل سے پوچھے۔ میں جانتا تھا
کہ شریا کے دل میں بھی یہی کاٹنا کٹنا ہے۔ چنانچہ چند روز بعد سلطان نے
پہلوڑی کو شریا کی اور پھر بھی اُمید بندھی کہ شاید ان کے جملے جملے حالات
میں ماں اپنی فوج پر نہیں لیکن تو یہ کہنے انھوں نے جہالت کہہ دیا کہ اب
تو ہمیں دھپلے کی اور بناوہ ضرورت ہے کہ یہ کچھ گھر کے حالات پہلے جیسے ہیں؟
اس ذہنی کشمکش اور الجھن میں میں نے چاہا کہ شریا سے ملوں
کچھ اپنی کہوں کچھ اس کی سنوں چنانچہ سلطان کو پھر اس کے پاس بھیجا اس نے
کہا خدا کے لئے جو شریا سمجھتا ہے تم سے ملنے کے لئے بلاتے ہیں۔ جواب میں وہ
خاموش رہی جب سلطان نے یہ بت کہا تو وہی "میں ان سے مل کر کیا کروں
اس کا فیصلہ تو ان کو کرنا ہے کہ انھیں رو پیہ عزیز ہے یا میں" اپنی بات اپنے
ونسے اور اپنے بیان سے

سلطان اس بات پر تھلا گئی پھر کچھ کہا سنا تو شریا نے میرے
نام پر ہاتھ پھیرا کہ اپنے بھائی سے کہہ کہ مایوس نہ ہوں میں ان سے ایک نہ
ایکے دن ملنے ضرور دوں گی؟

میں جانتا تھا کہ وہ قول کی بجائی اور وعدے کی بجائی ہے کہ گئی
اور ضرور ملے گی۔ لیکن اس کے معاملے میں مجھے اپنی کوتاہی کا احساس تھا میرا
ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں اس طرح اس معاملے کا فیصلہ کیوں
نہیں کرتا لیکن ماں نے جو سب بڑا دکھائے تھے وہ بھی کچھ کم نہ تھے ہر کہیں
اس کو میری جوتی کیے اپنا بڑا داری، کڑوئی کیے بامعور کیوں نے خود کوئی تھا
ایسا دیکھا جس سے ظاہر ہوتا کہ میں بھی باہمت اور باثبات رہی ہوں۔

لیکن ان کی جیتی دوسرے ہی بڑھ گیا تھا بلکہ اب تھا کہ
شریائی کم اور شریا آواز سے کہوں میں گئی جس کو سننے کے لئے میری روج
بے چین تھی اس نے اندر لے کر کی اجازت چاہی۔

"شریائی تم؟" میں نے جیسے اور خوشی سے ہم گلیں چکر کھا۔
"جی ہاں میں۔"

"یہ سات ہزار کی رقم لائی ہوں جس نے اپنی ملازمت کے
ان میں جوڑی تھی یہ میری بی بی تھی اور میری بی بی کا سنا تھا جس کو
میں نے اپنی شریا سے کیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے پانچ پانچ پچھلے چھوہ فوٹوں کی
کان میں سے سانس پھیر کر نکالی۔

"شریائی کیا؟" کیا تم... ماں جان کی خواہش کے مطابق...
"اللب ہے۔ یعنی کہ..." الفاظ کے جس حق میں اب گئے میں نے پانی
کا اس اٹھا کر کچل کر اپنا حلق تر کیا۔ اس نے بڑے غلوں اور اعتماد سے مجھے
دیکھا اور کہا

"ماں کی شرط کے مطابق یہ رقم اگر آپ کے پاس ناخوہ کے لئے ہوئی
اور میرا تو ان کی خدمت میں نہیں کرتیں لیکن یہ تو میں آپ کو دینے کی ہوں تاکہ
آپ اپنے آپ کو دینے کے دل میں خیال نہ کرے کہ کم کم یا یہ مغلص ہیں اور
ماں کی گھر میں بھولی کوری بھی نہیں ہے؟

میں اس کے چاہنے پر میری پوری فوج بھینٹنے پر آمادہ تھا کہ
اس کے جملوں نے میرے سر پر ہرے ہرے شوش و جوش میں چمکے ہیں انھیں
پہلوڑی پر لگا کر بھی اس کو کہنا چاہتا تھا کہ... اتنے میں وہ پھر بولی

"آپ حیران کیوں ہیں اس امر پر تم کو قبول کریں۔ آئیے تو خیر
اپنی رفاقت اور ازدواجی زندگی کی قیمت سات ہزار روپے لگانی تھی لیکن میں
اتنے کا کوئی سودا کرنے نہیں آئی ہوں میرا غلوں انھوں نے میری چاہت
لے لو ہے۔ اس کا مول کا منات بھی نہیں... یہ سرن میری الفت کا تقبیر
نہا ہے؟

"تم کچھ کہتی ہو شریا میں تمہارا گناہ کروں قصور وار ہوں...
بہنیں قدر امت ملاست کرو کہ ہے؟" میں نے اس کے پوسکوں اور باوقار
ہمت کو بغیر روک کر کہا

"اب یہ سب باتیں لاٹھل جی آپ کو یہ تو قبول کرنا پڑے گی؟
اس نے جواب دیا۔

"لیکن... کیوں... کس لئے... میں نے ہم دیوانگی کے عالم میں
لے کر بال بوجھتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ آپ کے گھر کو اب روپے کے پیلے سے بھی زیادہ ضرورت
ہے۔ اگرچہ یہ شادی کا سوال تو اب میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں؟
شریائی تمہارا منہ باندھ جوڑا ہوں خدا کے لئے مجھے کاٹوں میں
بھٹیٹو... ان دونوں کو اٹھاؤ؟

"یہ میرے ہاتھ کا کام ہے۔ مجھ اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہے
انشاء اللہ اس سے زیادہ کمالوں گی۔" اس نے کیا اور وار کیا۔

"میں نہیں نہیں شریا یہ کبھی نہیں ہوگا۔" میں نے سارے فوٹوں پر
اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"کوئی بے کیوں تکلف کرے ہیں۔ میں نے ہنسنے آہستہ سے بے لوث
محبت کی یہ بھی میری بے لوث محبت کا ایک حصہ ہے۔ شاید آپ کے کام کے بڑے
بہنوں کا توازن حافظ ہے لیکن کل سماج کے خیال کو گھر میں آپ کا یہی بہنوں کے
شومردوں کے لئے بھی بولی دینا ہوگی جس کی ابتداء سات ہزار سے ہوتی ہے اس
وقت شاید اس کی ضرورت پڑے؟

اس کے الفاظ پر سب کا فوٹوں میں گرم گرم ہونے لگا جس سے
طرح پڑے۔ رنج نرانی ضمیر پر چوٹ لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ
میں ملنا پھر سید کر لیا ہو۔ انھوں نے نیچے گرا کر ابھی اچھا کیا۔ میں نے نظر اٹھا کر
دیکھا اور ذرا دانتے مک جا بکی تھی۔

"کہاں ہیں شریا خدا کے لئے رک جاؤ؟
" مجھے آواز دے۔" میں آپ کی دنیا سے بہت دور جا رہی ہوں

یہ کہہ کر وہ تیز قدم اٹھائی باہر نکلی اور میں بھی اس کے پیچھے چکا لیکن اس
کی نیکی تیار کوری تھی دیکھتے ہی دیکھتے جاوہ جاوہ میرے پاس گرا پی موٹر
ہوئی تو میں شاید اس کو کچھ دلتا لیکن میں جب کہ نیکی منگو اؤں اور اس میں
بچہ کر جاؤں وہ دُور نکل چکی تھی۔ اس کا تعاقب بیکار تھا۔ تاہم میں اس کے
گھر پہنچا۔ لیکن وہ اُسے رقت لگا ہوا تھا۔ دل دھکے ہو گیا۔ بڑوسیوں سے
پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ گھر خالی کر چکے ہیں۔ میں نے کوچی کی تمام گلیوں کی
خاک چھان لی۔ اس کی تمام لٹنے والیوں سے پوچھا اور تم اتنا معلوم ہوسکا
کہ وہ کراچی چھوڑ چکی ہے۔ ایک امید ہو کہ وہ سہا کے اسٹیشن تک گیا اس کے
دفتر آئے اور جسے وہاں پہنچنے کے دوران میں کئی ایک گاڑیاں گزر چکی تھیں۔
اس کے جانے کے بعد میرا دل دھکے سے اُچاٹ ہو گیا۔ اس کی
رقم اب کمال پورا انتہا سے اس کے پاس محفوظ ہے لیکن دنیا کے بھرے بازار میں
اس لڑکی کو کہاں تلاش کروں مجھے زندگی میں میری آگ میں جلنا پھوڑ گئی۔
میں جانتا ہوں کہ اس جرم کی پاداش مجھے بھگتنا ہوگی۔ میں نے جہاں کہیں
بھی سلطان کی شادی کا خیال کیا جوڑے کی بھی رقم کسی روپ میں
میرے سامنے نہروائی۔

یہ کہہ کر وجہت خاموش ہو گیا اور میں نے نظریں اٹھا کر کچا
دُور افق پر تار بکی پھیل چکی تھی۔





نہیں یہ کون خاص ان خاص بندے ہیں خدا کے جن کی زندگی مجسم ہیں و راحت ہے! یہ فقو اطہر صاحب کے دل میں اُس وقت ضرور گونجا کر جب وہ شہر کے کسی اپنے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی مالیشان کو ٹیپوں کی طرح سے کرتے !

"ایک ہم بد نصیب ہیں کچھ ٹیپوں کی ضروریات کے لیے بھی برسوں تیرتے رہے ہیں۔ محرومیوں کے ہزار بار زخم دل میں چھپائے کبھی زبوری ہونے والی تمناؤں کی آغوش میں چپ چاپ پگھلتے پگھلتے ایک دن اسی خاموشی سے مچاتے ہیں۔ آخر ان لوگوں کی تسلیں اتنی روشن کیوں ہیں خدا!؟ اور ہمارے مقدر کی تاریک اتوں کی کھرب ہوگی؟ اور شک و حسد کے ان جذبات کی بنیاد بھی ایک مکان۔ ایسا فانی گھر جس کی تعمیر کی لازوال خواہش اب تک اپنی تکمیل کو نہیں پہنچی اور حالات دُور دور تک۔ ایسے نظر نہیں آ رہے تھے کہ کبھی وہ کبھی صاحب مکان کیے جا سکیں۔ قیام پاکستان سے قبل وہ اپنی خاندانی حویلی کے مالک تھے جس میں بیک وقت چار خاندان رہا کرتے تھے، اس کے باوجود میرے کمرے متعلق نہیں تھے اور ان میں ہمیشہ ہی نا لگتا رہتا تھا؛ مگر پاکستان بنا تو آزادی اور اسلامی حکومت کی کشش انہیں کراچی کھینچ لائی، کچھ

ایسی دھن سوار ہوئی کہ ساز و سامان سے آراستہ حویلی اور زندگی کے المیہ ان وسکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خالی ہاتھ باہر نکل گئے راستے میں قتل و غارتگری کے اس طوفان سے گزرتا ہوا کہ سوائے اطہر صاحب، ان کی بیوی اور والد کے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ افراطی کا سہارا ان کے زور و جبریت کو انہیں احساس ہوا کہ وہ سرکاری ملازم ہیں، ایک چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں ہیں، اور آمدنی اتنی کم ہے کہ کرایہ لینا کھانا اور مکان کے متعلق صرف سوچا جا سکتا ہے انہیں حائل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا حیرتوں کا حصول اگر ممکن ہے تو صرف خواب میں، لیکن انسان کو اُمید مری نہیں ہونا چاہیے وہ دل میں ضرور کہیں گے کہ جب ہم اپنی حویلی جیسی شاندار کشتی میں آرام و سکون سے رہیں گے!! وہ دل کو ڈھارس دیتے ہیں۔

سات تار بیلان کا ایک قریبی دوست حسین الدین بھارت سے آیا تو اُس نے پانچ ہزار روپے بچائے کہہ کر..... میں تمہاری حویلی فروخت کر آیا ہوں یہ اُس کی قیمت ہے! ان کی رُوح سرست سے سرشار ہو گئی۔ اب یہ بھی ایک شاندار مکان کے مالک بن سکتے ہیں! شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں وہ زمین بھی پسند کر گئے۔

وہ کچھ قریب آگئے تھے جب وہ اپنے خوابوں کی تعمیر کو ایک شاندار مکان کی صورت میں اپنے سامنے کھڑا دیکھیں گے۔ دُری فائلوں میں دماغ مری کے بعد دو گھڑی مساتانے کے لئے مری کی پشت پر سر ہکا کر انہیں منہ دے تو وہی ایک فخریاتی خوبصورت عمارت آنکھوں کے سامنے جلوہ آ رہی تھی۔ چمکا چمکا فوش! اوچی اوچی مینیوٹا دیواریں۔ سرخ و سفید والے دروازے۔ بیٹھے کی جگہ کی کھڑکیاں! کون ستونوں سے لپٹی عشق پیچاں کی چمکتی بلیوں، نظر توڑ پھولوں سے مکتا ہوا وسیع لان! اتنی گشت جس کے ایک جانب نمایاں طور پر آویزاں ان کے نام کی تختی۔

اگلے دن انہیں رقم کی ادائیگی کرنی تھی۔ رات کو انہوں نے زمین کی خریداری پر بیگم سے بات چیت کی۔ مگر بیگم کا جواب یہ تھا کہ پڑا لاکھ کوئی چورائہ نہائی خاموشی سے منہ دتا کہ لا لاکھ ڈکڑھی کپڑے اور رقم کے زور چوگا ہے۔ بیگم واپس مار مار کر رو پڑیں اور اطہر صاحب پر تو جیسے سناٹا طاری ہو گیا۔ محسوس ہوا کہ پورا شہر اس چوری کے ساتھ مل کر انہیں ایسی زندگی بھی تم ہو گئی ہو..... مگر نہیں مجھے بہت نہیں پانی چاہیے۔ اس بار اگر مکان نہ مل سکا تو کیا ہوا! خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے وہ ضرور مری مدد کرے گا۔ آئندہ حالات یقیناً ایسے ہوں گے کہ

گھر بناؤ اخراجات سے ہم کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے زمین خریدیں گا اور عمارت کبھی کبھی ضرور بن جائے گی۔ مگر سالانہ ترقی اتنی کم تھی کہ کجیت کے منتقلی سوچنا چنتا آسان تھا عمل کرنا اتنا ہی مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی بڑھتے جاتے تھے۔ اب وہ دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کے باپ تھے۔ فوری نفی اور گنتہ اسکول میں پڑھنے لگے تھے۔ غنی اور گدھی ابھی چھوٹے تھے۔ باپ کی کاغذات ہو تو اطہر صاحب خود کو اور بھی تنہا اور بے بس سمجھنے لگے۔ اور اخراجات اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ مکان کی تعمیر کا خیال کبھی کبھار تو انہیں اعتماد معلوم ہونے لگتا۔ مگر وہ کیا کرتے! حالات کی ناساگر ہی کے باوجود ان کے دل میں ایک مکان کی آمد پر لہو جواں ہو رہی تھی۔ یہ آرزو اُس بیٹے کی طرح ساحل تک پہنچنے کے لئے بیکار تھی جس کے اعلان طوفانی موجیں غضبناک ہو کر اُسے غرقاب کرنے کے لئے اٹھتی ہیں۔ کبھی کبھار تو اُمید کا یہ عالم ہوتا کہ اطہر صاحب حالات سے بھرتہ کر لیتے ہیں میں عانت سمجھنے لگتے..... یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ ہم ذاتی مکان کے مالک بن سکیں! مگر یہ آرزو تو ان کی زندگی سے وابستہ تھی۔ وہ فوراً ہی سبھل کر اٹھتے۔ نہیں یہ آرزو زندہ رہے گی میری جد جہد ختم نہیں ہوگی۔ دل کے کسی گوشے میں اُمید کی ایک کرن بھی باقی ہے تو جالبے مسکرائیں گے..... کبھی نہ کبھی ضرور سہل کی تمنا پوری ہوگی!

کچھ وقت گزرا تو قسمت نے ایک ایسے دور کا آغاز کیا جو پہلے کی نسبت روشن تھا۔ اب کچھ رقم پس انداز کی جا سکتی تھی۔ بیس ہزار کی رقم اگر کجیت مل جائے تب کام بن سکتا ہے کسی نے مشورہ دیا کہ رقم بیکسر ڈریجے حاصل ہو سکتی ہے۔ اب نہیں پندرہ سال بعد اور اطہر صاحب سوچا پندرہ سال بعد ہی سہی، مکان تو اپنا ہوگا! کچھ چلے انہوں نے کاغذات کی خانہ پرچی کتنی کی ہے تو بس ہی ان میں ہزاروں لکھ پڑے پڑے!..... اپنا بیت کا کیا انوں احساس ابھرتا ہوگا اپنے گھر کو دیکھ کر۔ کیسا لذت آگس سکون ملے گا جو اپنے درویدار کو بھوکے۔ اپنی دیواروں سے چٹ چٹ کر بے اختیار انہیں موند لیتے کوئی چاہتا ہوگا! اگلی ہوئی سڑکوں پر۔ Work in Progress کا بورڈ اور پیسے میں مڑا ہوا مزدوروں کو منہ مشق سامان لائے لہجائے، کھلائی کرتے دیکھ کر انوں نے ہزار بار سوچا کہ ایسی ہی زندگی سے کبھی یہ لوگ بیسٹر مکان کی بنیادیں کھودیں گے! اکاش وہ وقت چلے گئے۔

اطہر صاحب بڑی بیکاری سے اُس روز کے منتظر تھے کہ جب



افغان کے پیچھے مت بھاگو بلکہ خیالات کو کاٹ کر دھجبا خیالات کا جہم ہوگا رات کا غور نہ چلے آئیں گے۔

* ہر وقت کی سوچ بھیاں کچھ اختیار کر لیتی ہے۔ لہذا ہر وقت سچا چھوڑ دیں۔

* کسی کو اپنا کنبے سے پہلے سوچ کر لے۔ اپنا نیت کا سہرا پر احساس دلا سکو گے؟

* اپنے گرد سے بڑا لڑکی کا پردہ چاک کر دیں کیونکہ یہ پردہ ہر لحاظ سے آپ کی شخصیت کی نشوونما میں رکاوٹ ہے۔

* وہم و گماری سے جس کی بنا پر محض خیالات اور تصورات پر مبنی ہے۔ اس لئے وہم کو قریب نہ آنے دیں۔

* بوجہ کی مضبوط دیوار لگائی جاسکتی ہے مگر بلند کردار کی دیوار کی تعمیر ناممکن ہے۔

* کسی کی بدکرداری سے وقت اس کی طرف سے آنکھیں پیر کرنا کہ اس کی شرم کو پرہیز زدگیہ سکھو۔

* آؤ لڑائی بٹنے سے بہتر ہے کہ خود کو اس قابل بنائیں کہ لوگ آپ کے آؤ لڑائی میں۔

* آئینہ لگوانے سے بہتر ہے کہ خود پر ہستے گلوں کا آئینہ بن جائیں کہ کویشش کریں۔

* اپنے ہنر کے لئے ہر دور میں کی خوشیوں کا تاج گل بنانا انسانیت کی عمارت ہے۔

* یہی تہذیب مغرب آج ہم جس کے پیچھے ہیں کل ہماری راہ میں یقیناً سنگ گراں بن جائے گی۔ لہذا جانک ہو سکے اس کی بجائے۔

جب وہ پیشین کی رقم کا چیک لیکر آئے تو مئی کے اگلے برساتے موسم اور سخت قہش میں بھی انھیں بخند کی ٹھنڈی ہوا لاس چھوڑا۔ غور ہوا تھا۔ خوشی سے ان کی آنکھیں کھلی جا رہی تھیں۔ دروازہ کھول کر وہ گھر میں داخل ہوئے تو سانسے ہی لگڑی نظر آئی جو بڑے سلیقے سے دوپٹا اوڑھے جائے بنا رہی تھی۔

”کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بیٹی! انھوں نے سوچا اور پھر اچانک ہی گلا سی کا سراپا ایک زیورات سے لدی بھندری زرتار کے کپڑوں میں بیٹوں دہن کا رُپ اختیار کر گیا۔ باہر مہانوں سے بھرے شامیائے جویر کا لمبا چوڑا اسامان۔ گویا ابھی یہ ذمہ داری باقی ہے!!۔ اظہر من الشمس کہ روئے دل بٹے کر بنا کا انداز سے دھوکا رہا تھا۔ وہ بیٹے میں نہا گئے۔ ہاں نفی کی ذات سے تو کوئی امید نہیں!!۔ تب انھوں نے دیکھا وہ خرابیوں میں چھٹکا دکھتا عالیشان مکان جس کے گھر کے کمرے کی طرح بچ گیا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ٹوٹ پھوٹ رہی تھی! دل کی کڑی کڑی جوا جابا رہا تھا۔ وہ غیظ و خروش سے ساحل کی آندھ میں ہلکتا پھر رہا تھا۔ ایک بار پھر طوفانی موجوں کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی امید نہیں۔ کوئی آس نہیں... کوئی سہارا نہیں!!

انھوں نے ڈوہڑے دل کے ساتھ سوچا۔ سفید غرق ہو چکا تھا۔ اور اب ساحل کی تمنا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ ایک طویل سرد راہ ان کے لبوں سے پھسلی اور وہ بے دم ہو کر پلنگ پر گر چڑھے۔

رات کو خواب میں انھوں نے اپنا مکان دیکھا جس کے گول ستون تھے۔ چمکا کر دیکھا۔ اونچی اونچی سبز نیلی گلاب دیواروں والے کمرے وسیع برآمدہ کشادہ صحن اور طویل و عریض لان جس میں رنگارنگ بچپول مسکرا رہے تھے۔

”جسٹ بھولی ہوئی سی... جب اس کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“

کاش نفی اپنی ذمہ داریوں کو بھانپنا۔ سماشی جلیب میں تھوڑی سی مدد دیتا تو سائن اس طرح اچھوٹا کھڑکے ان کی جان کا وبال نہ بنتے۔ مگر قسمت کے نیچے کو کون شکا سکتا ہے؟ اس لالائی کے متعلق تو کچھ سوچنا ہی فضول ہے۔ اظہر من الشمس کہ اب ان میں سفید گریں دیں بدن بختی جارہی تھیں اور اس کے ساتھ مکان کی آرزو بھی شدید سے شدید تر ہونے لگی تھی۔ اب اخراج کے طوفانی دھاؤں کا زور کہڑ گیا تھا اور وہ خاصے مطمئن تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اب ساحل کے مناشی سینے سے کوا کی منزل ضرور مل جائے گی۔

اور پھر ایک روز پھر خوشخبری بھی انھوں نے سُن ہی لی کہ اپنی بیٹی کی رقم قلم بدل جائے گی۔ سوچو دھانا میں پانی پر لگیا۔ اپنے ذاتی مکان کا قصور متاثر نہ ہونے کے ساتھ انھوں کے سامنے جگہ لگنا اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب وہ اپنے مکان میں رہیں گے۔ اپنے ذاتی مکان میں! کسی زیر تعمیر مکان کی بجائے بلند ہوئی دیواروں کے دل میں آگ نہ لگا سکیں گی! اب وہ سادہ و معروہ کی لگھاؤ مندرجہ ہو جائے گا۔ کتنے سالوں بعد یہ تمنا پوری ہو رہی ہے۔ خوشی سے ان کا دل جھوم رہا تھا۔

بہتر گری کیا ہے؟ انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔... رات بھر وہ کیا سوچتے رہے تھے۔ سیرنگ کی لڑکی کی خبر لاری ہوئی۔... رڈی مائی بھری کے ٹرک بھر کر آئیں گے۔ بوجہ کے بلے بے سربے ڈھورے پھیلے ہوں گے۔ مضبوط بانوؤں اور توانا جھولنے والے مزدور اپنی بھاری اوتیری سے سیرنگ کی پراٹوں کا زبردستی ٹوٹے رہیں گے۔ بیلادوں کی کھدائی وہ خود سامنے کھپے ہو کر کرانیں گے۔ پھر دیواروں کی چٹائی شروع ہوگئی جو گھر پر لپکتی ہوئی جاؤں گی۔... اونچی۔... اور اونچی۔... یہاں تک کہ ایک روز دیواروں پر جھٹ پڑے گی۔ رنگین ٹائلوں کا فرش بے گار۔ زیر تعمیر مکان دکھائے وہ کبھی بچھا رہنے دوست احباب کو کیا کریں گے۔ فخر سے ان کا سراپا بچا جھوٹا پسنا گھرنے دکھ کر۔... اپنی فمت۔... اپنا بھل۔!! وہ تو جھوم جھوم چلا کریں گے اسے دیکھ کر انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس وقت جو مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھرے گی وہ ایک طویل مدت کے بعد پہلی بار ہی ابھرے گی۔ اتنی بڑی کامیابی کبھی پہلے نصیب بھی تو نہیں ہوئی تھی! مگر اس وقت بچہ کی ایک بات سُن کر وہ مکان میں بے چارہ جھلکا وہ اس کی جگہ بے جھوٹے شامیائے دیکھتے تھے جس کے اندر ان کی دو جوان بیٹیوں کی مانگ کی آفتاب بھری ہوئی تھی اور اظہر من الشمس کہ انھیں جاننا تھے

”اسے بولنے ناچھ۔... آپ تو خاوش ہو گئے؟“ بچہ نے جھنجھوڑا تو وہ ہنسنے لگا۔

”بیٹیوں کی شادی کرنا والدین کا مقدس فریضہ ہے۔ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کسی اور کی نہیں!“ بچہ نے انھیں بھلیا۔ اور اظہر من الشمس کہ جواب دینا ہی پڑا۔ ”اس عید پر دونوں کی شادی کر دی جائے گی“ ٹھیک ہے نا! آپ اس میں تیار کی جاسکتے ہیں؟“ مدغم آواز میں کہتے ہوئے انھوں نے چیک بچہ کو تھمادیا۔

اپنے کمرے میں آکر کسی سے کچھ نہ کہنا تو بچہ کھانا بچھا اذہر ا ٹوٹ کر رہے لگا۔ آنکھیں آپ ہی آپ نم ہو گئیں۔ ”امیدوں کی یہ پامانی! بیسے خدا! کیا مکان کی آرزو کبھی پوری نہ ہوگی؟ کیا اس کشتی کو کبھی ساحل نہ ملے گا؟ کیا اس خواب کی کوئی تعبیر نہیں؟؟ اگر ایسا تھا تو یہ تمنا میرے دل میں بیدار کیوں ہوئی تھی؟ کیا اس لئے کہ امید وہیم کی کشش موت کی دھندل دیواروں کے مابین پھانسیا چھوٹے گی۔ بیسے خدا! کیوں ہے یہ حرام فیضی؟؟۔ وہ مضطرب ہوا کھٹے۔ مگر نہیں! ابھی تو ایک سہارا ہے، پیشین کی رقم ملے گی۔ ایک تازہ خیال دل کی مہمانی ہوئی گئی کو زندگی بچے گیا۔ اس کے بعد کوئی بڑا آخر پر بھی نہیں ہے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی کا بندوبست ہو رہی گیا ہے۔ تیسری بیٹی ابھی بہت چھوٹی

بیمہ کی رقم واجب الاطاعت ہونے والی تھی۔ مکان کی تعمیر کے ساتھ ہی ان کی نفیس زندگی کی دیگر ضروریات سے آشناء بھی تھیں۔ فوریہ و نیوٹرٹی میں تھی اور شگفتہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ لڑکیوں کی شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ جہاں لڑکیوں کی جوانی والدین کے کاغذوں پر اخراجات کا بائراں لے کر آتی ہے وہیں لڑکیوں کی جوانی، اطمینان و مسرت کی فوید لیکر آتی ہے۔ مگر اس کا کیا کئے کوئی گھر کے لیے لڑکیوں کی صحبت میں بڑا کر رہے سے سبک گیا تھا۔ دسویں کلاس میں تین سال تک نہیں ہونے کے بعد وہ بڑوں پر آوارہ گردی کرتا پھرنا لے باپ کی شکلات ماں کی آرزوؤں اور بہنوں کی تمناؤں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اُسے تو مرن ماں باپ سے رو پوکر مٹا کر نا تھا۔ غمی اور لگڑی اسکول میں آگئے تھے۔ اُسے والے اخراجات کے متعلق وہ جب بھی غور کرتے بیٹھے تو مکان کی تعمیر دھندلا کر ڈھاتی۔ اُس لمحہ ان کا دل ڈوبنے لگتا۔ ”ایسا نہیں ہونا چاہیے معبود!“ وہ اگر زندہ تھے تو شاید صحن مکان کے لئے۔ دوسری ضروریات کو اس ایک آرزو سے ٹکراتے وہ دیکھ نہیں سکتے تھے وہ مریض کھڑے ہو جاتے! جب رقم ملے گی تبھی دیکھا جائے گا۔“

تاریک راتوں کی آفتاب سے مسکراتے ہوئے سورج نودار ہوتے تھے۔ اظہر من الشمس کہ شامیائے آخر تمام ہوئی۔ اڈاس میڈیڈ نے آنکھیں کھولیں جس کے لئے وہ ایک غرتے سے تھے۔ جس ہزار روپے کا چیک جیب میں ڈال دے وہ سرکھٹے ہوئے بچہ کے سامنے کھڑے تھے۔ امداد یہ تھا کہ بچہ کے مکان کے نقشے کے باسے میں مشورہ کریں۔ مکان میں کتنے کمرے ہوں گے، صحن کتنا بڑا ہوگا اور بیٹی کی جانب سے کتنے نقش و نگار بنائے جائیں گے۔ بچہ بچہ میں ہزار کا مٹن کر خوشی سے جھوم اٹھی تھیں مگر ان کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

”ہاں سنئے۔ میرا خیال ہے کہ اب شگفتہ اور فوریہ کی شادی بھی ہو جائے چاہیے!“ اظہر من الشمس کہ وہ پرتھوٹے برس گئے۔ مگر بچہ کی دُمن میں بکری تھیں۔ ”اسد بہت اچھا لگا ہے۔ کتنے کو دولت مند باپ کا بیٹا ہے مگر غور و نام کو نہیں۔ فوریہ تو ہماری میٹھ کر گئی مگر شگفتہ کے لئے بھی کئی رشتے ہیں۔ اناشہ رائے لڑکیوں کی قسمت بڑی اچھی ہے۔ دولت میں کیلیں گی۔ مگر اپنے گھروں میں رشتہ کرنے کے لئے ہیں بھی اپنی ناک اونچی رکھنا پڑے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو لڑکے والے ہندوؤں کے ماں باپ سے لڑکیوں کو خانی ہاتھ لکھ کر نکال دیا؟“

”یہ وہی صورت حال ہے اظہر من الشمس کہ ان کے تصور سے اپنے

”ہاں میرے چندا کے لئے ڈھیر ساری چیزیں آئیں گی“
عاشی نے اُسے پیار کرتے ہوئے جواب دیا
”اور اتنی میرے لئے“ رومی نے منہ لیوا ”کیا اتنو
میرے لئے کچھ نہیں لائیں گے؟“
”دونوں کے لئے لائیں گے بھئی“ اشرف صاحب نے
نستے رومی کو گود میں اٹھالیا۔

اسی وقت ہارن بجا۔ انور گرج سے کار نکال لایا تھا
اشرف صاحب نے رونی کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ تو آواز سنتے ہی
اچھلا کودنا بھر بھاگ چکا تھا۔ عاشی بھی برآمدے میں آگئی دونوں بچے
اور اشرف صاحب کچھلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ انور نے مکر لائے
ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ عاشی نے
ایک گہری سانس لی۔ کار کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس
کا انتظار شروع ہو چکا تھا۔ عاشی کی بیچینی اسے کسی جگہ سکون
سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک کمرے میں جھانک رہی
کچھ دیر کے لئے اپنی ماں کے پاس بھی آکر بیٹھی مگر فوراً ہی
اٹھی اور برآمدے میں آکر ٹہلنے لگی۔ ایک ایک بل ٹرکھن گزریا
تھا۔ وہ چیراں تھی کچھارساں کی طویل مدت اس نے کیسے کاٹ
لی اس قدر بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے اس نے کچھ جھٹاکر
اپنے آپ سے کہا گھر میں چل کر بیٹھو۔ آخر وہ کہیں اور تو جانے
سے رہے سیر ہے یہیں آئیں گے۔

لیکن اپنے کمرے میں بند رہ مٹ بڑی مشکل سے
کاٹنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر برآمدے کی طرف چل دی۔ اس کی
نظروں گرٹ کی جانب اٹھی ہوئی تھیں اور پھر جیسے اس کا دل
اچھل کر صحن میں آ رہا۔ کار گیٹ میں داخل ہو رہی تھی جی تو چاہا
کبھاگ کر کار کے پاس پہنچ جائے مگر چاب نے قدم روک لئے
وہ جلدی سے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ اور وہیں
سے جھانک کر دیکھنے لگی پہلے انور۔ اس کا بھائی۔ نیچے اٹرا پھر اس
نے کچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے رومی اور رونی کو اترنے
میں مدد دی۔ عاشی کی نظریں بتابی سے کاشف کی منتظر تھیں۔ ہاں
نے بچوں کے مچھائے ہوئے چہرے نہیں دیکھے۔ اللہ۔ اب اتربی
چکے۔ اس نے دل ہی دل میں کاشف کو مخاطب کیا۔ انور سہارا
دیجیو اس کے آبا جان کو اتار رہا تھا۔ پھر وہ سب کسی اور کے
اترنے کا انتظار رکے بغیر بیٹھوں کی طرف چلے گئے۔۔۔۔۔ یہ کیا

دیتے دیکھا ان کے جواب میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس کی ہری
وہیں بیٹھوں پر سر پھڑک کر بیٹھ گئیں بچوں کا بار جو وہ کاشف
کے گلے میں ڈالنے کے لئے لائی تھیں ان کے ہاتھ سے پھوٹ کر
زمین پر گر پڑا۔ اب عاشی سے ضبط نہیں ہو سکا۔ وہ دیوانہ وار
آگے بڑھی۔
”کیا بات ہے امی“ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں

.... عاشی کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس
کیا کہ وہ سب سر پھڑکے بڑے بوجھل قدموں سے آگے بڑھ
رہے ہیں۔ کیا کاشف نہیں آئے۔ عاشی ہنسی گئی۔ اتنی دیر
میں اس کی امی جو کار کی آواز سن کر برآمدے میں آگئی تھیں
تیزی سے چلتی ہوئی ان لوگوں کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ عاشی
نے انہیں انور سے کچھ کہتے اور پھر اپنے آبا جان کو اس کا جواب



سلی رضوی

عاشقِ بی بی

کمرے کے باہر سے مسز اشرف کی
آواز آئی ”جلدی سے تیار ہو جاؤ
دیر ہو رہی ہے“

”اچھا امی“ اس نے جلدی جلدی رونی کے بال
سنوارتے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے کمرے سے
باہر آ گئی۔ وہ آج بہت خوش تھی۔ وفور مسرت سے دیوانی
ہوئی جا رہی تھی۔ آج کاشف آئے تھے۔ پورے چار سال کے
بعد وہ بار بار رومی اور رونی کو پیار کر رہی اور محبت سے سمجھاتی
دیکھ کر بڑے خراب مت کرنا۔ آپس میں لڑنا بھی نہیں۔ ورنہ آبا جان
ہوجا میں گئے۔ اچھا لائی۔ وہ دونوں سر ہلا کر وعدہ کرتے انہیں بھی
اپنے آبا کا بڑی بیچینی سے انتظار تھا۔

”تیار ہو گئیں بیٹی“ اشرف صاحب نے قریب آتے
ہوئے کہا اور اسے برقعہ کے بغیر دیکھ کر چونکے ”آئیں کیا تم نہیں
چل رہی ہمارے پورٹ“
”آپ جانیے آبا جان۔ میں... میں نہیں انتظار کر رہی“
عاشی کہتے کہتے شرمائی۔

”اچھا۔ اچھا بیٹی تمہاری خوشی“ اشرف صاحب نے
مسکراتے ہوئے سر ہلایا ”بچوں کو لے جاؤں؟“
”جی ہاں۔ یہ تو ضرور جائیں گے۔ جمع سے خد کر رہے ہیں“
”امی جان۔ ابو میرے لئے بہت سے کھلونے اور ڈانیاں
لائیں گے“ رونی نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا

نے نکلا۔ آپ سب خاموش اور اداس کیوں ہیں۔ خدا نخواستہ انہیں۔۔۔ عاشی کی آواز بھر گئی اور وہ اپنا فوکل نہیں کر سکی۔
 ”گھر آؤ نہیں بیٹی، مسز اشرف نے سنبھلے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ بیٹی کچھ بڑھ چکی ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ وہ اسے اشرف صاحب کے کمرے میں لے گئیں۔ اور بچوں کو بلا لے ہوئے کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اشرف صاحب بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ عاشی نے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”ابا جان کچھ تو بتائیے۔ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“ اور روئی کی آنکھیں آنسوؤں سے چھنی ہوئی کیوں تھیں۔ کہیں کاشف کے جہاز کو کوئی حادثہ۔۔۔ عاشی سکیاں لینے لگی۔
 ”نہیں بیٹی،“ اشرف صاحب بھاری آواز سے بولے ”خدا نخواستہ اس کی کوئی بات نہیں ہے۔ کاشف پہنچ گیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اپنی بہن قریب کے گھر گیا ہے۔“

عاشی کا دل کچھ ٹھہرا۔ مگر بات اب بھی ابھی ہوئی تھی کاشف یہاں آنے کے بجائے تیسارے گھر کیوں گئے اور چلی گئے تھے تو اس میں اتنا اداس اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ نہیں کوئی اور ہی بات ہے۔ کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی تھی نے نظر اٹھا کر دیکھا روئی اور روئی منہ بھرتے چلے آئے تھے اور ان کے پیچھے تھک رہے دو دنوں سیدھے عاشی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔
 ”ای بیوٹے تو ہم سے بات بھی نہیں کی“ روئی نے شکایت کی۔ ”نہانیاں دہیں دکھلوئے۔ بس آنتی کے ساتھ چلے گئے۔“

روئی نے ٹھٹکا شروع کر دیا تھا۔ اشرف صاحب نے اُسے گود میں اٹھایا۔

”تمہیں جتنے کھلونے اور ٹانیاں چاہیں وہ سب میں لاد دینا میں سے کچھ“ انہوں نے روئی کے سر پر ہاتھ پیرتے ہوئے کہا اور پھر عاشی کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے چچانے سے کوئی فائدہ نہیں بیٹی تمہیں آج نہیں توکل کسی اور سے۔ بات حلوم ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہماری زبان سے ہی سن لو۔ کاشف نے دوسری شادی کر لی ہے اور وہ اپنی بیوی اور بچی کو ساتھ لے کر آیا ہے۔“

عاشی پر جیسے بجلی سی گرجی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کے کانوں نے جو کچھ سنا وہ سچ ہو سکتا ہے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان، بے اختیار اس کے

منہ سے نکل گیا، وہ ایسا نہیں کر سکے۔“

”حقیقت ہے میری بیٹی،“ اشرف صاحب نے گھوگر آواز میں کہا ”تم تو سن رہی ہو۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور یقین نہیں آتا تھا۔ وہ جہاز سے اتر آ۔ اس کی بیوی بچی کو گود میں لئے کچھ پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس وقت تک بھی میں کوئی گمان نہ ہوا۔ ہم نے ہاتھ ہلا کر اس کی طرف توجہ کی۔ وہ قریب آیا۔ اور بیٹی ابینی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے جیسے بھولے سرے تعلق کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر بولا اور تو آپ بھی آئے ہیں اور ایک دم پیچھے کی جانب گھومتے ہوئے کہا ان سے ملنے سے ہیں میری بیوی ٹینڈ۔ آپ کو ہمارا خط تو لی بیٹی گیا ہو گا۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ مجھے خواب میں بھی توقع نہیں تھی کہ کاشف نہ صرف دوسری شادی کرے گا۔ بلکہ اس نصابی کے ساتھ اس کا بھٹہ سے تعارف بھی کر لے گا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اس کے بچہ پر ایک پیچھے رسید کر دیں لیکن میں نے خود کو بھٹالا اور صرف اتنا کہہ رکھا کاشف میں تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ ایک لمحے کے اس کے چہرے پر حسرت ظاہر ہوئی جیسے اس کے نزدیک میرا رد عمل بڑا غیر متوقع تھا۔ مگر پھر وہ پوری بے شرمی سے مکر لے گا۔ اس سے زیادہ دیکھنے اور سننے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی میں واپس آکر کار میں بیٹھ گیا۔ اور وہ تڑپا اور زور کے ساتھ چلا۔ اس گدگد سے آتما بھی نہیں ہوسکا کہ اپنے بچوں کو گود میں اٹھ کر پکارتا۔“ عاشی یہ سب کچھ سن رہی تھی اور چپ چاپ آنسو بہاتی جا رہی تھی۔

”آنسو تو بچہ ڈالو عاشی،“ اشرف صاحب نے منہ پر ہوجہ میں کہا ”روئے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ اگر کاشف کو تمہاری پرواہ نہیں رہی تو اب تمہیں بھی اس پر غور کرنا ہے کہ تم اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہو۔ تمہاری کسی بات سے اسے یہ فائدہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری شادی کر کے اس نے تم سے کچھ چھین لیا ہے تمہاری جیت اس میں ہے کہ خود اُسے یہ احساس ہو جائے کہ وہ کیا کچھ کھو بیٹھا ہے۔ بہرہ صفت کے بعد راحت ہوتی ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ صبر و شکر کے ساتھ اس حد تک صبر و برداشت کرو۔ شاید اس میں بھی کوئی بہتری ہو۔ اب اٹھو۔ اپنے معصوم بچوں کو سنبھالو۔ ان کی بچی کرو اپنے لئے نہیں تو ان کی خاطر تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ نگرہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ لٹاؤ ضرور کروں گا۔“

عاشی نے دوپٹے کے انچوں سے آنکھیں خشک کر لیں
 دفعتاً اسے کچھ خیال آیا۔

”مگر وہ کس خط کی بات کر رہے تھے ابا جان میں تو گزشتہ ماہ سے کوئی خط نہیں ملا۔“ اس نے پوچھا۔ ”صرف تاری ملا تھا جس میں انہوں نے اپنے اکیلے تاریخ کی اطلاع دی تھی۔“ خط بھی جانا تو کیا ہوتا بیٹی، اشرف صاحب نے جواب دیا۔ ”غالبا اس نے اس خط میں اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہو گا۔ اور اس حرکت کا کوئی عذر رنگ پیش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“

عاشی روئی اور روئی کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ بچوں کو لٹک دے کر بہلا دیا اور خود چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی اس کی آنکھوں میں ابھی تک یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں ہو گیا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ کاشف تم نے کیا کیا مجھ سے مل گیا تھا تو جتنے تو تمہارے اپنے تھے تم نے ان معصوموں کا دل کیوں توڑا۔ انہوں نے تمہارا کیا کیا کیا تھا۔ آخر چاہا کہ یہ کیسا اتفاق تمہاری طبیعت میں آیا ہے۔ تم پہلے تو کبھی ایسے نہیں تھے۔ سوچتے سوچتے عاشی کا ذہن ماضی کی حین یادوں میں جھانکنے لگا۔ اور کاشف بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ ان دنوں میں کتنی قدرتی تھی وہ۔ کتنے تھم تھم مزاح تھے کاشف۔ وہ اس کی ہر ضرورت کو یادداشت کر لیا کرتے تھے بچپن سے جوانی تک ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا شادی کے بعد بھی دو سال بڑے سکون سے گزرے روئی کی پیدائش سے تو کاشف بہت ہی خوش ہوئے تھے لیکن روئی ابھی سال بھر کا ہوا تھا کہ اچانک ہی اس کے ابا جان نے کاشف کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ بھیجنے کی ٹھان لی۔ مگر تنگ کی مدت چار سال تھی۔ سب ہی نے اس خیال کی مخالفت کی مگر وہ کہاں سامنے والے تھے۔

”میں جانتی ہوں لڑکے کو اتنی دور بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس کی اُمی نے کہا تھا۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

”تم سمجھتی نہیں ہو۔ میں کاشف کے دل میں یہ احساس پیدا کرنا نہیں چاہتا کہ وہ اپنے اہل و عیال کی نگہداشت کے لئے ہمارا دست گرد رہے۔ ہر مجبور ہے۔ یہ چیز اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو

اپنی خدا داد صلاحیتوں سے کام لے اور ترقی کے راستے میں ہم سے بھی آگے بڑھ جائے۔ یہ نہ صرف اس کے لئے بلکہ ہماری عاشی کے مستقبل کی بہتری کے لئے بھی سچا ضروری ہے۔“

”لیکن ابا جان۔۔۔“ انور نے بھی کچھ کہنا چاہا۔ ”لیکن لیکن کچھ نہیں۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ ابا جان نے بات کاٹ دی، اور کاشف کی طرف دیکھ کر بولے ”بیٹے تم تیاری کرو۔ میں چاہوں تو عاشی کو بھی تمہارے ساتھ بھیج سکتا ہوں مگر بیوی بچوں کی موجودگی میں تم بڑھائی پر مناسب توبہ نہیں دے سکو گے اس لئے تمہارا ساتھ ماننا بہتر ہے۔“

”جی بہت اچھا،“ کاشف نے سعادت مندی سے جواب دیا اور اگلے کمرے سے باہر چلے گئے۔
 ”میں کہتی ہوں اگر اسے بھیج دیں تو ہوتا تھا بھیجنا کسی طرح مناسب نہیں۔“ نوجوان لڑکا بے جھجک بھی سکتا ہے۔

”چپ رہو جی۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔“
 ”میں پھر کہتی ہوں۔ اتنی طویل مدت کے لئے لڑکے کو ایسا بھیجنا ٹھیک نہیں خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔“
 ”وہ بچہ نہیں ہے عقل دشوار کا لک ہے۔“
 ”میرا تو دل چاہتا ہے۔“ اُمی پھر بھی چپ نہ رہیں۔
 ”تم اپنی منطق رہنے دو۔ میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں ابا جان نے گویا مزید بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

دوسری طائفہ کاشف بھی عاشی سے جمل ہونے کے خیال سے افسردہ تھا۔ اپنے والدین صاحب کے انتقال کے بعد وہ اشرف صاحب کی سرپرستی میں ہی آ گیا تھا جو اس کے والد کے بہترین دوست تھے اور کاشف کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ خود کاشف بھی انہیں اپنے مرحوم والد کی جگہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ ایک طائفہ عاشی کی محبت دوسری طائفہ اس گھر سے دور ہونے کا احساس جہاں اُس نے بچپن سے جوانی تک کا گھر گزارا تھا اسے کافی پریشان کر رہا تھا۔

”کیا میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔“ عاشی نے اس سے کہا۔ ”آپ تو مرد ہیں اپنی مصروفیات میں شاید آپ کو میری یاد بھی نہ آئے مگر میں چار سال آپ کے بغیر کیسے کاٹ سکتی؟“
 ”میں تو خود نہیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا مگر ابا جان

کسی طرح اجازت نہیں دیں گے؟

وہ جانتی تھی کہ کاشف ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں چنانچہ خاموش ہو گئی۔ یوں کاشف نے اس کی تسلی کے لئے بہت سی باتیں کیں۔ روزانہ خط لکھنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ لندن میں بھی برات کو اس کی تصویر اپنے نیکے کے نیچے رکھ کر سوئے گا۔ اس امیدیں کشادہ خواب میں اس کی صورت دیکھنے کو مل جائے۔ اور یہ کہ ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی انگلیزن میں نہیں ٹھہرے گا۔ اور پھر وہ دن بھی آگیا جب کاشف کو لندن پر واز کرنا تھا۔ اباجان انہیں پتہ نہیں کیا کیا سمجھاتے رہے اور وہ سر جھکا کر شتہ رہے۔ پھر سب لوگ انہیں الوداع کہتے ایرپورٹ تک گئے۔ وہ جہاز کے پرواز کرنے کے بعد بھی دیر تک فضا میں خالی خالی نگاہوں سے گھورتی رہی۔

اب عاشی کے دو کام تھے۔ رونی کی دیکھ بھال اور کاشف کے خطوط کا جواب دینا۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق جڑی باندی سے خط لکھ رہے تھے۔ وقت گزرا گیا۔ رونی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر کاشف نے لندن سے اس کے اور عاشی کے لئے بڑے پیار سے تحفے بھی بھیجے اور سالگرہ کے چند ماہ بعد رومی بھی آوارہ ہوئے۔ عاشی کی مصروفیت اور بڑھ گئی۔ کاشف کے خطوط اسی طرح آتے رہے۔ چار سال پہلے ایک پہاڑ جیسی مدت معلوم ہوتی تھی کسی کسی طرح بیت ہی گئی رونی مائے پانچ سال اور دوسری سو اٹھ سال کا ہو گیا۔ دونوں بچے بہت خوبصورت تھے اور اپنی عمر سے زیادہ ذہین بھی انہیں بھی عاشی کے ساتھ اپنے تو کی دلچسپی کا انتظار رہنے لگا۔ عاشی انہیں کاشف کے خط پڑھ کر سناٹی کاشف کے بھیجے ہوئے نوٹوں دکھاتی اور سب مل کر بڑی بڑی دیر تک کاشف کی باتیں کرتے رہتے۔

آخر اختلاف کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ کاشف پاکستان آگئے۔ مگر جس طرح گئے تھے اس طرح نہیں۔ انہوں نے وہاں چپ چاپ دوسری شادی کر لی۔ اباجان کے غماز کو کتنی چوٹ پہنچی ہوگی۔ یہ تم نے کیا قیامت ڈھالی کاشف یہ تم نے کیا کیا۔ کیا کیا۔ اور عاشی اسی طرح سوچتے۔ آنسو بہاتے۔ نہ معلوم کس وقت نیند کی پرسکون آغوش میں پہنچ گئی۔



دوسرے دن عاشی نے بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد ایک فیصلہ کیا۔ اپنی اور بچوں کی آئندہ زندگی کے لئے کوئی راہ عمل مقرر کرنے سے پہلے اس کا کاشف سے خود ملنا ضروری تھا۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ کاشف نے اس کا اور بچوں کے مستقبل کے لئے کیا طے کیا ہے۔ پھر وہ بھی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آخر اس نے دالے یا نہ دالے کیا اس کو نصیر کیا تھا ان چار برسوں کے اندر اس میں ایسی کیا کمی واقع ہو گئی تھی جس کے لئے کاشف کو کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنا پڑا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ کسی کو اس کا جرم بتائے بغیر سزا دینا کوئی انصاف نہیں ہوتا پھر کاشف نے اس کے ساتھ نہ انصافی کیوں کی۔ گھر سے چلے ہوئے اس نے رونی اور دی کو بھی ساتھ سے لیا۔ اس موقع میں کہ شاید باپ کا پتہ چلے اس مرتبہ انہیں اپنے سامنے دیکھ کر روم ہو جائے لیکن وہ اشرف صاحب کو یا کاشف کی کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس نے یہ بیان کیا کہ وہ حب معمول بچوں کو اس کو سکول چھوڑنے جا رہی ہے۔

لیکن جب وہ تیار کے گھر پہنچی تو وہاں سب لوگ کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ عاشی نے جھانک کر دیکھا۔ منصور۔ کاشف اور ٹیڈ معلوم نہیں کس بات پر ہنس رہے تھے۔

عاشی کاشف کو دیکھ کر چونک سی گئی۔ اکہرے بدن کا کاشف چار سال میں کتنا سندرست ہو گیا تھا۔ اس کی آواز باتیں کرنے اور ہنسنے کا انداز بھی وہ نہیں تھا۔ واقعی وہ بالکل بدل گیا تھا عجیب بات تھی کہ عاشی جو پتہ نہیں گھر سے کیا کیا کچھ کہنے کے ارادے سے نکلتی تھی ایک دم سے یوں محسوس کرنے لگی جیسے اسے اس کاشف سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ یہ کاشف ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں جیسے اس نے ایرپورٹ پر لندن کے لئے الوداع کہا تھا۔ عاشی کو ایسا لگ جیسے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہو۔ آدی کو پاؤں سے گلیا ہوتا ہے۔ اپنوں کی بیوفانی پر اس کا دل کرنا تھا۔ مگر یہ تو کوئی اجنبی ہے۔ اس کاشف سے وہ کیا کہے اور کیوں کہے۔ اسے تو وہ ہی کچھ کرنا چاہیے تھا جس نے اسے کیا۔ عاشی دالیں جالے کے لئے پٹی تو سلٹنے سے تیار آتی ہوئی مل گئی۔ وہ کسی بچوں کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ ارے عاشی بھائی آپ "تیرا ایک دم خوش ہوتے ہوئے بولی" آپ کب آئیں

مگر بہت اچھے موقع پر آئی ہیں " اس نے ڈرائنگ روم کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "منصور صاحب ذرا کمرے سے باہر آکر دیکھئے کون آیا ہے" منصور اور اس کے چچے کاشف اور ٹیڈ بھی ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔ "بس آپ کی کمی کتنی ہے" منصور جھک کر رومی کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولا

"میلو عاشی" کاشف نے بڑی بے اعتنائی کے ساتھ سرسری لہجہ میں کہا "خدا کے لئے آپ تو اس درجے کو ختم کیجئے" ٹیڈ اس سے مخاطب ہوئی "آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ عاشی بھلا "اچھا بس مختصر آپ اپنی زبان بند ہی رکھیں" کاشف نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا اور ٹیڈ کی طرف دیکھ کر کہا "شکر ہے آپ تیار تو ہوئیں اب جلدی تشریف لے چلے جہاز کے آئیں بہت کم وقت رہ گیا ہے"

"آؤ عاشی تم بھی چلو" ٹیڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کہاں" عاشی نے چونک کر پوچھا۔ "ایرپورٹ" ٹیڈ بڑے مزے سے بولی "کیوں۔ آج کون آرہا ہے" عاشی حیران تھی۔ "کوئی نہیں آرہا ہے" کاشف منہ میڑھا کر بولا "کچھ سامان ہے جو ہم نے دوسرے جہاز سے بک کر دیا تھا"

"جی ہاں۔ ایسا سامان جس سے بھائی کو غامی دہشی ہو سکتی ہے" منصور نے جیسے شہی دہانی کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ عاشی کوئی جواب دے سکے ٹیڈ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اس کی کار تک لے گئی۔ کاشف ٹیڈ اور منصور دوسری کار کی طرف بڑھ گئے۔ تو اب جناب کو بڑی کار میں بیٹھنا بھی گوارہ نہیں ہے عاشی نے دل میں کہا مانتا تھا ہی ہے ورنہ شاید میں تو ڈرائیو بھی نہ کر سکتی۔ "میسے خیال سے منصور صاحب آپ بھی اسی طرف آہاں" ٹیڈ نے آواز دی "عاشی بھائی بڑی محم حم می ہیں انہوں نے کار چلائی تو ضرور کسی سے محروم گی"

عاشی نے ایک گہری سانس لی اور ٹیڈ کے ساتھ

بچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ رونی اور رومی بھی اس کے پاس آگئے منصور نے ڈرائیو تک دھکیل سنبھالا اتنی دیر میں کاشف اور ٹیڈ دوسری کار میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں کار میں آگے چھے ایرپورٹ کی جانب روانہ ہو گئیں۔

"امی" رونی نے اپنی ماں کے کان میں سرگوشی کی "کیا وہ ہی جہاز سے آئیں"

"کہیں بھی نہیں" رومی نے اس کی بات سن لی تھی "جہاز سے آتے ہوئے تو ہمیں پیار نہ کرتے"

عاشی کے دل پر ایک گھونسا لگا۔ آپ سے آپ اس کی آنکھیں آبلوں ہو گئیں۔

"بھائی۔ آپ سے زیادہ تو یہ بچے سمجھداری کا ثبوت دے رہے ہیں" ٹیڈ کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔ عاشی ایک بار پھر چونک گئی "کیا مطلب" اس نے ٹیڈ کی طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں مزہ کر کر کہو ہی ہو" ٹیڈ اس کے جواب دینے سے پہلے منصور بول اٹھا "اب کچھ سی دیر کی بات تو رہ گئی ہے بھائی ایرپورٹ پر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی"

"کیا دیکھ لیں گی" عاشی نے منصور کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "اپنا سامان۔ اور کیا" منصور کا جواب تھا۔ "میرا سامان؟" "ہاں وہ ہی جو کاشف نے کرا رہے ہیں۔" منصور کہتے کہتے رک گیا۔ "کاشف نے کرا رہے ہیں" عاشی کے داغ میں جیسے پکھلے سے چلنے لگے۔

"لا حول ولاقوة۔ میرا مطلب تھا کہ جو کاشف بھائی نے اس جہاز سے بک کر دیا ہے"

"خدا کے لئے منصور بھائی" عاشی رو ہنسی ہو گئی "ان پر اسرار باتوں کو ختم کیجئے۔ صاف صاف بتائیے کیا بات ہے ورنہ میرا دم گھٹ جلتے گا۔" اس کا دل سج سج الٹ پلٹ ہوا جا رہا تھا۔

"میری اچھی بھائی" ٹیڈ نے بڑے پیار سے عاشی کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں بھئی منصور صاحب۔ اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا میں سب کچھ بتائے دیتی ہوں"

"تمہاری مرضی" منصور نے ایک گہری سانس لی
 "بات یہ ہے عاشق بھائی کو آپ نہیں کاشف سمجھ رہے ہیں وہ
 کاشف نہیں ان کے چھوٹے بھائی آصف ہیں؟
 "کیا" عاشق کو کوئی ایسی بات سننے کی بے یار و مددگار توقع
 بھی نہیں تھی۔ اس نے ٹھیکہ کو گھور کر دیکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارا
 تو کوئی اور بھائی تھا ہی نہیں؟
 "آپ کی طرح میرے لئے بھی یہ انکشاف ایک دھماکے
 سے کم نہیں تھا۔" ثریا نے جواب دیا۔ "مگر آصف نے ہمیں یقین دلایا
 ہے کہ وہ پرجہ بھائی بھائی ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ
 اپنی اہلی جنہیں ہم جو مہر سمجھتے ہیں اسی زندہ ہیں اور کاشف کے ساتھ اس
 جہاز سے آ رہے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کاشف نے یہ تمام حالات خط
 میں لکھ کر آپ کو گول کو بھیجے تھے مگر معلوم نہیں وہ خط آپ کو کیوں
 نہیں ملا۔ لاکھ لاکھ پورٹ پر جب آبا جان نے اسے کاشف سمجھا اور
 آصف نے دیکھا کہ خط غلط کی وجہ سے وہ اگلی حالات سے بے خبر
 ہیں تو اس نے شرارتاً اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش نہیں
 کی اور آبا جان کے ساتھ جانے کے بجائے میرے ساتھ چلا گیا؟
 "ثریا تو یہ نہیں اور بھی کیا کیا کچھ کہتی رہی مگر عاشق کی یہ
 کیفیت کتنی کڑواہٹ لگتی تھی۔ ذہن اتنا اٹھا ہوا تھا کہ اس کی
 بھین نہیں آ رہی تھی اس بات کو سمجھنے کے لئے اس کو کچھ بھی خوشگوار دھوکے
 سی ابھرنے لگیں اور کبھی دل یہ سوچ کر دھڑکی نہ بولتا کہ اس نے ثریا
 اپنے بھائی کی زندگی کو ایک نئی شخصیت کی آڑ میں تو چھپا کر نہیں چاہا
 لیکن جب ایر پورٹ پر اس نے ایک اور کاشف کو
 ہوائی جہاز سے اترتے دیکھا تو آخر کار اسے یقین آ ہی گیا۔ وہ فوراً جہاز
 سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر کرے۔ کاشف ایک بڑی مایوسانہ نظر سے
 دیکھتے ہوئے میز پٹیوں سے اتر رہا تھا۔ اور کھوٹے دیر کے بعد وہ
 ان سب کے سامنے موجود تھا۔ آصف نے آگے بڑھ کر بڑی خاموشی سے
 کو سلام کیا۔ "آداب اہلی جان۔"
 "جیتے ہو بیٹے" انہوں نے دعا دی اور ثریا کی طرف
 دیکھا جو ابھی تک کھڑی بیٹھ کر رہی تھی۔ "ثریا میری بچی" انہوں نے
 اُسے گلے سے لگایا۔
 اور اس پر شفقت آغوش میں پیچھے ہی ثریا کو لایق ہو گیا
 کہ آصف غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ مائیک کی جہازت خانہ صرف ایک
 ہی گود کو عطا کی ہے۔

کاشف نے ہر شوق نظروں سے عاشق کی طرف دیکھا
 اور اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر چونک گیا۔
 "اے یہ کیا عاشق؟" وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھا
 "تم رو رہی ہو؟"
 "یہ دہری خوشی کے آنسو ہیں کاشف بھائی" منصور
 نے کہا۔ "آپ کو معلوم نہیں یہاں آصف نے کیا لگایا تھا؟"
 "نہلا بھائی جان میری کوئی قصور نہیں" آصف جلدی
 سے بول اٹھا۔ "اشرف صاحب مجھے کاشف سمجھ بیٹھے تو میں کیا کرتا۔
 میں نے سوچا کہ تو شری شرارت کی ہی ہو؟"
 "چنانچہ عاشق بھائی کل سے اس غم میں گھٹی جا رہی
 تھیں کہ ان کے شوہر نامدار اٹھ گھنٹہ سے ڈگری کے ساتھ ایک عذریہ
 بھی نہ کر واپس لوٹے ہیں" منصور نے کہا
 "میں شرمندہ ہوں مجھے احساس نہیں تھا کہ بھائی آپ
 سے اتنی بے پناہ محبت کرتی ہیں" آصف نے کہا اور عاشق کے سامنے
 سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ "بھائی آپ اپنے نالائق دیور کو معاف نہیں
 کریں گی؟" عاشق نے سچائی آنکھوں سے آصف کی طرف دیکھا
 اور دھیرے سے مسکادی
 "بہت شرمندہ ہوؤں، کاشف نے ایک ہلکا سا تھپہ لگاتے
 ہوئے رومی اور رونی دونوں کو گود میں اٹھا لیا اور اپنی اہلی
 کی طرف گھوما۔ "امی یہ ہیں عاشق آپ کی بڑی بوجھم" اور یہ آپ کے
 دو پوتے رونی اور رومی"
 "کیسی جاند سی ذہن پانی ہے تم نے بیٹے" اس نے
 آگے بڑھ کر عاشق کو گلے سے لگایا۔ "میں اب بھی کہہ رہا تھا کہ تم
 اتنا بے قرار کیوں رہتے تھے؟" انہوں نے عاشق کو چھوڑ کر دونوں
 بچوں کو پیار کیا ان کے سر پر ہاتھ پھیلا۔
 "مگر امی میں ابھی تک حیران ہوں" ثریا بولی آبا جان
 نے تو ہمیں آپ کے یا آصف کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا؟
 "اس میں ان کا بھی تصور نہیں تھا" امی نے ایک
 ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ ایک ایسی کہانی ہے۔ گھر چلو تو اطمینان
 سے بتاؤں گی"
 وہ لوگ ایر پورٹ سے باہر آئے۔ کاشف بچوں کو گود
 میں لئے عاشق کے ساتھ چل رہا تھا۔
 "مگر میں نے تو خط میں ساری باتیں لکھ دی تھیں"

اس نے کہا
 "وہ خط ہی تو ہمیں نہیں مل سکا" عاشق نے جواب دیا۔
 اس کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی۔
 "مجھ سے ناراض تو نہیں ہو، کاشف نے پیار سے پوچھا
 "ہمارا پرگرم تو ایک ساتھ ہی آئے کاشف کے پہلے جہاز میں پوری ٹیبل
 نہیں مل سکیں مجھ کو دوسرے جہاز کا انتظار کرنا پڑا؟"
 "آپ حیرت سے واپس آ گئے۔" مسکرتے ہوئے یہی سب
 کچھ ہے؟
 "پہلے کہاں جاؤں گے؟" منصور نے کارول کے پاس
 رکتے ہوئے پوچھا۔ "ہم آگے گھر یا چھائی کے یہاں؟"
 "وہ عاشق کا نہیں میرا گھر بھی ہے" کاشف نے جواب
 دیا۔ "میں اشرف صاحب کو آبا جان مرحوم سے کم نہیں سمجھتا"
 "ٹھیک کہتے ہو بیٹے" امی نے کہا۔ "میں بھی ان سے ملنا
 چاہتی ہوں۔ انہوں نے میرے بچوں کو بڑے ناز و نعم سے پرورش
 کیا ہے۔ میں ان کی بھلا حسان مند ہوں؟"
 اور اس طرح وہ سب میرے عاشق کے گھر پہنچے۔
 پہلے عاشق کا رستہ اتر کر اندر داخل ہوئی وہ اس وقت بیچ درمیان
 تھی۔ قدرت نے سائے جہاں کی مشرت اس کے دامن میں ڈال دی
 تھی وہ گشت جو دم بھوکے لئے خراں کی پرچائیوں کی زمین آگیا تھا
 ایک بار کچھ مہک اٹھا تھا۔ وہ دوسرے سے عاشق کے قدم ہلکے
 جا رہے تھے۔ اشرف صاحب لان میں بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے
 تھے انہوں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے حین
 چہرے کو خوشی سے گلنا دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ ابھی حیرت وہ
 سے ہو کر کچھ پوچھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ کاشف اس کی اہلی
 پھر آصف نمینہ مڑتا منصور سب ہی یکے بعد دیگرے اندر آتے
 گئے۔ اپنے سامنے ایک ہی کاشف کے دو دیکھ کر اشرف
 صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ مگر انہیں زیادہ
 دیر تعجب نہیں رہنے دیا گیا کہ کاشف نے مختصر طور پر سارا حال انہیں
 کہہ دیا۔ عاشق کی اہلی اور رونی بھی خوش بیٹھے اندر سے باہر گئے
 "کیوں بیگم" سب کچھ سننے کے بعد اشرف صاحب نے
 عاشق کی اہلی کی طرف دیکھا۔ "اب تو یہ ہوگی کہ میں نے کاشف کو
 سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ یہ تو کچھ نہیں جو ابھی تک میری آنکھوں کے
 سامنے رہا تھا۔ خدا کی قسم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے

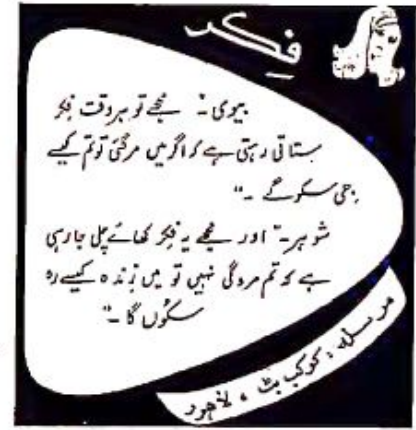
باد جو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ پرجہ ہو سکتا ہے اور دیکھ لو
 کہ خدا نے میرے فیصلے کی شرم رکھ لی؟"
 "ہاں صاحب آپ افلاطون وقت جو بھرے، سترائیں
 نے جوانی کی شوخی کو آواز دی۔
 "مگر بھائی" اشرف صاحب نے کاشف کی اہلی کی طرف
 دیکھا "جب تک آپ کی داستان سن لی جائے ذہن میں انہیں ہی
 رہے گی"
 "ہاں امی اب تو بتا دیجئے؟" ثریا بھی جھنجکی۔
 "یہ اس وقت کی بات ہے۔ جتنی جب تم چار سال کی
 تھیں" کاشف کی امی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا کاشف
 کی عمر مشکل دو سال ہوگی ہم آگے بہتے تھے۔ تھپہ کے والدین بہت
 خوبصورت اور پرجہ تھے کاشف کے مالک تھے میری ایک بیٹی تھی
 رقیہ یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ
 تمہارے ابو کو دیر انداز چاہتی تھی۔ اس نے ہماری علیحدگی کی بہت
 کوشش کی مگر ناکام رہی کیونکہ تمہارے ابو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے
 انہیں بہکانے میں ناکام ہونے کے بعد رقیہ نے مجھے برکداریات
 کرنا چاہا۔ اس کے کہنے پر تھپہ ہائے بوئے میری خدیجہ کو شریعہ کو دی
 گئیں جگہ تھی میرا دامن پاک تھا اس لئے کچھ حاصل نہ ہو سکا یہاں
 تک کہ ایک روز خود تھپہ ہائے ابو نے تنگ آ کر مجھ سے رقیہ کی نکاحیت
 کی۔ مجھ سے کہا کہ میں اس کا گھر میں آنا جانا نہ کروں وہ ابھی عورت
 نہیں ہے۔ وہ تمہاری دشمن ہے۔ مگر مجھے ان کی بات پر یقین نہ آیا
 بھلا رقیہ کیوں میری دشمن ہونے لگی۔ اس کی سچی بیٹی باتوں سے
 میں بہت متاثر تھی۔ میں اسے بہت مخلص اور نیک خیال کرتی
 تھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میری تباہی و بربادی کے لیے ہے۔
 ایک دن وہ طاقت کے وقت آئی۔
 "کیا طاہر صاحب ابھی نہیں آئے؟" اس نے پوچھا۔
 "ہاں۔ آج کچھ زیادہ دیر ہو گئی ہے" میں نے جواب دیا
 "ہاں انہیں دیر تک یا نہیں رہنا چاہیے؟" وہ پکھڑ
 پریشانی سے بولی۔ "تمہیں معلوم نہیں آج کل زمانہ بہت خراب
 ہے۔ غنڈہ دل نے بہت سراٹھایا ہے۔ گھروں میں گھس کر عورتوں
 کو اٹھائے جاتے ہیں۔ ایسی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں؟
 "یہ تم نے بڑی خبر سنا لی" میں گھبرا گئی۔ "میں تو بالکل
 اکیلی رہتی ہوں۔ خدا نخواستہ کوئی بد وقت آپ کو لگایا کروں گی؟"

”نہیں اب انکا گھر لے کر کی بات بھی نہیں ہے“ رضیہ نے
 نے مجھے تسلی دی ”عورت اگر تری جاپلڑی کے کام سے وقت پر ادا مان
 بحال رکھ تو کوئی بڑے سے براغزوہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“
 ”کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔“

ہوں اسے کوئی اور بھی سن رہا ہے۔ نصیر کی چال، یہ تھی کہ ایک طرف اسلم لکھیا دوسری طرف تمہارے انوکھتا دیا کہ اگر وہ میری بدکرداری کا ثبوت چاہتے ہیں تو جرات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں چنانچہ جو جواب میں میں اس بدعا عاش سے کہیں وہ سب تمہارے اوبرے بھی سن لیں۔

جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
 جس نے عورت ذات پر میرے اعتماد
 ہیئت کے لئے ختم کر دیا ہے۔ تم کسی اور
 کے ساتھ جنت کرتی ہو تو تمہاری جنت
 تمہیں مبارک ہو میں تمہیں آزاد کرتا ہوں
 جسے چاہو اپنا شریک حیات بنا لو کاوش
 کسی کی باتوں پر یقین کر لیتا تو آج میرے
 نہ اٹھنا پڑتا۔ بہر حال میں تمہاری زندگی
 سے نکل کر جا رہا ہوں۔ اپنے بچوں کو ساتھ
 لئے جا رہا ہوں کہ تمہاری نئی دنیا میں
 ان کے لئے نہ کوئی گنجائش ہوگی اور نہ
 ضرورت۔ بول رہی ہیں ان معصوموں کو
 تمہارے گناہوں کے سایہ میں پرورش پانے کے
 لئے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بد نصیب طاہر

ہوتے گئے۔ آصف جوان ہو گیا۔ ابھی اس نے بی لے کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ رضیہ بیمار سا تھک چھوڑ گئی۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے آصف کو سینے سے لگا کر خوب بیا کیا پھر اسے کمرے سے باہر بچ کر میرے پردوں پر اپنا سر رکھ دیا اور روتے ہوئے معافی مانگنے لگی میں حیران تھی کہ آخر وہ کس بات کی معافی مانگ رہی ہے اس نے تو میرا ایسا ساتھ دیا تھا کہ سچی بہن بھی اتنا نہیں کر سکتی تھی! اس پر اس نے فرط غم سے ماری کہانی بیان کی اور بتایا کہ گلاب رکھی کی وجہ سے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ چل بچھڑ گئے تھے۔ میرا خون کھول اٹھا میری جی پھا کہ اس کے جھکے ہوئے سر کو ٹھوکر لہاؤں، بچھڑاں اس کی قریبوں کا خیال نہ گیا۔ اس کی آؤ دزاری سے میرا دل تڑپ گیا میں نے اس کی جگہ خود کو رکھ کر کچھ کیا میں نے محسوس کیا کہ اس بد نصیب کی زندگی بھی کیا زندگی تھی۔ اس نے مجھے چاہا اس کے لئے اپنی پوری زندگی تباہ کر لی اور پھر بھی اسے نہ پاس کی۔ مجھے تو پھر بھی تمہارے انوکھی محبت حاصل تھی۔ ان کی نشانی میرے پاس تھی مگر اس بد نصیب کو کیا ملا۔



جی سکوے۔
 سستا رہتی ہے کہ اگر میں مر جی تو تم کیسے
 شہر۔ اور مجھے یہ خبر کھانے چل جا رہی
 ہے کہ تم مر رہی نہیں تو میں زندہ کیسے رہ
 سکوں گا۔

”معاف کیجئے، میرا نام آصف نہیں کاشف ہے اس
 نے جواب دیا اور میری نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھ گیا
 میرے ناواں جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آگئی کہ میں نے اپنے
 بستر سے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دل کی یہ کیفیت تھی جیسے پلایاں
 توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ہوئی آواز میں پوچھا۔ کاشف حیران تھا
 ”جی ہاں سکران کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اور تمہاری ماں کا نام زریہ تھا؟“ مجھے یقین ہو گیا تھا
 کہ یہ ہی میرا گمشدہ چاند ہے لیکن میں مزید بتا کر ناچا اتھی
 ”درست ہے مگر آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا آپ
 کون ہیں؟“ اور کاشف کے منہ سے یہ الفاظ نکلے اور میں نے
 اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”بیٹے میں وہ ہی تمہاری بد نصیب ماں ہوں۔ میں
 نے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر ذرا سکون ہوئے پر میں نے اسے تمام حالات
 کہہ سنائے۔ کاشف بہت خوش تھا۔ حیران بھی اور تاشف بھی کہ
 ایک دلا سی غلط فہمی نے ہم سب کی زندگیوں میں کتنا انقلاب پیدا
 کر دیا تھا۔ اسی وقت آصف اور زریہ بھی آگئے۔

”اس نے سوچتے یہ تمہارے بڑے بھائی کاشف ہیں جو
 اپنے آپ کو ساتھ بچپن میں ہم سے جدا ہو گئے تھے۔“ میں نے اس سے کہا
 دونوں بھائیوں کے ملنے کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔
 ایک بار کچھ میری آنکھیں بھر آئیں مگر یہ خوشی کے آنسو تھے کاشف

نے بتایا کہ وہ چار سال کے لئے لندن آیا تھا اور اب اپنی تعلیم مکمل کر کے
 واپس جانے ہی والا ہے۔ اس کے ملنے کی خوشی نے میری صحت پر
 حیرت انگیز اثر کیا میری طبیعت دن بدن چلتی گئی یہاں تک کہ
 ایک مہینے کے اندر مجھے ہسپتال سے بھیج دی گئی۔ میرا دل تم سب
 کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہوا تھا۔ اور تم سب نے کاشف کے ساتھ ہی
 پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ کاشف تمام حالات ایک خط میں عاشر
 لکھ دیے تھے مگر وہ خط معلوم نہیں کیوں ابھی تک نہیں ملا۔ اور آصف
 کو اپنی شہادت کرنے کا موقع مل گیا۔ بھارادر و گرام ساتھ ہی آنے کا
 تھا۔ میں بھی ایک کرائی میں گھر پر پورٹ پنچکرت چلا کر ہمارے
 دوستوں کے دروازے پر نما آندوں کو دیکھ کر گھٹنوں کا سہارا بن کر
 پاکستان آنا ہی ضروری تھا اور یہ کہ ہم چاہیں تو ان دوستوں کی ہا
 آگے جہاز میں دوستی میں سہارے ہو سکتے ہیں۔ مجبوراً ایسا ہی کیا گیا۔ آج میں
 اپنے کو تم سب کے درمیان پا کر خود کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش
 نصیب محسوس کر رہی ہوں۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ تمہارے آؤ
 اس زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی کہ میں ان کی غلط فہمی دور کر سکتی
 ان کی داستان سن کر سب ہی متاثر نظر آ رہے تھے
 ماحول کچھ بولھن بولھن سا ہو گیا تھا۔ منصور نے اس فضا کو بدلنے
 کی کوشش کی۔

”خیر جو ہونا تھا سو ہوا“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”مگر ناشی
 بھالی اتنی بہت سی خوشیاں سمیٹ کر بھی آپ ہمارا منہ مٹھا نہیں
 کر سکتی گی۔“

”تم کھانے کی بات کر رہے ہو اور میں سوچ رہا ہوں کہ
 آج ہی سے ڈراما شنگ شروع کر کے کچھ دلا ہوئے کی کوشش کروں
 آصف نے شروع نظروں سے عاشر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
 ”وہ کس لئے تمہیں چوٹی۔“

”اس لئے کہ موجودہ ذلیل ڈول کے ساتھ تو ناشی بھالی نہ
 کسی دھوکے میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کچھ دلا ہو جاؤں کہ
 البتہ کسی دلچپ بھول کا امکان ہو سکتا ہے۔“ آصف نے ہنستے ہوئے
 جواب دیا۔

”جی جناب“ شین نے جیسے متحیر چڑایا؟ اور وہی امر
 مجھ سے بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”ایس“ آصف نے گھبرا کر سر کھینچا۔
 اور سب لوگ بے اختیار قہقہے لگانے لگے۔

کیا ہوگا؟

بارات دروازے پر لگ رہی
 ہے لوگوں میں پہل بج رہی ہے
 لڑکیاں اور عورتیں اور بچے ہر بارات کا تماشہ دیکھنے میں مگن ہیں ہر کوئی
 خوش ہے کیونکہ یہ موقع ہی ایسا ہے شادی کے موقع سے بڑھ کر خوشی کا
 موقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ لیکن رومانہ ابھی ابھی اس کے پاس
 سے اٹھ کر رہی ہیں کیونکہ اب مجھے سے رومانہ کی تحلیف بھی نہیں جاتی
 لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟ رومانہ کوئی ایسی لڑکی نہیں
 جو اپنی شادی سے خوش نہیں ہوتے۔ ساتھ میں میری ہی شادیاں ہوتی
 ہیں جو لڑکی کی مرضی کے خلاف کیا جاتی ہیں۔ نہ جانتی لڑکیاں سماج کے
 سسرے گلے سے کم و رواج کا شکار ہو کر اپنی زندگی کی موت کی سی نفی سے
 درچار رہتی ہیں۔ پھر اس گلے سسرے ساتھ ہر ٹھیکہ دار بڑے غصے سے منہ دوا
 پٹیتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں ہماری عورتیں اس قدر نیک اور صابر اور
 وفا شعار ہوتی ہیں کہ ساری دنیاں ساری عیسیٰ مصیبتیں خاموشی اور بے
 زبان سے برداشت کرتی ہیں اور یہی آف اور یہی نہیں کرتیں۔
 رومانہ کیلئے ہی حالات کا شکار تھی۔

وہ میری پہلی ہے میری ایک ملاقات کا کچھ نہیں ہوا اتنی
 میں نے کچھ نہیں سمجھا۔ میں نے اپنے دل میں اس سال تک
 مجھے تیرے پہلے سکا کہ مجھ سے اس قدر قرب کیسے آگئی اور تم دونوں میں
 اتنی گہری دوستی؟ اتنا گہرا کیا کیسے ہو گیا؟ اب میری اور اس طبیعتوں
 میں اتنا فرق تھا اور اتنا تضاد تھا؟ وہ بڑا خوش اور چلنی تھا۔ ”یہ وہ شہر
 اس کی بولی بولی ہوتی تھی۔ یہی تھی اُسے مدینہ نظر آئی تو غافل میں نہ لگا
 والی۔ اس لڑکے سے غور اسکے گھر والے کچھ حکمت سے کہتے کہ مدینہ
 اور خود سرائی جہانے کہیں وقت کیا کر لیتے تھے؟ اب کہیں ایک بے حد
 خاموشی پسند آدینہ دل ہوئی ہوں۔ اور کوئی کام نہ ہو تو چپ چپا
 کسی گوشے میں کتاب کے کڑیٹھے رہنا نہ دینا کا حصہ بننا نہیں چاہتی ہوں۔
 لیکن رومانہ! تو کہتے تھے۔ یہی شادی خود سرائی کی طبیعت کی لڑکی
 تھی کہ خدا کا نیاہ میں بات کا ارادہ کر لیا تو دنیا کوئی ملاقات گئے اس سے
 باز نہیں رہے تھی جیسا کہ بات پڑ گئی تھی۔ پورا کر کے چھوڑتی۔

رومانہ ابھی لڑکی تھی جسے قدرت نے لڑکی کے روپ میں
 جنم دیا تھا۔ وہ اگر بڑے کے روپ میں جنم لیتی تو
 بے پناہ قوت لڑکی مند مند بنتی اور نہایت سے تاریخ کی ایک نہ

رہنمائی

شاہد زمان



محلانی جانے والی چیز تھی لیکن وہ ایک لڑکی تھی لڑکی جو ہمیشہ مجھ سے
ہوتی آتی ہے، زنجیروں میں جکڑی جاتی رہی ہے۔
اُس کی صدائے کسے کی طرح تھی مجھے اکثر سوچنے پر مجبور
کرتی تھی کہ خراسان لڑکی کا انچام کیا ہوگا؟ ہلکے ساج میں ہلکے ارد گرد
کی دنیا میں اس کی سرکھوں کا گناہ نہیں ہوتا، ان کا سینا آسان نہیں۔
ہلکے ساج میں لڑکی کو بہت خوبصورت بنا دیتے، منہ میں زبان اگر
بالیں ہی نہ ہوتی تو دیکھ کر بہتر نظر نہ آتی اور کھلنے پھلنے کے سوا دنیا کی
اور بات سے سروکار نہ ہوتا اور ظاہر ہے معاذ بڑی منہ زور ضدی اور
خود سرکھی۔

کئی بار میں نے اُسے سمجھانے کے خیال سے کہا تھا
”رومانہ اپنی ضد سرکشی اور خود پسندی چھوڑ دو آخر
تمہیں اس ساج میں رہنا ہے اور گھر کی دنیا میں ایسی لڑکیوں
کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، یہی ہیں ان کی وجہ سے زندگی میں پشیمانی
کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“
رومانہ بہت بڑی تھی اُس نے ہفتے سے کہا تھا۔
”تم تو بڑی دلیر ہو اس دنیا اور سماج سے بدلہ لینا چاہتی ہو
یوں دینے لگی، ساج ہلکے بنانے سے بننا ہے، میں جسے اچھا سمجھتی
ہوں اُس راہ چلیں گی میں زندگی روتے دھوتے اور گھٹ گھٹ کر
انہیں گرا کر انا جاؤں گی۔“
”کوئی تنہا شخص اگر زمانہ اور اسکے TEND کو بڑھا
ہے تو ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔“
”ناکامی یا کامیابی میں کچھ نہیں جاتی میں صرف کوشش
برصورت پر کھڑی ہوں۔“ میں خاموش ہو گئی تھی۔

بارت لگ چکی ہے اب کیا ہوگا؟ میں کیا کروں؟
”مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

رومانہ کا دل میں بھی حادی تھی کسی لڑکے کی مجال نہ تھی
رومانہ کی موجودگی میں رومانہ تو فیروز کسی دوسری لڑکی کی طرف نہ کچھ
رہ کر رہے یا ہٹ کر رہے۔ وہ بے دھڑک ایسے لڑکوں کو لٹکا کر دیتی
۔ بالائی تہہ سے مٹانے کے کراس نے ایک لڑکے کی تنہا بڑی بیانی
اور پیرل سے کہہ کر اُسے نکلا دیا تھا یہی تھی اُس کی اور دھڑک تھی
ایک بار ہماری ایک کلاس میں لڑکی شادی ہو رہی تھی۔

اُسے دیکھتے کچھ عورتیں اور مرد اُسے حسب قبول کچھ عورتیں اس لڑکی کا
پوسٹ مارٹم میرا مطلب ہے کسی صدمت شکل، عرق قلم، سلیقہ اور دنیا بھر کی
خوبیوں کی پوجہ کچھ اور چھان بین کر رہی تھیں۔

جب ہی اہانک ہانہ بیسیوں میں سے ایک نے لڑکی سے کہا۔
”ڈرنا کچھ نہ کرو، ہر عورت کا دل بدل کر دیکھا۔“
رومانہ جوان عورتوں کو بڑی دیر سے گھور رہی تھی اور ان کی
باتوں پر بیچ بچہ کھارہی تھی برداشت نہ کر سکتی بڑے بولے۔
”کیا آپ کی آنکھیں کام نہیں کرتیں؟“
”کیا مطلب؟“ وہاں بی بی بھڑک اٹھیں۔

”مطلب یہ کہ ابھی پیرل سے بدلے میں کراس کر رہی ہے آپ کے
سامنے آئی ہے پھر آپ کو کتنی تھیں۔ لڑکی کو آپ کی سی صورت سمجھتی
ہیں؟ جیسے چاہا اپنا جتنا جا بڑا کر لیا کچھ اپنے اپنے لڑکے کی صورت
دیکھ رہے؟“

شرمندہ ہو کر ہانہ بیسیوں چپ ہو گئیں بات تو دل میں لیکن
بعد میں میں نے اُسے ڈانٹا۔

”یہ کیا حرکت تھی۔ خود بخود تم نے ان لوگوں پر بدکاری کوشش
کی۔ بچاری لڑکی سے ماں باپ سے معصیت سے گھر گھر کر دیکھو ان لوگوں
کو بات چیت کیلئے بلایا تھا۔ تم نے رنگ میں بھگ ڈالنے کی کوشش کی
لوگ کیا کہیں گے؟“

”سچ کہوں؟“ اُس نے بڑی بے پارگی سے کہا۔ ”مجھ سے
نظم دیکھا نہیں جا رہا تھا“ لڑکی ایک بکری کی طرح وہاں پھٹی جیسے چند
فقہائی ٹول ٹول کر دیکھ رہے تھے۔ بڑی نا انصافی ہے مجھ سے
یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ آخر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟
”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن یہاں تو آئے کا آنا بڑا ہوا ہے
ہم تم کیارکتے ہیں۔“

وفا دو سال جو ہم نے کالج میں گزاری تھی سب رومی
سے گزر گئے، خود بھی جیسے تھے اور اُس کے ساتھ ساتھ ہماری شرفروں
آنند کو کا دو بجی ختم ہو گیا۔ ہم نے لے کر لیا۔
ایک دن رومانہ نے مجھے تباہ کر دیا کسی منگنی ہو رہی ہے۔
لیکن جس ٹھنڈے بچے اور بڑائی کے ساتھ اُس نے یہ بیانی اُس سے متاثر
ہوئے نچر رہے تھے، مسکیر کر دینے پر وہ جھوٹ پڑی۔

”وقیعہ سب لوگ مجھے برا سمجھتے ہیں میں ان لوگوں میں
نہیں ہوں نا“ اُس نے سب مجھے منہ زور زبان دراز اور ضدی
کہنے میں لیکن تم ہی بتاؤ نا انصافیاں کیسے برداشت کی جاسکتی ہیں۔
تم حیران ہو گئی تھیں کہ میں نے بڑے شوہر بڑی عجیب و غریب شخصیت
کے مالک میں انٹرکٹ کر رکھے ہیں، یہ طور نہ طریقہ نہ کچھ سے کوئی
سرکار آدمی کیا ہیں آدمی نا جاننا تو نہیں ہے شوہر بڑے تیز زاب بتاؤ
اس جیسے شخص کے ساتھ میرا گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟

”لیکن پھر تم نے گھروالوں نے ایسا رشہ کیا کیوں؟“
”تم نہیں جانتیں؟“ وہ طنز سے کہہ کر اُس کے ساتھ بولی
”وہ حضرت بہت امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں بڑے سے بڑے دولت مند
ہاں آملے ہے بہت ساری جا بڑا ہے، کاریں، کوشیاں، ڈیڑھ لاکھ
کی ساری چیزیں ہیں ان ساری خوبیوں کے ہوتے ہوئے یہ کیوں دکھتا ہے
ان کی شکل کیسی ہے، وہ کھلم کھلا کہتے ہیں؟ وہ منہ نہیں لیا نہیں یا
دوہرہ دار اور شرابی ہیں؟ دنیا کی ساری خوبیاں رکھ کر بھی سونے چاندی
کا پڑا ہی بھاری ہے گا“ اس دنیا کا کبھی دستور ہے، سونے کے مقابلہ
میں خود کا پڑا بھی ہلکا کر دیتا ہے؟

”تمہیں رشہ پسند نہیں ہوتا ہے والدین سے کہو؟“
”کہہ کر کچھ چکی کوئی میری بات نہیں مانتا۔“
”تب میں نے رومانہ کی ماں سے کہا۔“ شادی یا بڑی
کیلئے کئے جاتے ہیں لڑکا مادہ کو پسند نہیں آپ کسی دوسری جگہ
بات کریں۔“

اس پر رومانہ کی ماں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”رومانہ ابھی
بڑے آخر اس لڑکے کی کیلی ہے، وہ بڑے عیش و آرام میں ہے گی؛
ابھی نادان ہے شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے اُن سے کہا تھا ”پیرا انسان کو
خوشیاں نہیں دے سکتا، زندگی کی مسرتوں کو دولت کے بدلنے سے
پاناٹھ ٹھیک نہیں ہے جیون ساقی اگر میں پسند نہ ہوں تو زندگی بے کار
ہو جائے گی۔“

”تم جی نا سمجھ ہو، کہتی ہوئی وہ اٹھ گئی تھیں۔
میں نے رومانہ کو سمجھایا۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے اسے اپنا
قدر سمجھ کر قبول کرلو۔ شریف لوگوں کا میری فرض ہے، ماں باپ کی
پسند پر چرمان ہونا ہی ہمارا نصیب ہے، میری کہن اسے مان لو۔“

”وجاٹ ناں سن!“ اُس نے بڑا کر کہا تھا ”اب رومانہ
بہت آگے بڑھ چکا ہے، جس کی دنیا کی باتیں کر رہی ہو اور ش کی اصولوں
کی نصیحتوں کی اور سماج کی اور رسم و رواج کی ساری باتیں غلط ہیں۔
میں اس شخص کے کھلے کھلے ساج کی اور رسم و رواج کی ذرا بھی پروا نہیں
کرتی، جب کسی نے میرا خیال دیکھا تو میں بھی جوتی میں نے گھر کو گئی۔“
”کیا خودی کا اللہ ہے؟“ میں نے گھر کر پوچھا تھا۔
”نہیں۔“ اُس نے نہیں کر کہا۔ ”خودی بڑی کرتے ہیں
اور میں بڑی نہیں ہوں۔“

”تو بچہ ہے؟“
”میں کالج کے وقت انکار کر دیں گی مجھے یہ اعتنا ہے
کہ جسے میں نہ چاہوں گے قبول نہ کروں۔“
میں ہم کچھ ہو گئی تھی۔

اب نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہیں میں رومانہ کے پاس
جاتا جا رہی ہوں لیکن باتیں میرا ساتھ نہیں ہے بڑا ایک سوال بار بار
دماغ میں گھوم رہا ہے۔ ”اب کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟“

اُسے یہ چند ٹولوں کو میرے اگلی مولوی صاحب گراہوں کہ
ساتھ اجازت لینے آئیں گے ابھی رومانہ نہیں کہے گی مولوی صاحب لاپرواہ
بڑھتے باہر چلے جائیں گے یا ساری محفل تتر بتر ہو جائے گی عورتیں
مرکز شیاں کریں گی، بے حیرت لڑکی نے والدین کی ناک کٹوا دی بیچا۔
اجازت لینے لوگ آج ہیں مولوی صاحب پوچھ رہے ہیں۔
”کہہ دینی تمہیں منظر ہے؟“

”جی!“ رومانہ کی زبانی شکست خوردہ کی آواز آتی ہے۔
میں چونک اٹھتی ہوں۔

”تم نے بہت اچھا کیا رومانہ، اس کے بعد وہ لڑکی ناخنوں کی
”ہاں رومانہ! میں بارگزی میں کچھ ڈر کی لڑکی زندگی کو
شعلوں کی نذر کر دیا، شعلے جیسے میں سلاطینی ہوں گی میں نے جو سوچا
تھا اُسے پورا کر سکوں گی۔ کیونکہ مسکرا کر گرد زخیر ہیں۔ ماں کی مٹا
اور بیمار کی زنجیریں۔“ باپ کے رفتار کی زنجیریں بھائی بیٹیوں کے
پاپا کی زنجیریں۔ اور خاندان کی آبرو کی زنجیریں۔ میں نہاں کوششوں
کے باوجود نہیں توڑ سکتی اپنی زنجیریں تو ہیں تو نہیں توڑ دیتی یا انکار کر
مجال۔ لیکن ان زنجیروں کو توڑنے کی اُن کے حلقے سے باہر نکل سکتی
میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی!!



جبر و عفت



دادی ماں نے سنا تو اپنے سڑھوں کے نیچے انکی دبا کر سکتے ہیں انکس اور شاہدہ بیچنے تو اپنا سر پیٹ لیا۔ ہلے کیا ہمارا زما نہ اگلی ہے، جو نہ کبھی سنا تھا وہ ایک کھول سے دیکھتے ہیں لیکن ان کے کان کوئی ایسی بات بھی نہیں گئی، خود انہیں کی کوکھ سے جہ پانی ہوتی ٹپٹی، انہیں کی کوکھ تریت میں پل کر پڑاں چڑھنے والی لاڈلی کیا ان کے ہی چہرے پر کالک پونے کی، ماں اب ک نرنت سے ہوں کھیلے گی، کلمی گئے اس دور میں بھی شاہدہ بیچنے کے لئے یہ ایک ہونی ہی تھی۔ تھے عابد کو بھریج کر انہوں نے فوراً ہی شوہر کو اندر بلایا اور پھر کہیں ایک لگ کرے میں سے نکلتی۔

سنئے ہوا پکی لاڈلی بی کی کر توت! انہوں نے تمہارے پرے چہرے اور بھولی ہونے سانسوں کے ساتھ شوہر کو منا طلب کیا۔

کیا ہوا؟ شہیر میاں جا رہا پانی پر مٹیے بیٹھے چوک پڑے۔

نرنت اس شادی کے لئے رہتی نہیں ہے۔ بھری نہ ہو کھلا ہوئے شوہر کے سر پر کیا رنگی کم سے ملا۔

کیا؟ شہیر میاں پانگ جھوڑ کر اٹھ گئے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہاں نرنت اس شادی کے لئے راضی نہیں ہے! شاہدہ بیچنے شہیر میاں کی نکاہوں میں نکاہیں ڈال دیں جیسے قصور نرنت کا نہیں شہیر میاں کا ہوا پھر نرنت شہیر میاں کی بیٹی ہوا، ان کی بیٹی نہ جو جوش اور غصے سے شہیر میاں کا بدن کانپ گیا۔

مکن کہتا ہے؟ وہ زور سے گرتا اٹھے۔ اب ک اس طرح

گرج کا نشانہ بیٹی کو ہونا چاہیے تھا لیکن مگر ایسی ہی ماں کے کانوں سے۔

ابھی ابھی نرسن کہہ رہی تھی: شاہدہ بیچم سہم کر لوں۔

شہیر میاں جانتے تھے نرسن نرنت کی چہیتی سیل ہے کہ اور پوچھا اب بیکاری تھا شہیر میاں نے ایک بار شعلہ بار کا ہونک وڑا نے کی طرٹ دیکھا اور اسی طرٹ تدم تر جلا دیئے۔ ان کی چال اور انداز میں ایک بھاری عزم جھلک رہا تھا۔

کہاں چلے؟ شاہدہ بیچنے نے جبٹ کر شہیر میاں کا ہاتھ تھام لیا شہیر میاں نے مگر بھری کو دیکھا مرنے سے کوکھ نہ ہونے لیکن ان کی برہم نکاہ میں بہت کچھ کہ گئیں۔

نہیں نہیں! شاہدہ بیچنے نے شوہر کا ہاتھ اور بھی مضبوطی سے تھام لیا۔ ہتھیں میری قسم انکھوں کوئی جھنگار نہ کرنا، نرنت کو کچھ نہ کہنا، بہت بڑا ہو جائے گا نرسن کی ابھی نہیں موجود ہے۔

کیا اب اس سے کئی زیادہ بڑا ہو سکتا ہے؟ جوش کے مانے شہیر میاں کی آواز کانپ گئی نرنت کو یوں خاموشی سے مانتا نہیں کیا پتا تھا، میں اسے بھلنے دیتی ہوں، جو تا دسب کہہ دوں گی، شاہدہ بیچم عاجزی سے گڑ گڑاتی ہیں، لیکن جان بیگ کے منہ پر ہتھارا یوں جانا تھا کہ نہیں نہ جانے کیا ہو جائے۔

میسے رانے وہ زبان کھول کر تو دیکھے! شہیر میاں غصے سے بے تاب ہو گئے تو گولی سے نہ مار دوں تو....

اس لئے تو گھسی ہوں! شاہدہ بیچم اور بھی حاجت سے دلہن!۔ تم اب ہمارا دسب سب کہو کہہ دیتی ہوں! اسے ہتھارا حکم مانا ہی پڑے گا: شاہدہ بیچنے خدی گانگ کانی تھی شوہر کو ہشتال ویا تھا اور آپ ہی اندیشے سے کانپ کانپ کر اس آگ کو کھیلنے کی کوشش کر رہی تھیں، شہیر میاں کا جوش کچھ دسپاڑ گیا کبیر آوازیں بولے: اس ناشدنی سے کہہ کر اب اس کا کاح سیدنا آؤ میں کے بیٹے سے ہو گا، اس میں بغاوت کا دم تو اپنی کی کر دیکھے۔

کہہ دوں گی! شاہدہ بیچم اب کہہ گئیں جیسے ایک نرسن زور سپاہی اپنے فائنک کی ہر بات کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہہ دینا، وہ رک کر بولے: شہیر کو بیٹی کی مانت زیادہ اپنی آن اور عزت چاہی ہے، نرنت کے ڈولے کی جگہ اس گھسٹ اس کا جنازہ بنی کل سکتا ہے؟

اچھا اچھا! شاہدہ بیچم آنکھوں میں آنسو لے آئیں خدا کے لئے تم اب ہمارا دس

شہیر میاں نے ایک گہری نظر میری پڑوال اور باہر جانے کے لئے مڑ گئے۔ لیکن چند ہی قدم چل کر وہ پھر پلٹ آئے: سنو! انہوں نے میری کے پاس کر کہا، ماں سے کہہ دو، وہ اپنی چارپائی نرنت کے کمرے میں ہی کر لیں۔ دس بیٹیاں، دس سوس اور تم بھی ہو شاہدہ! نرنت کی اب پوری نگرانی ضروری ہے کوئی دوسرا اس کے پاس ہرگز نہ جانے پاتے اس کی سہیلیاں بھی نہیں، اور نہ کوئی ایسی کسی چیزیں ملک پیچھے میں مانتا ہیں کوئی ہی خط لکھ کر لگے ہی بیٹے شادی کی تاریخ مقرر کر لئے لیتا ہوں!

اچھا! شاہدہ بیچم نے ستوری سے گون ہلائی پھر سوچ کر

دلہن! ایسی کسی چیزوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟

تم آتا بھی نہیں سمجھتیں! شہیر میاں جھلا اٹھے: آجکل کی یہ جھوڑیاں شادی بیاہ کے معاملے میں بغاوت کی جب بھی سوچتی ہیں تو ان کے دہی حرے ہوتے ہیں۔ یا تو اپنے ماشن کے ساتھ مسرار۔ یا زہر کی شیشی!

ہائے اللہ! شاہدہ بیچنے سہم کر اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اب میری بیٹی کی ہی نہیں ہے!

تم نے تو ہمیشہ ہی کہا ہے اور اسی کا نتیجہ دیکھ رہی ہو شہیر میاں



عفت پانی

کے لیے میں ملتی اور طنز و دلالت تھی۔ میں نے کئی بار کہا کہ ظفر کا اس گھر میں ناٹھیک نہیں لگتی تھی میری بات کچھ دھیان نہ دیا۔ نرہمت کے منہ سے آج ظفر کی زبان بول رہی ہے اور دنیا بھی ہوسکتا تھا۔

”تو یوں ہوا، شادی بیکر جی رانی سے ملیں جبکہ کر رہ گئیں۔ پھر تم کیا سمجھتی ہو؟“ شہتیر میاں طنز سے سکرانے پر میری بات پر اگر کرتے آتا بھی دھیان نہ دیا، نرہمت کی نگرانی میں غفلت برتی تو دیکھ لینا تھانہ لڑی یہ لادلی ظفر کی کے ساتھ۔۔۔“

خدا کے لئے۔۔۔ شادی بیکر نے بڑھ کر شوہر کے قند پر ہاتھ دھر دیا۔ اب کچھ نہ کہو، اور وہ اپنی دل میں مڑ چکا کر پھٹ پڑا۔ وقت سموتھرا تھا لیکن شہتیر میاں نے رات دن ایک کر کے جیسے تیسے شادی کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ ممتاز حسین نے ان کی بات مان لی تھی اور ان کے ہی ہنسنے شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی، شادی کے گھر میں خوشیوں کا ہنگامہ ہوتا ہے لیکن شہتیر میاں کے گھر کی دنیا ایسی سوگوار سی تھی، جیسے وہ سب کی جاں بلیہ مریض کے سر لائے بیٹھے ہوں۔ کب کیا ہو جاتا کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب کے دل ایک جہانے خوف و اندیشے سے سہمے ہوئے تھے۔ ہر ذہن پر اس کی پرتھالیوں کا پتہ رہی تھیں اور سب کی اس ایک ہی منہ مٹا بھی کسی طرح یہ دنت تیزی سے گزر جاتے۔ نرہمت کا ڈول فیر و فز کی کے ساتھ اس دروازے سے رخصت ہو جاتے۔ بس۔

شہتیر میاں نے نکاح کی تاریخ کو پوری طرح راز میں رکھا تھا۔ نرہمت کی شادی اتنی جلد ہی ہو رہی تھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ شہتیر میاں کا فیصلہ تھا کہ نکاح کے دن وقت ہی پر سب کو خبر کریں گے جو رشتہ دار یا احباب باہر تھے، دوسرے شہر ہوں تھے انہیں بھی ایسے وقت سے دعوت نامہ بھیجے گا کہ وہ ان کی دعوت نامہ ہی پر پہنچیں شہتیر میاں نہیں جانتے تھے کہ ان حالات میں دوسروں کو یہاں پہلے سے موجودگی کا موقع دیا جائے۔

نکاح کی تاریخ بول بول کر قریب قریب جاری تھی دلوں میں پہنچنے والے اندیشے بھی اتنا ہی سر اٹھاتے جا رہے تھے۔ نرہمت پرچرانی اور اپنا پن کی سخت ہوتی جاری تھی لیکن نرہمت کا وہ تیسرے زیادہ عزیز تھا۔ اسید کے غلات وہ میر معمولی صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اگر وہ اس ظلم کے غلات احتجاج کرتی، روٹی، بلکتی خاموشی کے بجائے زبان سے کالمیتی تو گھر والوں کے لئے اتنی تشویش کی بات نہ ہوتی اور وہ اس کے خیالات اور غم و انداز سے باخبر رہتے، اور ان کی روک تھام بھی آسان ہوتی لیکن نرہمت کا یہ سکون ایک مجاری طوفان کی

علامت بن کر ان کے دلوں کو ڈرا رہا تھا۔ انہیں ایک اوتیت ناک کر رہی تھی مسئلہ کے ہونے تھا۔ کون جانے وہ کب کیا کر دے، اس نے نہ جانے کیا کچھ رکھ لیا۔ ایک جگہ کے کھانے میں نرہمت ہمیشہ دشوار ہوتی ہے۔ ان کے دل میں ایک گہائی ڈنٹ سے دھڑکتے ہوئے تھے اور یہ دھڑکن جتنی تیز ہوتی جا رہی تھی تو غل میں نرہمت پر پابندیاں اور سخت ہوتی جا رہی تھیں۔

ان نے بھی کراتے کراتے لانے کے لئے اپنی سادی ذہانت اور طاقات صرف کر دی تھی۔ سینے سے نکال کر بھی سمجھا تھا۔ انھیں دیکھا کر بھی سمجھا تھا۔ بیکر کے آگے پہنچ چلا کر عزت اور لاج کی جھبک بھی ان کی تھی اور باپ کے غیظ و غضب سے ڈرا یا دھمکیاں بھی تھا لیکن نرہمت کی آنکھوں سے آنسو بہتے، اس کی زبان سے الفاظ نکلتے تو ان کا انداز بھی ہوسکتا کہ ان کی کسی کہاں تک کار کو رہی ہے نرہمت کو اس طرح چپ رہتی خاموش جیسے اس کے کانوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور یہ ہی ٹرے اندیشے کی بات تھی۔ وادی اماں کا پلنگ نرہمت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا وہ وہیں ہوتی تھیں وہیں رہتی تھیں اور دن کو پوری مستعدی سے پونی کو نصیحت کرنے کا فرض انجام دیتی تھیں۔ نرہمت کو غصہ اور شرافت کے تقاضے سمجھا تھیں، سعادت مندی کے سبب پڑ جانے اور اپنے عہد اور ذمے کی مثالیں دے کر اس کے ہائی ذہن میں اپنی باتوں کا وزن بمانے کی کوشش کرتی تھیں اور آخر میں نرہمت کی نہ لڑنے والی خاموشی سے بزار ہو کر جھٹلا کر اپنے پالوں کی طبیعت کی طرف متوجہ ہو جاتا کرتی تھیں مٹھ میں ان کا کھانا ڈال کر اور نرہمت کی طرف سے رخ مڑ کر وہ چھالے کترے مٹھ جاتیں۔ نرہمت المینان کا سانس لیتی اور وادی اماں کو لکھلا کر اس کی طرف پلٹ پڑتی لیکن جب انہیں نرہمت کے ہاتھ میں زہر کی نشی نظر آتی اس کے چہرے پر وہی پہلے جیسا سکون ملا تو ان کے ہاتھ کا سرو تھپتھر تیزی سے جیسے نکٹا۔

نرہمت کی خاموشی اور استعجال نے سارے گھر کی عقل کو جکڑ میں ڈال رکھا تھا اور تو اور خوشی میاں کا ذہن بے بسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ آج سے پہلے وہ اپنی مجاری انھیں کبھی شکار نہ ہونے سے۔ اس ناگ باربری کی چھوڑی نے، خود انہیں کی مٹی نے انہیں پاگل بنا رکھا تھا۔ نرہمت اگر کھل کر مقابلہ پر جاتی تو پھر وہ اسے گولی سے مار کر اس کا کھلا گھونٹ کرا پی اس بے بسی کا خاتمہ کر سکتے تھے، لیکن نرہمت کا یہ خاموش مقابلہ ان اداہ تو ایک چٹان بن کر ان کے راستے میں کھڑی تھی جس سے ہر مار کردہ خود ہی زخمی ہو رہے تھے عجیب بے بسی کا عالم تھا

اور ایسے عالم میں نرہمت کی سہیلیاں ایک مجاری عذاب بن کر ان کے سر پر سلاخیں نرسن تو کالی سمجھا لڑتی تھی اس گھر کی ہمدرد اور غیر خواہ مخبی لیکن طلعت اور غزالہ کو پہلایا، انہیں نرہمت سے دور رکھنا واقعی دشوار ہو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ نرہمت کی آگے جا کر کھل گئی، ان کا پلنگ اس کی آگے سے تھا جو نرہمت کے کمرے کے آگے تھا۔ دوسرا کمرہ تھا اور رات ٹھنڈی تھی۔ شادی بیکر نے کمان سرکار اٹھا لیا۔ ان کی تاریکی میں نہ ہا پڑا تھا۔ پھر بھی ان کی نگاہیں نرہمت کو سمن سے کرتے دیکھ رہی تھیں وہ گھر کے بیرونی دروازے کی طرف توجہ رہی تھی۔ شادی بیکر نے کمان پھینکے یا اور پھر اگر ان کے مٹھیں گھر کا دروازہ بہت اعلیٰ اور مضبوط ہے بند تھا کدو کی گئی اور ایک مجاری قافل میں ہیں جوں رہا تھا لیکن شادی بیکر نے مسکن ذرہ سیں ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نرہمت ایک باگی لڑی تھی، باقی جوانی تھی نکاح کی مقررہ تاریخ میں اب وہی دن دگنے تھے اس دن میں نرہمت کی نگاہ نے پوری مستعدی پوری ہوشیاری رکھا تھی۔ گھر کے دروازے سے کچھ دھڑکنے کا دروازہ تھا۔ نرہمت بیرونی دروازے کے نہیں کی بلکہ غصے کے دروازے میں داخل ہو کر تو شادی بیکر نے المینان کی سانس لی لیکن پھر بھی وہ لٹی نہیں بیٹھ کر نرہمت کی واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی کچھ کمرے سے وادی اماں کے خزانوں کی آواز آ رہی تھی پڑھا تھا کہ کچھ خوب تھا اور جوانی سرگرم مل تھی شادی بیکر کی گھر میں تھیں اچھا ہی ہوا جو ان کی کھل گئی وہ نہ کون جانے بڑا وقت آئے در نہیں لگتی۔

نرہمت سنداس سے نکلی کر جب آدھے آنکھ ملگ والیں آگئی تو شادی بیکر نے بھی کیے پڑھ کر دیا۔ قدموں کی چاپ قریب ہوتی جا رہی تھی، شادی بیکر نے دیکھا نرہمت ان کی طرف آ رہی ہے وہ ان کی چارپائی کے پاس آ کر گر گئی۔ اماں!

شادی بیکر ہڑبڑا کر مٹھیں۔ اتنے دلوں میں آج پہلی بار ان کے کان نرہمت کی آواز سن رہے تھے۔ ہاں بی!، وہ پوری محبت اور پوسے اشتیاق سے سکرانیں۔

آپ خواہ خواہ پریشان ہو رہی ہیں اپنی نیندیں خراب کر رہی ہیں اماں! نرہمت کی آواز میں نرمی کی نرمی اور خود اعتمادی کا دھار تھا تو کبھی اور غمزدہ ہوتی ہے اور آپ کی بی بی بڑی نہیں ہے ایسا کچھ نہیں۔ آپ مطمئن ہیں۔

شادی بیکر نے چونک کر مٹی کو دیکھا اور دیکھ کر مکتی رہ گئیں نرہمت کی آنکھوں میں سچائی کی جھلک تھی۔ اماں کی ماسا ٹرپ گئی۔ میری بچی!۔ انہوں نے اٹھ کر نرہمت کو بچا لے کر چٹایا یا ماں کو بچے سے ایسی ہی توقع ہے بی! بھلا ان کو کوئی ایسی بات کر سکتی ہے جس سے۔۔۔

جس سے۔۔۔ اچانک شادی بیکر کے ذہن میں ایک اور اندیشہ جاگ اٹھا وہ اپنا جملہ عقل نہ کر سکیں۔ نرہمت کے الفاظ کے کچھ اعتماد اب بھی جھلک رہا تھا۔ وہ بڑوں نے بھی شکست کیے قبول کر سکتی تھی بی بی کو سینے سے لگاتے ہی لگاتے وہ سسک پڑیں۔ لیکن میری بی! یہ تو اور بھی برا ہو گا۔ اگر نکاح کے وقت قرآن پڑھنا رضامندی سے انکار کر دیا تو پھر میری بڑی کے سامنے یہ رسوائی کس لئے موت ہی بن جائے گی کچھ کسی کو مرنے دکھانے کے قابل نہ رہیں گے پھر تو اپنے باپ کا غصہ جانتی ہی ہے۔

میں سب جانتی ہوں امی!، نرہمت کی آواز میں ٹھہر رہا تھا۔ آپ! اکو تاریں کو انہیں اپنی ہندو کی استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ نرہمت کے منہ سے اس موقع پر بھی انکار نہ نکلتا تھا۔

میری بی! میری لادلی!، شادی بیکر نے پوری قوت کے ساتھ نرہمت کو بچھین لیا۔ ان کا دل چاہ رہا تھا۔ بی بی سے بھی داری نڈر ہو جائیں کتنی اچھی ہے ان کی بی! جس نے ان کے دل سے سارے خدشات سارے اندیشے یک لخت دور کر دیے تھے لیکن جس دن کے کی میز پر شادی بیکر نے جب شہتیر میاں کو یہ بات بتائی تو وہ نے المینان کے لیے میاں ہوئے۔ آج کل کی قیاد لڑکیوں کا کوئی مجبور نہیں ہے تمہیں ہوشیاری رہنا چاہیے۔ میں اسی وقت مطمئن ہو سکتا ہوں جب نرہمت کا ڈول ہمارے دروازے سے اٹھ جائے۔

نرہمت بیکر، بنت شہتیر، منہ ہمارا نکاح یہ اعجاز ہیں ولد سید ممتاز حسین ساکن شہر پٹنہ سے بالخصوص دس ہزار روپے سکر دیکھ لو وقت پڑھا جاتا ہے یہ نکاح تمہیں منظور ہے؟

شہتیر ان کے شو میں یک لخت مشفق سلامت ملی کی پروتا رازا ابھری اور کمرے کی محدود دفنا کچھ پوچھ لیں ہو کر رہ گئی، اس آواز کو سن کر خود نرہمت کے دل پر کیا گری؟ خدا ہی جانے! البتہ شادی بیکر کا دل اس ہی طرح دھڑکنے لگا کہ خود اپنے نکاح کے موقع پر بھی نہ دھڑکا ہو کتنی سخت آزمائش کی گھڑی تھیں نرہمت کے منہ سے نکلتے والے صرف ایک لفظ پر سارے گھر کی تباہی اسلامی کا دار و مدار تھا۔ یہی وہ موقع تھا جہاں قدرت مسکرائی تھی اور انسانی جبر بس نظر آ رہا تھا۔ شہتیر میاں یا شادی بیکر میں اتنی طاقت نہ تھی کہ نرہمت کے

پڑنے کے اور صحتی سلامت علی تھے اور یہی کئی دوسرے
مرد تھے خود شہید یہاں تھے اور پڑنے کے اور یہاں کے گوہر میں نہایت قیمتی
تھے، دادی اماں تھیں دوسری رشتہ دار عورتیں تھیں نہایت کسہلیاں
تھیں بچا ہوں نہایت پر تھیں۔ کاناں ہی آواز پر تھے اور دل و فکر
رہتے تھے خاموشی کا وقت طویل ہوتا جا رہا تھا۔

”بیٹی! کہہ دو کہ دو ٹیٹا، اتنا نہیں شرماتے یہ
تو اللہ رسول کا حکم ہے کسی کہہ دیتے ہیں۔ کہہ دو ٹیٹا! کہہ دو“
انتظار کا وقت فلان پوچھا اتنا ہی صاف سلامتی ملی کہ لپٹے
کے ہوتے چلے گئے۔ ہر حال میں۔

فرستندے ادب کار زور سے ایک کبری سانس لی اور کہی
عورتیں خوشی سے جلا اٹھیں۔ مبارک ہو لڑکی! اب کبھی ملدک ہو!
شاہدہ گنگہ نے جوشِ مست میں کہا کہ زور سے بھیجے لیا اور
شیر مریاں نے تشکر کبری نگاہیں چھت کی طرف اٹھا دیں۔ خدا نے
ان کی آہر دعا مسمیٰ۔

چوتھی کہ ہم کے مطابق دلہن کو میکے واپس لانے کے لئے جو رشتہ دار بات کے ساتھ گئے تھے وہ قبرستان واپس آگئے لیکن عزت ان کے ساتھ نہ تھی ایک بار تو شیرمیل کی اماجنہ دنگا گئی تو کیا عزت نے انتقام لے ہی لیا؟ انہیں شکست دینے کی یہ راہ نکالی؟ لیکن انیوالوں نے جب حقیقت بیان کی تو بات کچھ اور بنی تھی اعجاز حسین دلہن کے ساتھ ہاؤس ملنے لگے کسی ریاضت مند اچھا بھلا تھا جیسی میری فرسودہ رسم کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی اس نے دلہن کو اتنا بلیا واپس بھیجے

سے صاف اٹھ کر آیا تھا خود زہت بھی مشوہ کر مرضی کے ساتھ مہتی گھر کے دوسرے جگہ بھی اعیانہ کی جند کے آگے مجبور تھے۔ اس لئے زہت کے بغیر یہ الناس کو رہیں آنا پڑا تھا۔

شہرِ مال نے جیسے فراخ دل سے بیٹی اور داماد کو ملنا
 کر دیا تھا تو انوارہ نے بھی جیلا کا ایک کونسی تھیں اپنے جذبات کو بردہ شہر
 کے بولیں تو رہ گئی۔ فیروزہ خوش رہی۔ اب انہیں کوئی ٹھکانا کی صورت
 بھی دیکھ لیں گے۔ محمد علی کو اب خط ڈال دو کہ دونوں کو واپس آتے
 ہی عزت کو برہاں بھیجیں۔


”کیا ہوسے؟“ شاہدہ بیگم نے ایک نظر اخبار پر ڈالی اور
 بڑھلا کر شور مچانے دیکھنے لگیں۔

۱۰۔ رحومری بٹنے کے ایک عزیز و جوان سید اعجاز حسین کا تامل سائنس اقدام۔ اپنی کوئی دہائیوں کو طلاق دیکر لڑکی کی شادی اس کے اہل عیور سے کر دی یہ شادی محض اس کے ماں باپ کی زیر نگرانی کا نتیجہ نہ رہا اس کا اہل عیور غفر احمد ہے۔ سہاگ رات میں وہ اپنے جڑ تہذیب نگہداشت کیا۔ اعجاز حسین کے شرافت نفس دوروں کے زیغ میں وہ اپنے رہنما گرد کر کے اپنی زندگی خوشگوار نہیں کر سکتی۔ ماہِ عمل سنانے کے پہلے وہ وہیں کو کرے کہ رطل ہی بٹنے سے مہر پال چلا گیا اہل علم کے مطابق غفر احمد جیل ہی سے وہاں موجود تھا۔ طلاق کے بعد یہ مثال اور درمیان شادی مہر پال کا ہی انجام پائی۔ دین مہر کی رقم وہیں نے اعجاز حسین کو شکر کے ساتھ معاف.....“

شماره پنجم اگر گدازہ ہو سکیں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تیسری منزل کے گدازہ سے مٹی کے غلاف، ناکھنی باقوں کا طوفان، ابل رہا تھا لیکن ان کا شکست خوردہ ذہن فرما بھی کہ امانہ کا شہ آج بھول کر پہلے ہی مٹی سے سمجھ کر لیا جاتا۔

دل کی اقدار گہرائیوں سے خون کے دیو گرگم گرم تپسوں
اپنے مغزانی آنکھوں میں ان کے شفیق تظافر دل کی مانت کی کیا ہے
پھر گھنری چمکوں سے ڈھلے کمر زمین کی بے زبان
وہ سوتوں میں گم ہو گئے۔ اُن سے اناس نظروں سے آسمان کے دور پانچواں
میں جو انکا جیسے کسی کچھ پتہ نہ ہے سائنسی کی ستاراشی ہو یا پھر کتبہ بقدر سے
پڑی کڑھیں سی کا شاعر کر رہی ہو۔





تیمارداری میں رات دن ایک کڑے ہر طورہ نائب کی جی سے لگی بھی رہتی تھی اس نے مصیحت اور ہرجائیہ کو نظر انداز کر دیا تھا ایک روز فرائض سے بچھا۔ "سزنا تب میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن کسی بات میں ہرجائیہ کی اجازت تو شروع سے بھی نہیں دی۔"

وہ فرائض کی بات نہ کرنا توں کوئی تھی ایک دن اس کے دیوار واجد نے بلی زبان میں کہا۔ "بھائی آپ سب طرح بھائی جان کی تلاشی کریں میں اتنی پناہیت کا اظہار تو کسی اتنی جان سے بھی نہیں کیا شہناز آپا بھی تو ہیں ان کو دیکھئے رہا ہی خون میں لکھن ہفتے میں ایک بار آتی ہیں اور باہری باہری جان سے خیریت دریافت کسک لئے پیروں والیں چلی جاتی ہیں آپ کو کھائی جان کے لئے قریب نہیں رہنا چاہیے ان کی تیمارداری کے لئے نرسوں کی خدمات بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔"

وہ واجد کی بات سن کر مسکراتی تھی اس نے واجد کو بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا ایک اس شاکر نائب کے عزیز ترین دوست شامی سے شوروہا۔ "ناہیدہ صاحبہ نائب کے لئے اگر میری زندگی بھی کا آئے تو میں دریغ نہیں کروں گا آپ جو دشنامی کر دیا کر ہی ہیں اس پر یہ کیا کہنا بھی تیار کیا جاسکتا ہے لیکن میرا شوروہا ہے کہ آپ نائب سے دور رہیں۔"

"کیوں۔" اس نے شامی کو بلا نظر سے گھورتا۔
"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اگر آپ نائب کے زیادہ قریب ہیں تو خود بخود اس ہلکے مرض کے پریشانی آپ کو بھی لگ سکتے ہیں۔"
"کاش یہاں ہوجائے۔" وہ شامی کے سامنے سے نظر سے جھکائے
"اگے بڑھ گئی تھی اس نے شامی کے پیچھے چلے والے تاہزات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا اس رات اس نے قلعہ سے دھاک لگی تھی۔

"میسٹر معبود یا تو نائب کو اچھا کلا سے بچان کی زندگی ہی میں مجھے اس دنیا سے ہلے پروردگار نائب میری زندگی کا آخر ہمارا ہیں اگر تو نے یہ ہمارا بھی چھین لیا تو میں بے سہارا ہوجاؤں گی خود بخود میری بے بسی کی لاج تیرے ہاتھ ہے تو اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتا؟"
پھر کھار وڑاں کی ساس نے اسے اپنے کمرے میں طلب کر کے کہا تھا۔ "وہیں ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ نائب کو کسی توہین منتقل کر دیا جائے وہاں اس کی دیکھ بھال زیادہ مناسب طریقے سے ہو سکتی ہے میں نے نائب سے کہا تھا لیکن ان کے انکار کر دیا تم کسی وقت اسے پیار سے سمجھاؤ۔"
"آپ کا حکم کرانگیوں اتنی جان لگن تیری توہین میں داخل ہونے پر تیار نہیں ہیں اس نے بڑے احترام سے جواب دیا۔

"نائب کے لئے یہی توہین ہونا ضروری ہے یہ فیصلہ دیکھ رہے ہیں اور ڈاکٹروں کا مشورہ بھی اس کی ساس نے قلعہ سے تیزی سے جواب دیا۔
"تم اگر نائب کے ساتھ جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

وہ خاموشی سے چھپتے چھپتے قلعہ میں پہنچنے کے لئے لگی جہاں نائب رکھائی کا شہ بدودہ چڑھا تھا اس نے اگے بڑھ کر نائب کو سہارا دیا کھانسی کم ہوئی تو وہ دھڑکنے لگی ہوئی۔
"نائب، میرا شوروہا ہے کہ آپ فوری طور پر اپنی توہین میں داخل ہوجائیں اتنی جان بھی یہی چاہتی ہیں۔"

"اب ان باتوں سے کچھ حاصل ہوگا ناہیدہ نائب اکثری اکثری سانسوں کے درمیان بولے۔ "مجھے ڈاکٹروں سے زیادہ خود ہی حالت کا علم ہے جو مجھے بتا رہے ہیں وہیں میں تھری ذاتی تیار نہایتا ہلو۔" خندہ کیے نائب۔ "وہ بڑے ہی پیار سے بولی۔" مجھے یقین ہے کہ آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اچھا۔" نائب ایک سوا کھجور لہے۔ "اگر تمہاری بہن کو پتا ہے تو میں اس کا احترام ضرور کروں گا۔"

لیکن قدرت نے نائب کو اس کی خواہش کا احترام کا موقع بھی نہیں دیا اسی رات نائب پر شش کا شہ بدودہ چڑھا گیا نائب کے کمرے میں اٹھا ہوگا ڈاکٹر آیا اس نے نائب کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کو پیچھے لے جا کر کچھ کہا پھر کوئی دوا دے کر غیر واپس چلا گیا۔ "ناہیدہ صاحبہ کے پیچھے پریشانی دیکھی اور اس کی آنکھوں کو ننگا کیا تاہو وہ جان گئی کہ ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ اگر وہ اس تصور ہی سے لرز اٹھی اس کے دل کی دھڑکیں معدوم ہونے لگیں "واجدان کو لیکر باہر چلا گیا تو نائب نے ناہیدہ کو اشارے سے قریب بلایا۔

"جی۔" وہ حسرت واپس کی تصویر پر اس کے قریب چلا گئی ہوئی آواز میں بولی۔

"ناہیدہ۔" نائب نے اپنی حالت پر قیاس پاتے ہوئے کہا شامی میسٹر بہترین دوستوں میں سے میں نے اسے بہت قریب دیکھا ہے وہ ایک شخص انسان ہے مجھے یقین ہے کہ تم اور شامی۔"

"نائب فدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔" وہ بیچ "ٹھی" میں لکھ اپنی محبت کا واسطہ دیتی ہوں۔"

نائب کے پیچھے پھرت کے کہنا کہ اسے رن رہے تھے اس نے ناہیدہ کا ہاتھ اپنی گزرت میں لیا آہستہ سے واپس چلا گیا گزرت میں چلی چلی گئی حسرت بھی نظریں ناہیدہ کے پیچھے چھٹی چھٹی گزرت میں لایا۔

کی طرح بھی تو گھر میں گہرا بیچ گیا واجد بھائی کی لاش سے پرست کر صافیں مارنے لگا ہاں دور کھڑی چھاتی پر بیٹھی تھی سب نے اپنے غم میں لگے تھے ناہیدہ پر کیا تیار نہ گئی تھی اس کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔

نائب کی بھڑائی نظریں ابھی تک اس کے پیچھے چڑھنے والے نائب آنکھوں کو بند کرنا کوا سیرا محسوس ہوا جیسے اس کا سارا وجود گھپ نظر میں تھا گیا ہوا سے گھٹن کا احساس ہوا اس نے اگے بڑھ کر اپنے آخری سہارے کے قدم چومنے چلے لیکن غم کے چاکہ بوجھ نے اس کے قدم کو گھرا دیئے وہ خود گڑ گڑاتی تھی کر شامی نے اسے اندر آگے بڑھنے اور اٹھانے ناہیدہ کو لپک کر گرتے سے نہال لیا۔

شامی کے دوا بدیدہ وہ ہانگے سے بڑھ گئی تھی جوان بڑھ جس کے رمان بوسے بوسے سے پہلے ہی سر ہو گئے تھے اس نے طے کر لیا تھا کہ نائب کی یادیں اس کے گھر کی دین پر اپنی زندگی گزار دے گی وہ دفعہ کی ستم ظریفوں پر شامی تھی نہ اپنے نہ اپنے سہارے مدد تھا روز قلعہ اس نے خود کو سنے سناؤں میں دھنسنے کی کوشش کی شروع کوئی تھی وہ نائب کی تہا بیزوں کو اس کی صحت کئی جھٹائی ہو چکی تھی اس کی زندگی بیکار تھی اس طرح اس کے پیروں کو کیلئے سے الماری میں سجا کر رکھی تھی اس طرح اس کے گرنے کی گواہی دے گا اس نے خود کو کیلئے دیا تھا کہ نائب پر کیجے اس میں اس نے خود کو قریب دینے کی کوشش کی تھی واقعی طور پر نائب اس سے دور چلے گئے ہیں اور کئی دن چاکہ واپس آجائیں گے وہ آخری کے سہارے خود کو بلانے لگنا چاہتی تھی۔

شروع شروع میں نائب کی موت کا غم اٹھاتا تھا اس نے گھر والوں نے سے نظر انداز کر رکھا تھا ایک واجد بھی تھا جو ہر وقت اس کی دلجوئی میں نگاہ رہتا تھا کبھی کبھی شامی دو گھڑی کے لئے جاتا دو ایک باہر کر اس کی خیریت دریافت کرتا اور صبر کی تلقین کر کے واپس چلا جاتا تھا لیکن جب وقت گزرا تو وقت کے ساتھ ساس اور زندگی لگائیں بھی لگتی شروع ہو گئیں بات بات پر اسے طنز کے مزے شہناز شامی کٹنے پڑتے اٹھتے بیٹھے اس پر تعزیریں ہوتیں اس کی ایک ایک حرکت پر کڑی نگرانی ہوتی تھی گناہ سہارے کے باوجود کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا وہ اس آخری سہارے کے گرد چھوڑ دی تو جانی کہاں؟ وہ ساس کے لنگر پر ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑھاتی تلاش پر تنقید کرتی تو وہ سوجھ بکا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی اسے تو تب تھا کہ اس کی بیوی میں اس کا کوا تصور تھا اس نے لوگوں کا کیا کیا تھا اس نے خود اپنی زندگی قربان کر دی تھی نائب کے قریب رہ کر ایک دفا شاد اور نہ دفا شاد پر بوی

کا مثالی کردار ادا کیا تھا اگر تب وہ کسی ملک پریشانی سے نظر انداز کرتے ہے تو اس میں اس کا کوا تصور تھا اور اس کی خوبصورتی کی اعلاات کی بھی میں پس کر سکتے نہیں ہوتی تو اس میں اس کے اپنے اولوں کو بھلا کیا دخل تھا قدرت کی ستم ظریفیوں کا بدلہ اس سے کیوں لیا جاتا تھا؟ وہ اکثر سچی سچی کہہ باتیں جو واجد کی فرمودگی میں اسے سننی پڑتی تھیں واجد کا فوجی میں کیوں نہیں کہی جاتی تھیں؟

ناہیدہ کی پلکوں کے گوشے بگینے لگے آج اسے ماضی کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی وہ ان ہی یادوں میں غم کی ہر کھسک واجد کی آواز سنائی دی اوتب ہی اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو جھٹک کیا اور اٹھ بیٹھی، باہر سے واجد اور اس کی ماں کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

"عقل احمدی بیگم آج بھرتی تھیں وہ چاہتی ہیں کہ سب تاریخ پکی کر لی جائے۔"

"آئی جلدی کیا ہے آئی جان ہوجائے شامی جب وقت آئے گا۔" واجد نے کہا۔

"اسے اپنی چھٹی ہول کو کھنی تیرہ بھی ہوگا" ہیشہ پر یہ کچھ حال جاتا ہے وہاں سے اسے ڈانٹا "سید محبت میری بات کا جواب دے نہیں تو میں خود ہی کوئی تاریخ طے کروں گی" اتنا اچھا شہناز کن ملتا کہاں ہے لڑکی خوبصورت تھی ہے اور خوب بہت سچا بھی بھلے ہاں باب کی اکملی پٹی ہے، عقل احمدی آنکھوں کی جاگرواری وارث بھی ہے۔"

"آپ شکر کریں اتنی جان میں دو چار روز میں سوجھ کرے گا۔" واجد نے ماں کو بھڑکنے کی کوشش کی اور سکتا ہوا ناہیدہ کے کمرے آگیا۔ "آپ یہاں آگئی ہیں مجھی میرا باہر لان پر چلے نورا کیے تھے تو بہر حال کریم کس قدر خوشگوار ہے۔"

"واجد تم اتنی جان کی بات کو نہیں سوں اڑا دیتے ہو اس نے واجد کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔ "جب ایک ایک دن شامی کئی ہی ہے تو اس مال ٹول سے کیا فائدہ۔"

"آپ کا کیا حکم ہے" واجد نے مسکراتے ہوئے شامی سے پوچھا۔
"کر ڈالوں شادی؟"

"مجھے زیادہ نہیں اتنی جان کے حکم کا احترام نہ چاہیے ناہیدہ نے واجد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کون پڑے ان کیٹوں میں" واجد نے اپڑا ہی سے کہا۔ "یاب جگاڑا ہی حاصل ہے وہ شادی کے بعد کہاں ملے گی۔"

”میری بات ہے واجد۔“ نامید نے اسے سمجھا یا ”تمہیں اس قسم کی باتیں کہنے کی جان کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“

”آپ کہتی ہیں تو اب شادی کرنی ڈال ہوں، لیکن ایک شرط ہے۔ کیا؟“

”لو کی کو آپ دیکھ کر پاس کریں اگر آپ نے سہی نہ دینے تو ٹھیک ورنہ بچہ کوئی اور لڑکی تلاش کی جائے۔“ واجد بہ خوشی پر کراہا۔

”تھا۔ ایک بات کا اور خیال رکھئے گا،“ لو کی کسی بھی طرح آپ سے کم صورت اور حسین نہ ہو۔“

”آئی جان اور شہناز کا کیا کہہ چکی ہیں لو کی کو؟“ نامید نے ریلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شہناز کا خیال ہے کہ ایسی لڑکی اگر چلے گی تو بھروسہ تو نہیں ملے گی۔“

”آپ نے کیوں نہیں دیکھی لو کی؟“ واجد یکھانت غصہ ہو گیا۔

”کیا آپ کو میری شادی سے کوئی خوشی نہیں ہے۔“

”واجد۔“ نامید نے بات مٹانی چاہی۔ ”کیا تجوں کی طرف بالی کی کھال لٹکائے بیٹھے جاتے ہو۔“

”بھائی! خدانے مجھے کھینچنے کے لئے آنکھیں اونٹنے کے لئے بان دیئے ہیں، میں جانتا ہوں کہ اسی جان نے آپ کو ہاں بجا کیا ہوں مناسب نہیں سمجھا۔“ واجد نے دلی زبان میں کہا۔ ”جب تک آئی جان اپنی باتیں نہیں بدلیں گی میں شادی نہیں کروں گا۔“

”تمہیں غلط نہیں ہوتی ہے واجد۔ وہ تیری ہے بولی، آئی جان نے تو مجھ سے چلنے کو کہا تھا لیکن میں خود ہی نہیں گئی تھی۔“

”پھر اس سے پہلے کہ واجد کوئی جواب دیتا اس کی ماں کریمہ نے فیس نامید نے جلدی سے دھکا ہوا چل سر پر ڈال لیا۔

”کیا شو سے میرے میں دیکھو بھانوی؟“

”آئی جان،“ بھائی نے مجھ سے کہہ ہی نہیں کر سکی ہونے والی دہن تاس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔“

”کیوں جھوٹ بول رہا ہے ان بچاری نے تیری دہن دیکھی ماکب ہے۔“

اور اس کا جواب سن کر نامید نے کون سا لیا اور اس کا خیال تھا کہ واجد کا مذاق اس کا سکون برادر کرے گا۔ اس سے پہلے بھی کئی بارے واجد کے مذاق کی خاطر اس اور زندگی باقی برداشت کرنی پڑی تھیں اسے خوشی تھی کہ وہ نے اپنے طوفان سے بچ گئی، واجد بال گنگلابیں تھوڑا لڑ کر کہہ رہے تھے کہ اس نے سوچا تھا کہ ایک بڑی بلا لڑ گئی

مگر یہ اس کا خیال تھا اس کی ساس نے واجد کی موجودگی میں جان بوجھ کر بڑھائی مناسب نہیں سمجھی، دو سوسوں جب واجد گھر سے نکلا تو ہمد کو لازم کے ذریعے طلب کیا گیا، وہ آنے والے طوفان سے بے خبر تھی سر پر دوپٹہ ڈالے گون جھکے ساس کے سامنے جا کر لپ سے سلام کیا تو ساس کی آنکھ نشاں کی مانند پٹ پٹیں، پیشانی پر لپٹیں ابھرتیں، تیرہ پر ہل ڈال کر بولیں۔

”ہو لائی میں چوتھی ہوں آخر تمہارے دل میں کیا ہے کس بات کا بدلہ رہی ہوں گھر والوں سے۔“

”آئی جان۔“ وہ شہناز دہ گئی، اس نے ساس کو گھبراہٹ ہوئی وضاحت طلب نظروں سے دیکھا تو ساس کچھ اور بچ کر بولیں۔

”اے اے اس طرح بڑا کو بھی موت جیسے بچہ تھی تو نہیں؟“

”خدا گواہ ہے آئی جان کہیں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکتی، اس نے بھرتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”بس بننے دو ہونگے ہم،“ ساس جیسے ہی مٹی چھیں۔ ”میرا تھا تو اسی دن کھٹکا تھا جب تم نے میری میز پر قدم رکھا تھا، سلاخی ماں کو دوسرا پھر سے بچ کر کھائیں اور اب واجد پر اپنا جاوڑ بگائے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”آئی جان۔“ وہ چنچے اٹھی۔ ”خدا کے لئے مجھ پر اتنے بڑے الزام نام نہ کیجئے، میں بھرتی ہوئی ہوں آپ کے گھر۔“

”اب یہ مصیبت ہم کو ناہیگیم،“ سیر سامنے سوسے پہلے سے کام نہیں چلے گا، میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں کیا ہے پہلے تم نے شائبہ کو لڑنے سے شہناز اور اب واجد پر دھکے ڈالنے کی فکریں ہو، کان کھو کر تم کو ہونگے میرے جیسے ہی تم واجد پر قبضہ کر سکو گی؟“

”نامید خاتون گھڑی آ کر سوائی رہی، اس کا دل خون خون ہو رہا تھا، اس کی باکی بگی پر فستق چھوئے جا رہے تھے، اس کے ہاتھ پر کپڑے اچھالی جا رہی تھی، اس کی قوانوں کو غلط عزائم دئے جا رہے تھے لیکن اسے اپنی صفائی میں زبان لانے کی اجازت نہیں تھی، وہ شاید ہی لئے کسی کی گئی تھی کہ دنیا والوں کے نظریے سنی ہے۔

”تم نے واجد کی دہن کے گلا گئے ہیں کا چارخہ روشن کرنے کی کوشش کی ہے،“ نامید گم جھلکی تھی، ”آئی جان، لیکن ایسی بھی نہیں کہ میں نے تم پر بھروسہ کیا، ہوا میں چھید کرنے کی کوشش کی ہو، آخر تم سے واجد کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہو۔“

اور ہمد ساس کے وہ خیر برداشت ذکر کی طلب کر بولی۔

”آئی جان،“ خدا گواہ ہے کہ میں نے واجد کو بھی اپنے جوتے بھائی سے کہ نہیں سمجھا

میں اس کے بارے میں کوئی غلط بات کہے سوجھ سکتی ہوں؟

”کچھ بھی نہیں کہہ سکتی ہوں کہ واجد نے شادی سے انکار کیا تو ہمد حق میں اچھا نہ تھا، اور سونو خبردار زبان باتوں کی ہونک واد کو ملی، ”جسٹنگ میں ڈھیل ہے، یہ ہوں؟“ دے رہی ہوں جس دن سیر تیرہ گھوڑے چھپا کر نکال باہر کریں گی؟“

نامید کا پناہ خود طوفان کی زبردستی تھے چارخے سے زیادہ غیر نظر آ رہا تھا وہ گمانہ ہونے کے باوجود ساس نے غریب لائے سے بڑھ کر تھی، ساس کا ہمد سن کر اس کی غزالی آنکھوں سے سلاخ بھا دوں کی جھڑکی لگ گئی، چپکے کر دوڑا، ہاتھوں سے چھپائے وہ تیری سے باہر نکلی اور اپنے کمرے میں اگر کھوٹ پڑی، رفتے رفتے اس کی جھپکائی نہ دیکھیں، اس کا کافی ٹھنک ہو گیا، لیکن آج ان آنکھوں کو بونچھے لاکھون تھا کون تھا حراس کے ل کے زخموں پر دم رکھتا، وہ نہ چلے تھی دیکھا اپنی بیوی پر رتی رہی پھر اس نے اپنے آپ کو بچھڑا لے، یوں جیسے اسے دوسروں کی مرضی کے خلاف اسے سنبھالنے کا حق بھی نہیں تھا۔

اس روز سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا، جب تک واجد گھر سے باہر نہ رہا وہ اپنے کمرے میں رہی، واجد آتا تو وہ جلدی سے باہر آ کر ساس کے کمرے میں جاتی، اسے اب واجد سے نہ تھی میں بات کرنے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا، ”جانے ان باتوں کو اور کیا رنگ دے دیا جاتا، واجد اس کی موجودگی میں اس سے کوئی بات نہ کرتا تو ہوں بال کر کے مال جاتی تھی، مذاق کرتا تو ہم کر رہ جاتی تھی جلدی سے خود کو دیکھ کر آہن محسوس کرتی، کسی بہانے، ٹھکر دیاں سے چلی جاتی تھی۔

وقت کی طرح سست رفتاری سے رنگ رنگ گرگڑتا رہا وہ چاہتی تھی کہ واجد کی شادی جلد جلد ہو جائے تاکہ اسے ساس کے سامنے بھر جرم نہ کرنا پڑے۔ اس شام ہی وہ ہونے پر تھی تھی جس اب اس کی ساس دزدانی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، وہ بستر پر لیٹے خیالات میں محو تھی، ساس کو دیکھا تو بڑبڑا لٹھ لٹھی بڑے اس سے سلام کیا، ساس جواب دینے کے بجائے غراہ بھائی اس کے قریب آ کر بیٹھیں۔

”نامید گم،“ آئی میں تم سے دوڑوں فیصلہ کرنے آئی ہوں۔“

”جی،“ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی، آئی جان؟“ اس نے ساس کے چہرے پر جلائی کھینچوں کو دیکھا تو ہم کر بولی۔ ”آپ کچھ غلط فہمی ہیں۔“

”میری غلطی کا اگر اتنا ہی خیال ہوتا کہ آج رات یہ نوبت کیوں آئی، میں نے جبکہ کچھ بڑے شے سے بہری ہونچکا سے گھوٹی ہوئی بولیں۔“ واجد نے ضد کر رکھی ہے کہ جب تک اس کی دہن کو پسند نہیں کر گی وہ شادی نہیں کرے گا، ”اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ وہ مصیبت سے بچھڑ چکی۔

”میرا قصور تیری جوانی ہے جو خیال نہیں جاتی۔“ ساس نے اسے سزا دیکھ کر کہا۔ ”جب میرا بھگ اڑتا تھا تو بچہ بچوں کے ہاتھ لوٹ جیسے تھے، برسوں پہلے پانی حلق سے نیچے نہیں اڑتا تھا، سوکھ کر لٹا ہو گئی تھی، ایک تہہ، نمائش کی موت کے بعد سے تو میری تیرہ جا رہا روپاچہ سو ہی کر کیسے تمہارے لئے کا کاٹا نکل گیا ہو، ملنت ہے تمہاری زندگی پر نہ خود مرنا ہو نہ دوسروں کو زندہ رہنے دی ہو، آخر یہ کیا تمہارے دل میں۔“

”آئی جان۔“ وہ اپنے چلنے آنکھوں کو کیڑی زبان میں بولی۔

”میں واجد سے کہہ دوں گی کہ میں نے اس کی دہن کو دیکھ لیا ہے۔“

”اے تم کوئی بول نہ کہنے والی۔“ ساس چکر بولیں۔ ”پہلے تو اپنی چھب دکھا کر دیکھو کہ کون سا دوا دیا، اب اپنی ہی لپٹے ہونے کی نمائش کھلوا کا پانی الٹ کر ہی لگایا ہے، کیا یہ تعلیم دی تھی تمہارے ماں، دوانے کہیں ڈال کر بیٹھو اسی کو کاتے کی کوشش کرو۔“

نامید نے پٹ پٹ، اس نے سست بھری ڈھبانی نظروں سے ساس کی جانے دیکھا، ہمد کی نظرس جھکائیں، اس کی عقل حیران تھی، اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ساس کے شہادت کو فراموش کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیے اپنے وجود کو کس طرح خاک میں ملا دے، خود اس کا پنے نے دیا جان بن گیا تھا اور ابھی وہ ان ہی خیالات میں غرق تھی کہ شامی آگیا۔

”سلام لوں کرتا ہوں جی جان۔“

”جیسے رہے۔“ اس کی ساس نے بھیجی ہوئی سہا، آواز میں جواب دیا، پھر غراہ سمجھا تھی بولی، انھیں اور نامید کو نظروں سے گھنٹی ہوئی باہر چلی گئی وہ ساس کے چلنے کے بعد بھی تصویر جیت جی گھڑی رہی یوں جیسے وہ گوشت پوست کی صورت نہیں بلکہ پتھر کا کوئی خلیہ ہو رہی تھی، جیسے اس کے سینے میں ل نہیں تھا، دل میں جذبات نہیں تھے، وہ گھر تھے تو اسے ان کے اظہار کی عزت کہاں تھی۔ ”نامید صابر،“ آپ کچھ پریشان نظر آتی ہیں؟ شامی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر رہی، اس نے نظرس اٹھا کر شامی کو دیکھا پھر جلد سے ایک بچہ کہہ رہا تھا، ”جی جان، تو میں اس کے قریب آ کر بیٹھ رہی۔“

”جی نہیں،“ میں تو کوئی بات نہیں کہنے تھیں، ”میرے نظریے رکھئے۔“

شامی نے اسے نور سے دیکھا، خاموشی سے گئے، ”میرے یہ۔“

کسی پر مچ گیا، آتش دان کے اوپر کھینچے ہوئے نور میں ہی ہوئی تھابت کی تصویر ان دونوں کو بڑی خمیدگی سے نگہ رہی تھی کچھ دیر تک، احوال پر ایک ناخوش اور بھول سی خاموشی طاری رہی پھر نامید نے گھٹکی اٹھا لی۔

”آئی بہت دنوں بعد آنا ہوا آپ کا۔“

”سوچا تو تھی بار تھا لیکن پھر لڑا وہ مٹو کر دیا،“ شامی نے شائبہ کی تصویر پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”واجد کو چھوڑنا ہے آپ کو؟“ ناہید نے بول ہی کہہ دیا۔
 ”میں جانتا ہوں کہ اس گھر میں اب صرف واجد ہی کو سیرا نظر آ رہا ہے۔“ شادی کا بوسہ خیر تھا۔ ناہید چوکی آئے تھیں ابھی کہی ہوئی وہ بات یاد نہی جراتاب نے دہرائیں اس سے بھی تھی، ایک لمحے کو اس کا دل بھڑکا لیکن اس نے فوراً ہی دل کی دھڑکنوں کو روک دیا۔ موضوع بدل کر بولی۔

”آپ کے کاڑے بارگاہ کیا حال ہے؟“
 ”دنیا کے کاڑے بارگاہیے ہی دیتے ہیں ناہید صاحبہ! اس بارشانی نے بڑا راست اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کیا۔ ان آنکھوں میں جلنے کیسا غلط چل رہا تھا شادی اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا وہ جانتی تھی کہ شادی کیا ہے گا چنانچہ بات بستی میں لڑائی چاہی۔

”آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید بڑے میں خسار ہو گیا۔“
 ”جی ہاں۔“ شادی کی حالت جذباتی بن گیا۔ کچھ خیر سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان اپنی زندگی کی قربانی دیکر بھی بوسے نہیں کر سکتا۔
 ”واجد کی شادی کا علم تو ہوا چھوڑنا آپ کو؟“ ناہید نے پھر بات اپنی چاہی۔ ”آج کل سرورقت ہوتا ہوا رہتا ہے۔“

”آپ کو خوشی ہے واجد کی شادی سے؟“
 ”جی۔“ ناہید چونک کر پڑی، شادی کا سوال اس کے معصوم ذہن کی گہریوں کو اور گہرا کیا۔
 ”جو خوشیاں دوسروں کو نہ کر سکا حاصل کی جائیں انہیں آپ کیا کہیں گی؟“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“ ناہید نے وضاحت چاہی۔
 ”میں بھی جان سے سب کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکا ہوں۔“ شادی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے ضبط کی راد دیتا ہوں ناہید صاحبہ! جن حالات میں آپ سکر رہی ہیں میں تو انسان ہونے کے تصور سے بھی لرز اٹھتا ہے۔“

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں شادی صاحبہ! میں ایک ہیرو ہوں۔“ ناہید کا درواں کی زبان ٹکڑی گئی۔ ”زندہ رہنے کے لئے تو جانوں کو بھی کسی کیسے ہمارے۔“ وہ انداز کا لہجہ تلاش ہوتی ہے۔ ”میں تو پھر بھی ایک انسان ہوں۔“
 ”غیب کی طرح کیا موزی ہو گی؟“

ناہید نے پناہ بڑھتی تھی سے داخل تھے پہنچ گیا غائب کے ذکر نے اس کے دل کے بستے ہونے شروع کر دیے تھے۔ وہ ان کی کوشش کی تھی۔ وہ ان کی کوشش کو دل کے ہنس خانوں میں مقید کھینے کی ہمت نہ تھی۔
 ”ناہید صاحبہ! کیا آپ کو علم ہے کہ تاجاب آپ کے کس قدر محبت

کر رہا تھا۔“ شادی نے اس کے چہرے کی داسوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس بات کا احساس اندر ہی اندر گھلاتا رہا تھا کہ اس نے آپ کے ساتھ ظلم کیا تھا اسے بچی جان کے اگے مجبوراً اس کی بچی بچی تھی اسے ہر لمحہ آپ کی فکر پریشان کرنے رہتی تھی اس نے زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے ایک وعدہ بھی لیا تھا۔“
 اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں...

”خدا کے لئے شادی صاحبہ! اس سے لگے کچھ کہیں گے گا۔“ وہ پھر بولی۔ ”آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس سے واقف ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔“ یہ بات جو شادی بول رہی تھی اس سے واقف ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔“

”میں تنہا دوست ہوں ناہید صاحبہ! میں اپنے مزاج پر دست کی آخری خواہش پر تسلیم کر رہی ہوں گا۔“ شادی نے ہنسنے سے کہا۔
 ”میں آپ کے حکم پر چار ہوں۔“ اگر کسی آپ کو میری ضرورت پیش آئے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔“

اوشادی چلا گیا تو ناہید کے ضبط کے سامنے بند ٹوٹ گئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔ اس رندہ پہلی بار اپنی مرضی سے دل ٹکڑی کر دی تھی۔



واجد کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تو گھر میں ہانوک کا آئنا بندہ گیا۔ شہناز بندہ روز شہر سے اپنے چوں بہت اگلی تھیں ناہید پہلی دفعہ سناپنے کمرے تک ٹھہر کر رہی تھیں۔ اب اس اوندھ کے کمرے میں ہونوں کے سامنے جلنے کی اجازت نہیں تھی شاید اس لئے کہ وہ خوشی کے وقت ہراس کی پریسیوں کا سایہ روز گھنٹا بجاتے تھے ناہید نے اس کو بھی کوئی احتجاج نہیں کیا وہ اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ کبھی واجد آتا تو وہ ہم جاتی لیکن اپنے واجد سے بات کرنے میں خوفزدہ نہیں ہوتی تھی۔ ناہید نے شادی پر رضامندی کا اظہار کر کے اس کے وجود کو اس چہرہ دیواری میں سانس لینے کا سہارا دے دیا تھا۔
 آئے خود بھی تو واجد کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ ایک واجد تو تھا جو اس گھر میں اس کا ہمراہ تھا۔ جن کی خاطر وہ اپنے غموں کو بھول کر سکر دیا کرتی تھی۔
 اس نے واجد کو گھٹے جھانپوں سے جھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب واجد کی شادی ہوگی تو خود اپنے آنکھوں سے اس کے چہرے پر ہنس کی لڑیاں سمائے گی۔ وہیں بیاہ کر کے گی تو وہ بہنوں کی طرح واجد سے بیگ لے گی، لیکن یہ سب خواب خواب ہی رہ گئے تھے۔ ان کی تعبیریں بھی اس کی بھینچ رہی ہیں دب کر سکر گئی تھیں۔

اس شام واجد کی اینٹ کی رسم ہو رہی تھی، ہاجرین سے کھینٹے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں اس نے دوتے دوتے دروازے کے قریب جا کر

ہجری سے باہر چلا نکلا۔ بھڑکے لباس میں ڈھیر باری لوگ اب بھی وہیں اب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اس کے دل میں ایک ہلکے سا کھینچا۔ وہ دروازے کے قریب سے ہٹا جاتی تھی اسے داخل نظر آیا پہلے کپڑوں میں اس کا بھولا بھالا چہرہ کے مقدور معصوم نظر آ رہا تھا اس کی ماں اور بہن اس کا بازو تھامیں خوشی کی جانب لاری تھیں جہاں انہوں کی رسم ادا کی جانے والی تھی، واجد محبت کے قریب جا کر گنگ گیا اس کی نظریں ناہید کے کمرے کی مائیں تھیں تو ناہید کا دل دھڑکا۔ غائب ہی اس نے واجد کو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا تو دروازے کے قریب سے ہٹ کر اپنی سہیلی لگتی لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر خوشی کا گیت جھڑک رکھا تھا۔ ”وہ گیت کے بولوں سے زیادہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو گھسیٹ کر بولی تھی وہ جانتی تھی کہ واجد اس کے کمرے کی طرف تھیں آ رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ سے باہر جانے کی شدت سے گگا اور واجد کی ضد کی خاطر اس پر پھلانگ مارتے تھے۔ جاس کے بھری غفلت میں رسوا کیا جائے گا اس کے والدین کی مقدس وحوش کی شان میں تیسرے طرح سے جائیں گے کیا بھری غفلت میں وہ اپنی ذات پر شانت کر لیں کیا یہ عورت کے تقدس کی توہین کی انتہا نہ ہوگی؟“

دو تے پر دستک ہوئی تو وہ تیسری سے اٹھ چلا دیوار کھول کر اس کی آوازیں گونجی، وہ واجد سے اس وقت سا۔ ناگہان سے گھر پر تھی اسے معلوم ہوا کہ واجد کی کھنکھانے کے گھر پر ہوا ہے گا۔ اندر کمرے میں گپا نہ ہیرا تھا اس نے اپنے وجود کو نائیکوں میں ڈھک کر لوٹنے کی خاطر روشنی نہیں جلائی تھی وہ اپنے ہی گھر میں اپنی بکرہ گئی تھی اپنی نظروں میں خود کو چھوڑ کر رہی تھی۔

اندر کمرے میں جی جی تو اس کا دل دھک سے ڈگایا وہ سسٹ کر دیوار سے جھٹ گئی۔ ساری موروشی کا سنگم اس کی بڑھ کی کیا کی گئی کو بچے لگا رہا تھا اور تب ہی واجد کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔
 ”آئی جان، بھانجی کہاں گئیں؟“
 ”گھر ہی میں کہیں ہو گی، جانے گی کہاں۔“
 ”میں دیکھتا ہوں۔“ واجد کے لہجے میں اضطراب تھا۔ بھیرا کے

قدروں کی آہٹ دور ہوئی ہوئی خوشیوں کے گتے میں گم ہو گئی ناہید کے سینے میں غموں کا سیلاب بڑھ چلا تھا اسے یقین تھا کہ واجد اپنی دھن کا پکا ہے جب تک وہ اسے تلاش نہیں کر لے گا۔ ان کی رسم پوری نہیں ہوئے دنگا کیوں زوہ خود ہی سامنے آجائے اسے سالانہ زندگی جڑ گیاں ہی تو خوشی پڑیں گی، ”اے ملین فرشتہ اپنے گھرے کی لیکن واجد کی خوشی تو پوری ہو جائے گی، واجد جسے اس نے بھائیوں کی طرح چاہا تھا اس کے لادے ریت کی دیوار کی طرح ڈھونڈنے لگے۔ وہ واجد کی خوشیوں میں شریک ہونے کا مصمم ارادہ

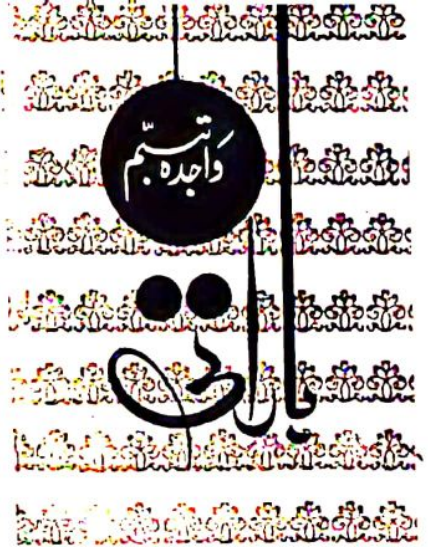
کر کے آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ اندر سے شہناز کی آواز سنانی رہی۔
 ”کیا بات ہے بیٹی؟“ ناہید کہاں چلی گئی؟
 ”آواز دھڑکنوں کا کیا بھروسہ؟“ بھگت گئی ہوئی گئی کے ساتھ۔
 اور اس کے وہ افغانا سننے کے ان کی طرح ٹوٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے، وہ اس خاش کو روشتہ نہ کر سکی اس کے صبا کا یہ نایک ہی جھٹکنے میں ٹوٹ کر بھڑک گیا۔ ”ریزہ ریزہ ہو گیا اس کا سالار وجود ریزہ ریزہ ہو گیا اسے زمین اپنے چروں تلے سے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی آج اس کے جذبات کو بڑی طرح کھلا گیا تھا اس کی قربانوں کی توہین کی گئی تھی، اس کے دھڑکنوں کی دھڑکی تھی اس کی شرافت کو رسوا کیا گیا تھا اسے گھر کے دروازے پر گھومتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے آج اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑے تھے اور تب ہی اس کے لاشوں سے شادی کی آواز بھری۔

”آگاہ کو میری ضرورت پیش آئے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔“
 ”مجھے محبت کر دینا تاجاب؟“ ناہید کے کپکپاتے بونوں سے ایک آواز ابھر کر خوشیوں کے چنگاموں میں ڈوب گئی اس نے گھر کی دیوار کو آخری بوسہ دیا پھر تاریکی میں لیے قدم اٹھائی پھاٹک سے باہر چلی گئی۔ !!

پاکیزگی نہیں متوجہ ہوں

- 1 اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے خط کا جواب آپ کو جلد ملے تو پتہ لکھا ہوا جوابی پتہ ضرور بھیجیے۔
- 2 مختلف مقامات سے تعلق رکھنے والے مضامین اخبار سول اور شومے طرہ طرہ کاغذ پر لکھیں اور ہر کاغذ پر اپنا نام اور مکمل پتہ ضرور لکھیں۔
- 3 بائبل ان شامت مضامین مٹانے کو دیتے جاتے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ ان کی ایک نقل اپنے پاس رکھیں۔
- 4 اگر آپ پکیو کی سالانہ خریداری چاہتی ہیں تو پکیو کی ایڈریس مئی آئڈنڈیج دیکھیں یا دفتر کو ایک خط لکھتے ہوئے تو آپ کو ایک سال کے لئے پچہ خرید و بی بی دوا کر دیا جائے گا۔ جو آپ ڈاکے کو پکیو پر پہنچائیں۔ دسے کروڑوں کر لیں گی اس طرح آپ کو سالانہ خریداری دیا جائے گا۔
- 5 انسانے اور دیگر مضامین سمیٹنے کی کوئی خاص شرط نہیں ہے وہ آپ حسب ذیل پتے پر جڑی یا آٹا تک سے بچ سکتی ہیں۔

پاکیزہ، پوسٹ بکس ۲۵۳، کراچی



میں لال ہوڑا میں لوں؟
 اتنی، میں وہ کامانی والی بیلی ساڑی میں لوں؟
 "خالد جان، میرا سنت لڑا آپ کے منہ نیچے میں تو نہیں
 "ہائے تھی، میرا وہ گونا گونی والی اور وہ کدھر گیا؟"
 اتنی خوش دلی سے سر کے مطالبات پورے کر رہی تھیں۔
 سب کو شہرہ بھی دیئے جاری تھیں، خوشی ان کے چہرے سے چھوٹی پڑی تھی
 "اللہ تھی، ہم گھوڑوں والی گھٹی میں ایرپورٹ جائیں؟"
 رونا نے اپنی بی بی پوٹی گھنٹے بونے سوال کیا۔
 اتنی منہس پڑیں، اری لڑک باولی ہوئی ہے، کیا کوئی برآ
 جاری ہے کہ گھٹی پر جائیں گے بے چاری۔ ڈرائیور سے کہو موٹر
 نکال لے۔

ان سارے بچہ گاموں سے بے پردہ شادی، جو کچھ میں ناشتہ
 تیار کر رہی تھی، اب ذرا چوکی ہوئی اور رونا سے مخاطب ہو کر بولی "بھتیو یہ
 چکر کیا ہے آخر؟"
 "اے اللہ! تم تو ذرا صبر نہ کرنا، بلکہ ہاتھی، اونٹ اور گدھے
 تک بیچ کر سوتی ہو، پتہ نہیں رات کو اقبال ماموں کی شرمک کال آئی تھی کہ
 آج رات سرفراز بھیا امریکی سے لوٹ رہے ہیں۔"
 "اقبال ماموں کی شرمک کال؟ خود سرفراز فون نہیں کر سکتے
 تھے کہ میں فلاں دن اور فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہوں؟"
 رونا جل کر بولی "تم تو سدا زیندا اور خواہوں کی دنیا میں گھوٹی

ہو گی۔" ہانگ بی سب تو انہوں نے اقبال ماموں سے کہا، پہلے تو
 انہوں نے خود ہی فون کرنا چاہا، لیکن لال بہت گڑبگڑ تھی، اس لئے انہوں
 نے ماموں کو فون کر کے کہہ دیا کہ آپ میری بی بی کی شرمک پہنچانے کے لئے
 جھلا کر کہا "مگر تم کیوں کی طرح بس جرح کر رہی ہو گی یا تیار رہی ہو گی؟"
 "میں؟ شادی گھر کر بولی، میرا بھلا ایرپورٹ پر کیا کام؟"
 "اور میں سب تو گویا وہاں بھیتا کے ہلدی چڑھانے جا رہے ہیں؟"
 پاگل کہیں! چل نکلا۔"
 "نہیں نہیں رونا، تم لوگ جاؤ، میں اتنی کے ساتھ چلوں گی۔
 گھر بھی تو آتے سارے کام میں؟"
 رونا بھی اتنی سے شکریت کرنے والی تھی کہ وہ خود ہی بولی
 انہیں۔ "لے لے، اب وہ نہیں جانا چاہتی تو تم کہیں مجھ پر کڑی ہو؟ آخر کو
 اللہ کے حکم سے سرفراز گھر پہنچ گئے، میں مل لے گی۔ جاؤ بیٹی تم کم سے
 کم پڑے تو بدل ڈالو؟"

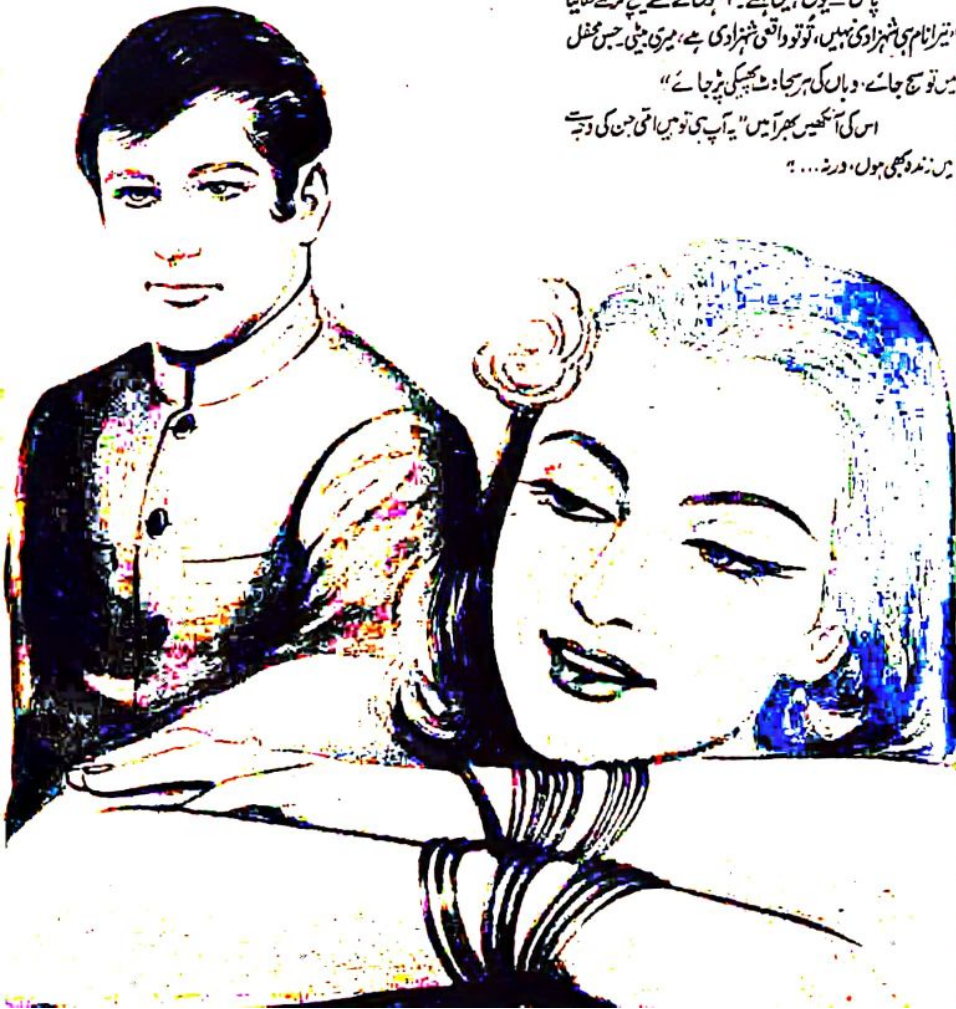
شادی نے اپنے بڑوں پر ایک نظر ڈالی "اچھے تو ہیں اتنی؟"
 "مجھے تو میں نے بھی نہیں کہے، لیکن ذرا دیکھو تو اور دوسری
 لڑکیوں کے مقابلے میں کیسے پھیکے لگ رہے ہیں؟"
 شادی نے ایک نظری کو دیکھا۔ مونہر سے کچھ نہ بولی،
 سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
 رونا، شرمک، شلو، چینی کو مخاطب کر کے اتنی بولیں "کچھ پتہ
 ایرپورٹ سے بھائی کو لے کر سیدھی گھر آنا، اور راستے میں خدا کے
 آئیں کریم اور دوسری لالہ بلاؤ تو دکھانا اور دیکھنا، بولی بھوک
 مر جاتی ہے، میں نے گھر پر بہت کچھ تیار کر لیا ہے۔ اور تہہ ہری سب
 سہیلیاں آگئی ہیں یا نہیں؟ دیر نہ ہو جائے۔"
 "اے تھی، چینی جیت سے بولی۔ "ڈرننگ روم سے کان
 پیٹ کر دینے والی آوازیں آپ کو نہیں سنائی دے رہی ہیں کیا؟ پوری فوج
 اٹھی ہو گئی ہے۔"

دو کاروں پر لڑکے اور لالہ بلاؤ خدا کے راز ہوا۔ ان کے
 جلتے ہی شادی اپنے کمرے سے نکل کر کچھ کی طرف چلائی۔ اتنی نے اس کی
 طرف دیکھا۔ نیلے رنگ کی سوئی ساڑی، اسی رنگ کا بلاؤ، سنہارا
 میک اپ کچھ نہیں، زیور کے نام پر کانوں میں جھلکی بالیاں تک نہیں، ہاتھ
 پوڑیوں سے بے نیاز۔ ڈانگو ٹی ڈالا، ڈکاجیل، ڈپوڈر۔ لگتا ہی
 نہیں کہ یہ اسی دن نے لڑکے کی گڑبگڑ لڑکی ہے۔

"شہزادی؟ اتنی نے پیاسے پکارا۔
 وہ پٹی تو اتنی بولیں "ادھر آؤ بیٹی۔"
 اس کے شرمک کا مرکز اس کی خوبصورت گلابی سی ناک تھی۔
 میں میں ایک چھوٹی سی میرے کی ٹونگ لٹکتی رہتی تھی۔ وہ ناک اور ٹونگ۔
 فنانڈ بھیر کی ساری لڑکیوں کا مولا تھی۔ اس کا خاموش چہرہ، مگر لولہ
 انہیں، ساری دنیا کی گویا اتنی کے شمار۔ وہ لوں ہی گھڑی رہی۔
 "تم نے دیکھا نہیں شہزادی، ساری لڑکیاں یوں ہی منہ کر
 ایک سے ایک بھاری کپڑا پہن کر گئی ہیں، مانگو سی شادی میں گئی ہوں، ان
 سے کیا تمہارے پڑے میل کھاتے ہیں؟"
 "میں بھی تو ان سے میل نہیں کھاتی اتنی؟"
 "پاگل۔ یوں نہیں کہتے۔ انہوں نے اسے کھینچ کر گلے لگایا
 "تیرا نام ہی شہزادی نہیں، تو تو واقعی شہزادی ہے، میری بیٹی۔ جس منہ
 میں تو سوج جائے، وہاں کی ہر سیاحت بچہ کر جائے۔"
 اس کی آنکھیں بھرا "یہ آپ ہی تو ہیں اتنی جن کی وجہ
 میں زندہ ہو بھی ہوں، ورنہ...."

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹی۔" سمجھاتے سمجھاتے اتنی
 کی اپنی آواز بھی موند کر رہ گئی۔ "جاؤ ونو، دھولو، ایسے خوشی کے دوتی
 پر آسو میں یہاں چاہتے بیٹی۔"
 وہ اٹھ کر گئی تو اس کے بے پناہ گھٹنوں کو جھوٹے ہنسنے
 لیے بے بال دیکھ کر اتنی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پتہ نہیں کس خوش
 نصیب کے مقدس میں یہ سیاہ گھٹائیں لٹکی ہیں؟"

مغرب سے ذرا پہلے باہر باران کی آوازیں زرد شہر سے آئے والوں
 کی آمد کا اعلان کرنے لگیں۔ اتنی بدحواسی ہو گئیں۔ سید گھنٹہ سی ہونی
 وہ باہر کو پکیں۔ نوکروں کا ایک قافلہ بھی پیچھے پیچھے دروازہ بند کر کے نکلتا



کی طرح بچیں کھین کرتے بے حساب لڑکیاں کا دل میں سے اتنی ہی تھیں۔
جانے سر فرزا کدھو یا بیٹھا ہوگا۔ اچانک اسی کہہ کر وہ بیکار اور ان کی
پانہیں اُس کے گلے کے گرد حائل ہو گئیں۔

ای سے بار بار اسے پیار کیا اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں سے کر
بولیں "میرا جان کتنا گوارا ہو گیا ہے"

رہنا چمک کر بولی "اے بے کوئی ایسا گوارا بھی نہیں ہوا آپ کا
چاند۔ وہ کیوں لڑا سنگ جو تھا سچے یہ تو ساری ٹیوب لائٹس کی کراہت
ہیں جس کا ٹھکانہ آپ دیکھ لیجئے گا۔"

"اے بیٹا دیکھ لینا۔ پوسے بند رہ سال امریکہ میں رکھ کر لیتے
"خدا کا شکر ہے کہ وہ تو نہیں بچوے۔ کسی لڑکی نے مجھے سے
آواز نہ سنا۔ وہ وہاں رہ کر نہ والے دو تھے تو ساتھ لاتے ہی ہیں۔ انگلیش
اور ہم۔"

"یہاں کی لڑکیاں کون بھوں سے کم ہیں تو اب پورٹ پر
سپنا ہی لگیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ ایسے بچیلے اور بچر کیلے کپڑے ہاں نہیں ہوتے
بس۔"

"اچھا چلو بیٹا۔ پہلے ہاؤس کو کھانا کھا لو، شکے ماندے
آئے ہو گے۔"

سر فرزا زور سے منس دیا۔ اسے اسی آپ کا بھتیجی میں کہ
یہ ہوائی جہاز والے ناختم کرتے ہیں، جو کہ ہی آپ بچے چرخ کی طرح
کھانا کھا لاری ہیں؟

"لے جی۔ چینی خوش دلی سے بولی۔ یہ بہت موٹو کی
آیا ہے آپ کا بیٹا۔ اس نے کھانے، وانا بعد میں پہلے سامے غصے کھائے۔
تینوں سوٹ کس پہلے ہی وہ بنگلہ گامری کا سر فرزا نوٹ کر
بھاگ کھڑا سو۔ اری بیو۔ اب تم ایک دو سیکر نوٹ کی رہو۔ وہ اینا بھٹ
گاؤں کے کر نائب ہو گیا۔

اور زندگی میں پہلی بار اُس شخص نے جس کا نام سر فرزا تھا۔
اور جو واقعی زندگی بھر سر فرزا چلا آیا تھا۔ آج اپنے آپ کو کسی کے آگے
جھکا محسوس کیا۔ بلاشبہ وہ شہزادی تھی۔

جب وہ ہانے کے لئے ہاتھ روک کر طے جا رہا تھا تو راستے
میں کارڈ میں اس نے ایک ایسا عجیب و غریب منظر دیکھا کہ وہ وہیں ٹھہر
کر رہا۔ پہلی سڑکی، پہلے بلڈز میں لمبوس ایک گلیں لڑکی۔
روٹی لٹی کسی آنکھیں کھلے ہاں۔ ایسے ہاں نہ بچر تھی اُمتے ہاں آنکھیں
ہر نہ تھیں۔ جتنا تھے چہرے پر آنسوؤں کے ٹھکانے۔ اور اس پر اس کی ناک
میں لٹی دھکی تو ناک کو جھلاہٹ۔

جب سر فرزا وہیں ٹھہر کر دیکھا تو وہی عجیب و غریب لڑکی اور ہاتھ
اس کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ گیا۔

سر فرزا اس قدر بہت تھکا کہ وہ سلام کا جواب نہ کھائے۔
"شادی؟ کسی لڑکی نے چلا کر آواز دی۔

اور وہ ہرگز نہ گئی۔ "مجھے دیکھو قدموں سے کبھی اس کا
پڑھنا زدی کی طرح وہ جلتی گئی۔

"تو نے بیکر بندوستان جنت نشانی، یہاں ایسی ہی لڑکی
بھی موجود ہیں؟" سر فرزا نے جیسے خواب سے چونک کر سوچا اور امریکی لڑکی
ایک سیٹی بچا کر ہاتھ چلا گیا۔

دوسرے دن کی صبح ایک جھگڑا ملائی جو کسی طور شادی پر
سے کم تھا۔ جان بچان والیاں، جلتے جلتے دایاں، ششے واپسیاں
جس کے گھر میں جوان بھیاں تھیں، انہیں سچا سنو کر گزرا ہوا تھا
آئی تھیں کہ ایسے ہی تو تھے جو تھے جس جب لڑکی بچے اس نے نہ
سر فرزا کی چاؤں بھوں کی بیویوں سیلن نے سے نے نفی کیے ہوں۔
میکسی شرا نے غراے۔ جینس پوری راہ اور جانے کون کون سے
اور کچن کچن ترش خراش کے ہاں لاکر آئی تھیں۔ اب وہ دن گئے۔
مائیں لڑکوں کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی تھیں اور لڑکے سر فرزا کے گھر پر
تھے۔ "جی ائی، بھلا کچھ آپ کے میں کپڑوں کا تھا، دیا ہوا لڑکیاں
آپ کی بہن میری پسند" اب تو وہ دماغ آگیا ہے کہ لڑکے خود لڑکیاں
ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اور لڑکیاں ڈھونڈ کر مائیں پالنے سے کہتی ہیں۔
میں تو اس لڑکے کو پسند کر چکی۔ پلڑے، شادی کرادیجئے، پھولس لے لیں
موقع اور کون سا لڑکی امریکہ سے آجینڈنگ کے اعلیٰ ڈگری لڑکیاں
سم لڑکا، جسے پہلے ہی سے بڑے پیسے کی کوئی گئی تھی، اور اب تو انا
میں کیلے گا۔ یوں آسانی سے مل جائے۔

سر فرزا کے بیڈ روم میں لڑکیوں کا جھگڑا تھا۔ ماسوا لڑکیاں
کے اس کا کہیں دم نہ لڑا تھا۔ ہاتھ اس کو بہت امریکہ نے بھی تو
خاصی لڑکیوں کی زندگیاں رہا، یاد رکھ لیں میں۔ بس ایک ڈالر کا ٹیبلٹ
جس نے اسے آنکھوں پر پرے ڈال رکھے ہیں۔ اب "تھو گیس کس کے
جاگیاں اور کس پر سر فرزا کی نظر انتخاب پڑے۔ پھر تو امریکہ کے لئے
پھر سے ہوا کر گئے۔
"تو آپ ہاں خود ہی اپنا کھانا چاکا کرتے تھے؟
"جی اری کیا۔ وہاں جو کڑوہ تھی ہوتے ہیں انا وہ
نہیں رکھ سکتے۔ پھر یہ بے چارہ تو غریب عجیرا۔"

ہاتھ سے لڑکیوں میں خود کو پایا کر نہ کر کے یہ سر فرزا لڑکا
اب کس کا جی نہ چاہے گا کہ اس نے چاہے غریب کو اپنے سینے سے دگلا لے
ان کے قدموں میں اپنا سر ڈھکائے۔ جس بے چارے نے خود اپنے ہاتھوں
لے نہ لکھنا لڑکا یا اس کے لئے ہاتھوں میں نہ جانے
"ہاتھ۔ تو بھلا ڈھکی آپ خود ہی لگاتے تھے؟"
"اسے بھائی، وہاں اس طرح اپنے ان کی سی بھلاؤ کا قصو
ہی ہیں۔ بس ایک لڑکی دیکھ کر کہیں کھینچتے ہیں شیشی کر کے ٹمن دیا یا اور
زوریں کر کے گھر صاف۔"

"اور مرگئی آپ ہی دھکتے تھے؟"
"یعنی آپ کا مطلب ہے خوش واشنگ؟ ہاں وہاں دس
راشر لے میں بس سامے تون ایک مین میں رکھ دو، پھر سوڈا صابن
ڈال دو اور پھر وہی جی کا چکر۔ امریکہ زور لڑکیوں کو وہ سخت نہ چاہتا تھا۔
ہاتے۔ اونی۔ اود۔ باؤ۔
بس طرح طرح کی مرنی اور بے مرنی آوازوں سے اس کا بیڈ روم گونج
رہا تھا۔

اور پھر یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو کام وہاں میں انٹر مشن
ہوتے ہیں۔ جنہیں پکانے کو کانے سے دھپی نہیں اور در کام جو ترم کے
ہوتے ہیں، ان کے لئے ڈولوں میں بند پکے پکے کھانے لے جاتے ہیں۔ بس
فیلڈ لڑکی ڈولوں میں گرم کر لیا اور کھانے لگتی۔ "گاریج" میں پھینک
دے۔ کام چور خواتین کے لئے دس پونڈ لگ پٹشیں ملتی ہیں جو ایک بار
استانی کر کے پھینک دی جاتی ہیں۔ اور پھر سراسر شرات اپنے آڑی کیلئے
پر اتر آیا۔ اور دیکھ تو وہاں اس طرح کی لڑکیاں ہی مل جاتی ہیں، جنہیں
ایک بار کا نہیں لکر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے عام طور سے شریف مرد
شادی دادی کے چکر میں پڑتے ہی نہیں۔

کئی چہروں پر لڑکیاں مری گئی۔ وہ نطفہ اینٹار ہا پھر جالی
بھرنے کے سے انڈاز میں بولا۔ "مگر وہاں سے جواب نہیں امریکہ۔ اس قدر
نا جواب شاہنگ سٹیز، جنہیں وہاں پلازنگا جاتا ہے۔ ہزاروں ایک سے
بڑھ کر ایک پلازا۔ اور ایسی ہی چیزیں جو ہمارے ملک کے لوگ تو
بے چارے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ یہاں کی طرح نہیں کہ جو کچھ چیز
لینا ہوتا تو چلے جاتے ہیں توکان دار کے پاس کو صاحب اس چیز کے کیا دام ہیں؟
اسے جناب، وہاں تو بس یہ ہے کہ خوب شے بٹے ہاں جیسے ہوتے ہیں، جہاں
بڑی بڑی ٹیبلٹ پر سامان بچا ہوتا ہے۔ ہر چیز کے دام کی چٹائی ہوتی ہے۔
کپڑے میں تو ایک سے ایک اعلیٰ، بیگنڈے نپٹے جوتے، جانیے، پینے، دیکھتے۔

آپ کے ہاں تو قد آدم آئینوں میں اپنے سراپا کا جائزہ لے کر خرید لے
ہر چیز ایسی ذم تیار یہاں آپ کے ہندوستان کی طرح نہیں کہ گاڑی خریدنے
کو آج جی چاہا رہا ہے اور کب کر لیتے تو لگے سال لے۔ اسے صاحب میں
طرح چٹ مگنی بیٹ سیاد یہاں ہوتا ہے نا ایسے وہاں امریکہ میں ہر چیز
ہوتی ہے۔ اور بے بڑی قور بے کے آپ کو پھر پیر آئی ہیں ڈالز بھی
نہیں دینے پڑتے۔ وہاں جا دو کا ایک کارڈ کے پاس ہوتا ہے جو آپ ہر
کو دیکھ کر دکھاتے جاتے اور لڑکے کے چراغ کی طرح آپ کا ہر کام غلام کرتے
جاتے۔ تو اب آپ ہی سوچئے صاحبان کہیں کہیں دنیا کو تیاگ کر یہاں
آ گیا ہوں۔"

"بھائی جان، اب خدا کے لئے خدا خود اتار لے۔ جوں کیرا
میگرین پڑھ کر اتنی ساری باتوں کا پتہ نہ چلتا تو اب آپ خواہ مخواہ شان بگلا
پر تلے مئے ہیں؟ شلو چکر بولی۔

"اور کیا۔" چینی نے ہاں ہاں ملائی۔ اور یہ چورے
ماسے تحفے لائے ہیں آپ کو کیا یہ چکر ہاں نہیں لے، بس اس میں یہ ہیں
جلانا چاہتے ہیں۔"

"توجہ۔" وہ اطمینان سے رضائی میں پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔
"اچھا یہ تو سنئے بیٹھا؟ رونا ڈولانے کے انداز میں بولی "وہ
دن بعد اسی نے اور ہم نے آپ کی واپسی کی خوشی میں ایک بے حد زور پلائی
ہیجے کا اہتمام کیا ہے جب تک آپ کی شکرانہ توڑ جائے گی نا؟"
"اری بیٹا۔ ہماری شکرانہ تو کل لے ہی آگئی، تم کیا جانو اس
کے تصور میں دوست خرام ہی ابھر آئی۔

خائے سے ناغہ ہو کر سر فرزا اسی کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ دوسرے
اہتمام سے نام بھواری ہیں۔ رونا، اس کی دو چار آگئی سیلیاں تھیں نے
بہاں کے نام پر پٹشیں کیا خرافات ہیں کئی تھی بے حد شہزادی تھیں۔
اور وہی پٹاری کی دل کو لوٹ لینے جتا وہر باکر نے والی بے مرنی مصوم
لڑکی، مونہ میں بین رہا ہے جیت سے کبھی اس کو کبھی اس کو دیکھ رہی تھی۔
"شادی، میری چوہہ سیلیاں ہیں۔ ویسے تو بہت ہیں۔ میرا
مطلب ہے فاسٹ فرینڈز۔ بھول نہیں جاتا۔"
"اور شادی، میری۔"

وہ وہیں اسی کے بازو پر ٹکا گیا۔ یہ شادی شادی کا کیا چکر
ہے اقی؟
چینی تڑپے بولی "یہ شادی زادی ہے نا؟ اس کا نام تو شہزادی

ہے لیکن ہم لوگوں نے نام نہاد چھوٹا کر کے شادی کو لیے، لیکن بلاس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ اٹھالبا نام لیتا پھرے؟

(میرا بس چلے تو ساری عمر کسی ایک نام کا وظیفہ کرتے کرتے زندگی گزار دوں۔) اس نے نگلیوں سے شادی کو دیکھا۔ مسکراہٹ کا ایک ہلکی سی لکیر نے اُس کے پوسے چہرے کو گلاب بن کر رکھ دیا تھا۔

"ای، اب تو قریب سا ہے اسی نام ہو چکے، پھر وہ بالکل سادگی سے اپنا ایک ہی سرفراز سے مخاطب ہوئی۔ "اچھے بھی کوئی دوست ہوں تو نام لکھو ایچھے کل تک سب ہی کو کارڈ بچو لگے ہیں"

"دوست؟ میکے؟" وہ مڑی طرح مڑو لگا پھر وہ سنبھلا۔

اتنی کی موجودگی کا خیال کرتے ہی اُس نے بہت احتیاط سے ایک جگہ ترتیب دیا۔ اگر دوست کسی ایسے شخص کو کہتے ہیں جس میں چاہوں، یا چاہتا ہوں تو تو میرے خیال میں میرا صرف ایک ہی دوست ہو گا اس دنیا میں۔ لیکن چوٹیے بنائے، اُس کو دعوت دینا افضل ہے۔ وہ بہت خاموش طبیعت تھا تنہا پسند ہے آپ کی طرح؟

"جی؟ اس نے جیسے سے اپنی انگلیاں اٹھائیں۔

(دست ظلم ڈھاؤ۔) خمد کے لیے یوں نہ دیکھیے۔ ایسی خاموشی سے قتل کر دے ورنہ وہاں بڑھ اٹھے،

وہ ناموں کی فہرست اور کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر چلی گئی تو اتنی نے اسے راز داری کے لیے میں سمجھا۔

"دیکھیے بیٹے۔ پانی وغیرہ تو ایک حسنی سا بہانہ ہے۔ دراصل میں نے جان بچان والوں میں جتنی بھی معمول لوگیاں تھیں۔ سب کو دعوت دے دی ہے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ سکے۔ پھر جو بھی ملے گی تبیں پسند آجائے گی، وہیں تہہ لایا پیغام لے دیں گے"

"بیچھے؟" وہ جیسے بولا۔ یعنی میری مرضی اور پسند پر سارا انحصار ہے؟

"ہاں میٹا۔" اسی ایک ٹھنڈی سانس پھر کر یوں "تمہیں یاد ہو گا آج سے کوئی چھ سات برس پہلے میں نے تمہیں کھا تھا کہ میں نے تمہارے لئے ایک لڑکی پسند کی ہے، تو تم نے کھا تھا کہ اب نہ زاد دل گیا ہے۔ والدین کی پسند کے بہانے شادی جیسی چیز کا نظروں سے لپٹا جاسکتا اور آپ نے جو لڑکی پسند کی وہ گاؤں میں رہی، وہیں ہی بڑھی چلی گئی جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہا ہوں تو یہ لڑکی کیسے چلی گئی، اس نے آپ پر ہاں دیا اور اس پر ہاں نہ پڑیں۔ پھر جب میں نے وہ سارا خط لکھا تو تم نے جو جواب دیا تھا وہ آج بھی میرے منہ پر ہے تم نے لکھا تھا: اتنی

اچھے لڑکی کا جو لکھنا ہے اور جو سنا لینا ہے اور جس کی اتنی باتیں بھی ساتھ ہی کر دی ہیں، اسے پڑھ کر تو میں بہت ہی ہنسلا۔ سچ کہتا ہوں اتنی کہ ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا تو دور رہا میں اُس کی شادی میں برائی ہی کرنا تھا ہونا بھی پسند نہ کر دے گا۔ اتنی پیرنی نسل کے اختیار است اب نئی نسل کو کسی سونپ چیکے؟ تو میں میں جہاں سے اختیار است کسی نئے کے تم ہی کو سونپ رہی ہوں۔ اس لئے جو چیزیں نے سوچا تو مجھے تہہ کی بات میں بہت مشغولیت نظر آئی۔ واقعی پانے والے کے ٹوٹے ہاں باپ اگر اپنی خوشی سے کوئی فیصلہ کر لیں تو یہ تو اولاد کے ساتھ زیادتی ہی ہوگی کیونکہ بہر حال زندگی تو اولاد کی گوارنا ہوتی ہے۔

"تو اتنی، پھر آپ کو اتنے تانا تہا میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تو دل کا پسند کر لیا ہے۔"

"لڑکی پسند کر لی ہے؟ مگر میٹا تمہیں کسے ہوتے وقت ہی کتنا گور ہے۔ اتنی جلدی میں زندگی کے فیصلے نہیں کئے جاتے۔ اسی لئے تو میں دعوت کا اہتمام کر رہی ہوں کہ تم اپنی پسند تیار تو پھر ہم چہرہ لیں کہیں گے؟ لیکن اتنی میں نے دی تو کیا جو آپ کہہ رہی ہیں۔ لڑکی میں پسند کر چکا ہوں، اب چچا ان میں آپ کیجئے؟

"کون ہے وہ لڑکی؟ اتنی نے لڑک کر پوچھا۔

"وی جی ابھی لٹ بنا رہی تھی۔"

"شہزادی؟" اتنی جیسے سے تقریباً جج کر لیں

سرفراز نے سر جھٹک لیا

"لیکن میٹا ذرا گہرے سوچو تو۔ کہاں تم کہاں وہ ایک بے نام و نشان لڑکی۔ اتنی جاننے سے خدا ترسی کے جذبے کا پتہ چلا دیا تھا میں نے تقریباً بہت تعلیم دلوا دی۔ اتنی کہنے لگی تو کیا سچ چہرے ہی بڑی بناؤں؟

"ای۔" سرفراز نے گہرے لیے میں بولا۔ "اچھے منہ ہے۔"

اسی چوٹی بلتا اچھے غلط خیالات نے تو کسی موقعوں پر کہتے تھے بڑوں کو جھکا دیا ہے، اتنی اور اپنے بیٹے کا وقت آیا تو آپ بھی غریب، اب میری اور آپ کے جھگڑوں میں لگے ہیں۔"

"گرمیٹا۔" خمد نے جو بھی ہماری حیثیت اور عزت بنا ہے اسے دیکھتے ہوئے کسی نامناسب بات ہوگی خود اس پر اللہ کے فضل سے تمہارے دل اپنے ہاتھ کوٹھنے جھولنے میں گاڑا ہوں، اتنا بڑا دل نہ کرنا ہے تو کوئی کی فوج ہے۔ کیا چیز نہیں؟ خوالہ آپ کو دیکھو۔ اعلیٰ درجہ پر پہنچا ہوا ایک ہونا بڑھتیئر۔ جس جگہ بھی تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی،

لڑکی والے پاؤں بڑھ کر بیٹھی دیں گے۔ نہیں میٹا، جب تم نے میری بات مانی تھی اور اب میں مانتی ہوں۔ کوئی تیسری ہی لڑکی ڈھونڈیں گے۔"

ایک دم کسی کام سے شہزادی پھر چلی آئی۔ واپس مڑی تو سرفراز نے دیکھا رہا۔ معمولی سا عطرانی رنگ کی ساڑی، بلاؤز۔ شاہد بہار کا بھی اتنی ہی کو ڈھیلے ڈھال چوٹی گوندھی تھی، دکوٹی بناؤ، دکھاکا کاشوق۔ سرفراز کی فطرت دیکھا تک نہیں۔

"ای۔" میں جسے کیا ہوں، دیکھ رہا ہوں کہ لڑکیاں مجھے بڑی گھیرے رہتی ہیں جیسے کباب کو چینی بنایا گیا ہے میں پھر ایک کی کو شش بھی ہے کہ وہ دوسری سے تھوڑے جھڑکا نظر آئے۔ ہر ایک نے سیکٹ اور سنگھار کی انتہا کر دی ہے۔ مجھے بچا جانے کو کوئی پانے کی آری ہے کوئی بار بار چائے کو پوچھ رہی ہے، کوئی سگریٹ مانگا کر رہی ہے، کوئی کمانے کو پوچھ رہی ہے۔ اور اتنی اُس نے شاید نظر پھر کر مجھے دیکھا تک بھی نہیں۔۔۔۔"

"شاہد اسی لئے نہیں دیکھا کہ وہ سمجھتی ہو جیستی ہے کہ تم اسات کے ستارے ہو اور وہ زمین کی خاک؟

"نہیں اتنی یہ بات نہیں۔ یہ تو وہ شرافت ہے۔ وہ فائزانی پاکیزگی ہے جو کسی غیر کی طرف نگاہوں کو اٹھنے تک نہیں دیتی۔ آپ دیکھئے اتنی اتنے سانس لے کر کسی اور لڑکی کے پسینے ہیں؟

"بیٹے تم جو بچا ہو کرو، میں اتنی بات میں کسے دیتی ہوں کہ اس شادی میں میں شرکت نہیں کر سکتی، اور فیصلے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اتنی گزریوں میں اس کی شادی ہو رہی ہے۔ یعنی تین اوجہ نہیں؟" سرفراز چلا گیا۔

"نہیں کیسے؟ پوچھ لو کسی سے بھی۔ اور شریفوں میں زبان ایک ہی باروں جاتی ہے، کیا تمہارے نہیں، کہنے سے نہیں ہو جائی؟

"اتنی یہ ظلم ہے، اتنی؟" وہ بڑبڑایا۔ مگر اتنی کسی کام سے ٹھہر کر جا چکی تھیں۔

پارنی کا ہنگامہ ابھی اور گزری گیا، لیکن سرفراز نے کسی بھی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہنسنے سے جو پڑا گرام نے قحط کربال جانے کے آنے کے بعد سب ابا جانیں گے اور وہاں جا بیٹھے۔ اس چنگ مٹائیں گے اور یوں تو ٹنگ کریں گے، وہ سب جہاں کے تہاں دھرے رہ گئے۔ دل میں ایک درجہ چھانے بظاہر کام میں مصروفیت کا بہانہ لے سرفراز نے اپنے آپ کو کاموں میں غرق کر دیا۔

اس دن سب ہنسنے پڑے اور اسے سمنڈ کے کٹا لے چنے کو کہا۔ کچھ ہسپتال بھی لگتی تھیں سرفراز کا اچھا لگا کر ہار دو پر دو گرام کروتا ہے، کسی طرح حامی پھر گیا۔ ساری لڑکیاں خوش خوشی سے ہمار کرنا رہنے کے لئے بجائ گئیں۔ سرفراز نے چپکے چپکے کہا کہ کب تک اس طرح شادی کو بھی چلے۔

تھوڑی دیر کے بعد کسی کام سے سرفراز اتنی کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ شادی ٹیچہ اتنی کا سر دیا رہی ہے۔ اس دن سے سرفراز اتنی کی جھگڑ میں شادی سے بات کرتے ہوئے یوں ہی کرتا لگا تھا۔ اُس وقت اپنے دل میں وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سب لڑکیاں تیار ہوئے ہیں تو شادی بھی گئی ہوگی۔ لیکن اُسے یہاں دیکھ کر وہ درجہ تیر میں پڑ گیا۔ اتنی سے بولا "اتنی سب لڑکیاں شاید گھوٹے جارہی ہیں نا؟

"ہاں مجھ سے پوچھ کر ہی تو ابھی یہاں سے گئی ہیں۔ میں نے شہزادی سے کبھی کتنا کہا کرتی جاتے۔ لیکن وہ تو پاگل ہے کہتی ہے میری فوج کو تو عمر بڑی ہے۔ آپ کا جی اچھا نہیں تو ہاں میری کیا خاک مزہ آئے گا؟

"ٹھیک ہے؟" وہ باہر نکل آیا۔ اپنے کمرے میں، اگر وہ یوں ہی لپٹ گیا۔ یہ کیا! وہ تو لڑکیوں کی مانند میری طرح آنسو بہا رہا تھا! اُس نے زندگی میں ایسی وقت اور دلکشت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ کیا مر کے آنسو اتنے سستے ہوتے ہیں؟ بیڑوں کو کیا کوئی لگتا ہے۔ ہر چیز میر ہوتے مجھے بھی ہر چیز میں ایک کی گئی کا احساس کیوں نہیں لیتا ہے؟ وہ بھولی بھالی سی گلہیں اور روتی روتی سی لڑکی جو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تھیں، کیوں اور کیسے پھر یوں پھا گئی ہے کہ میں دنیا سے ٹوٹ سا گیا ہوں! کاش جلد سے جلد اس کی شادی ہو جائے اور وہ اس گھر سے چلی جائے تاکہ میں دن رات یوں کاٹوں بڑ گواروں۔

وہ چپکے سے باہر نکلا اور لڑکیوں کی نظر پر کرا کر لگا لگا ہی بھٹکنے کو چل دیا۔

بہت شرم ہو چکی، بہت تنگ ہو چکا۔ اس آج میں سیدھے اُسی سے بات کر لوں گا۔ اتنے سارے دن دنگ رہنے کی کہیں ہنسنا کچھ حل چکا ہوں۔ مجھے خوشیاں چاہتیں ہیں۔ وہ بے اختیار چلا اٹھا "میں جینا چاہتا ہوں۔ میں جینا چاہتا ہوں۔۔۔"

ایک دم زور سے دروازہ کھلا اور شہزادی اندر داخل ہوئی

"کیا ابھی آپ چلائے تھے؟ میں کیا رہی سے سرفراز میں رہی تھی کہ آپ کے چلائے کی آواز آئی۔ کہیں آپ کی ہیبت تو خراب نہیں؟"

سرفراز جواب دینے لگا، ایک بارے لکھ لکھ سے دیکھتا گیا۔ ان نگاہوں کی تاب دلا کر وہ گھر کی گئی۔
جانے کتنے لمحے لپٹی ہوئی تڑپ گئے ہوں گے اُس نے گھر آکر آنکھیں جھکا لیں۔ اچانک وہ چلتا، "میں کہتا ہوں مجھ سے نظریہ پڑاؤ۔ میری طرف دیکھو۔"

"جی۔" وہ اور بھی حواس باختہ ہو گئی۔
"ہاں میری طرف دیکھو۔ مجھ سے بھاگتے ہو، بچہ کو ٹھکراؤ نہیں؟" وہ پاگل کی طرح اٹھا اور اس کے شانوں کو ہتھکڑ کر بولا، "ایک بیچ کی آواز سن کر بڑے چلنے والی میری سی۔" کبھی تم نے اتنے دونوں ایک لمحے کو بھی یہ اندازہ لگایا کہ میں کس طرح مراد دیتا ہوں۔ اور صرف تمہاری وجہ سے!"

"جی۔" وہ چڑیا کی طرح کانپ گئی "میری وجہ سے؟"
"پھر اور کس کی وجہ سے؟ کیا تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں کس طرح تم پر مذہم ہوں؟ کس طرح گھٹنوں اس دروازے میں کھڑا رہا ہوں کہ کبھی تو تم اس راہ سے ہو کر گزر رہے ہو۔ وہ جہ سے بنائے ہیں کہ ذرا سی دیر کو تمہاری قربت مل سکے۔ میسک تمہیں مریضوں کی تیار داری کرنے، گھر بھر کے لئے کھانا پکانے، دھوئی کو کپڑے لینے اور باغ میں پودوں کی نگرانی کرنے کے سوا اور کچھ آتا بھی ہے؟ میں کیسے مان لوں کہ کبھی تمہارے دل نے میری دیوانگی کو محسوس نہیں کیا ہوگا۔ نہ کہ تم تو مجھ سے لگاؤ میں مجھ کو ہی کہو۔" میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ سمجھیں۔ میں چلا جا کر دنیا کو سنا دوں گا کہ میں اس دیوانہ لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ کون ہے جو مجھے اس سے محروم کر سکے؟ کون ہے جو اس کو مجھ سے چھین سکتا ہے؟

اُس نے دھیرے سے سرفراز کے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور دم پیچے میں بولی "ہیر دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ تمہاری آپ کی حقیقی دنیا ہے۔"

وہ چلتا، "میں ہیر دہیں ہوں، ذہنی ہیر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" پھر اچانک اس کا لہجہ ڈوب سا گیا اور وہ بڑی بے بسی سے بولا۔
"میں اگر ہیر دہتا تو نہیں اٹھا کر کھا لیتا۔ لیکن شہزادی، میں یہ کہتا ہوں، میں نے تمہیں دہن بنانے کے خواب دیکھے ہیں، کسی ایسی ہی ایک لڑکی کے تصور میں، بارہ کرچی پاگل ہوتا رہا جسے میں محبت میرے ردائی خط لکھتا اور وہ دونوں ہاتھوں کے نازک چہرے میں اپنی ٹھوڑی نکاتے، پانچ لکے لیٹی میرے وہ خطوط پر ہنسی اور شرار کرنا شروع کر لیتی۔ وہ سارے خطوط جو

میں کبھی نہ لکھ پایا، اگر لکھتا تو تمہارے ہی نام لکھ جاتے۔ وہ سارے خواب جن کے کبھی ایک جوان لڑکے کی رائیں ہمک سکتی ہیں اگر کوئی یا جانگ آٹھوں سے دیکھ جاتے تو تمہارے ہی تصور سے آباد ہوتے۔ میری آنکھیں خوشبودار ہاتھوں کے اُس لمس سے آج تک محروم رہی ہیں جو مجھے سے اکران پر میری آنکھوں پر اپنا پردہ ساتاں دیا اور زمیلی اور زمیلی آواز سے پوچھیں "پہلی تو میں کون ہوں؟ اور میں دیوانوں کی طرح چل کر رہتا؟" کران ہاتھوں کو آنکھوں پر سے ہٹا کر چوم چوم ہوں اور کہوں "میری جان ان ہاتھوں کو میں نہیں چاہوں ان کو تو اور کون بچلے گا؟ یہ تمہارے ہاتھ نہیں میری دنیا سوار ہے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو میرے سونے آٹھوں میں لگا کر موتیا کے پھول اگا تیں گے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو میرے بچوں کا اپنا ملا لیں گے۔ اور یہی وہ ہاتھ ہیں جو بولنے نہیں دیں جن کی اپنی ایک زبان ہے۔ وہ زبان یہ بولتی گاتی رہتی ہے۔ میں تمہاری ہوں، میں تمہاری ہوں۔" وہ کسی سنگ مرمر کی سورت کی طرح کھڑی آتے بچے میں اور خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اُس کے پاس کچھ نہ بھی ہو۔ وہ دھیرے سے بھٹکا، اداس اس آنکھوں میں جہاں کہہ کر بولا "میں فرشتہ نہیں ہوں اسی دنیا کا ایک انسان ہوں۔ میں ذرا کتا ہوں۔" کازدواجی زندگی کی کوئی خوشی نہیں ملے، جس سے تمہاری شادی ہو رہے تھی اس کا پیا جی نہیں نصیب نہ ہو سیکو کہ تم مجھ ایسے بوجھ سے دل کو توڑ کر اپنی دنیا آباد کر دو گی۔

"نہیں۔" وہ چلتا، "اللہ ایسا بے انصاف نہیں ہے۔" ابھی آپ ہی کی اُسے اندازہ تھا جی آپ ہی کی۔ کیا میں پرستش میسک پاس نہیں ہے۔ عبادت میں ہی کرتی ہوں، دعا میں میں ہی مانگ سکتی ہوں اور مانگتی ہوں، لیکن آپ کی طرح دعا کی آوازیں بددعا میں نہیں دیا کرتی۔ اور بددعا جی اُسے جتے پیار کیا جائے۔ میں نے تمہیں آپ کے لئے کوئی پڑھائیں مانگی۔ حالانکہ خدا گواہ ہے وہ ہر تیرے سے باخبر ہے کہ کوئی رشتہ، خوش نصیب نہیں گزری جس نے میری آنکھوں کو بند کر دیا ہو۔ چاہے۔ جب بھی میری ملاقات ہوتی گئی آنکھوں ہی ہوتی۔ ستاروں سے میری آنکھیں شناسائی ہو چکی ہے کہ سوچ مارے حسد کے اُن کا جو دشمنانہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب میں کس کو سنا رہی ہوں؟ جس نے مراد تو توڑ لی تو، اپنی بارہ، ان کی کوئی نہیں چھوڑا۔ ایک دم اُس نے اپنے گلے میں کچھ ٹھونکا اور ایک لاکھ نکال کر اس کی ڈیر کھول، اور ایک کاغذ اس کے لٹ پھینکے ہوئے دل "یہی ہے مادہ نوشتہ تقدیر جس نے میرے سر سے میں صرف اتنی سوچی چھائی ایک مڑاؤ کاغذ۔ سرفراز نے اسے چھپ کر رکھا۔

"اُچی اپنے لڑکی کا جو کچھ کو بیچنا ہے اور جو سارا بیان لیا ہے، اور جس کی اتنی تیر لیس لکھی ساتھ ہی گزری ہیں اُسے بڑھ کر میں بہت سی ہنسنا۔" پھر کہتا ہوں اُچی ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا تو دور رہا، اُنکی شادی میں براتی بن کر شامل ہونا بھی پسند نہ کروں گا۔ اُچی پلٹتی نسل کے اختیارات ابھی نسل کو ہی سونپ دیتے ہیں۔"
"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ انہماک کر بولا "اس خط سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"دیکھ گاؤں کی گھنوا لڑکی۔ جس کا جلیہ پڑھ کر آپ کو ہنسی کا زورہ پڑ جائے گا، سرفراز حیرت سے سٹے گیا۔
"آپ کو پتہ ہے، پیچیدہ صاحب۔" مشرق کی اپنی اگلی تیس، پچیس اور دوا تیس میں "آپ امریکہ میں رہے ہیں تو ذرا بھلا آپ کو اس دنیا کی ملک کی باتیں کیا معلوم؟ لیکن اس ملک میں ماں باپ جب اپنی پسند سے کسی لڑکے لڑکی کو رشتہ کر دیتے ہیں تو وہ اتنا سوچا سمجھا اور اتنا ملکی ہوتا ہے کہ اس میں کہیں جوں میں ہوتا ہی نہیں اٹھنے کو دیتے ہیں کہ ماں باپ نے ہائے حق میں اچھا نہیں کیا، لیکن یہ عقیدہ تو یہ ہے کہ پڑنے یا کھانا پینے کی کوئی کام غلام کرتے ہوں۔ میری طرح کی بیوقوفی لڑکیاں ایسے رشتوں کو خدائی حکم سمجھ کر غور و فکر کر لگتی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے من اور آبادیوں کے انتقال کے بعد اُچی مجھے اپنے پاس لے آئی تھیں گاؤں میں منہ سے صرف میری تک تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں اُچی نے مجھے کالج بھجوا کر دی۔ لے کر آیا اور ایک دن آپ کی تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا۔ "بیٹی میرا ایک ہی لڑکا ہے، تو مجھے بیٹیوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ پھر منی ہوئی تو رکی شرب رشتہ دار میں سے کیا جو اعداد میرے دل پر نشن ہے کہ میں تجھے کبھی خود سے جلا کر دے گی، تو میں چاہتی ہوں کہ تیری مرضی سے سرفراز کو خط لکھ دوں، تاکہ وہ امریکہ سے کوئی بیم نہ لٹا لائے۔"

وہ دن میری زندگی کا ایسا سیاہ دن تھا کہ الفاظ ان جذبات کے اظہار کے لئے غلاموں کی طرح عاجز اور بے دست و پا نظر آتے ہیں۔ کیا بتاؤں میں کیسا خوش تھی۔ اب ایک میسک پاس کچھ بھی دھما۔ اور ایک ہی بات کہہ کر اُچی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ نرانیہ خوشیوں کے نیچے مجھے سارے خزانے جیسے مجھے سونپ دیے تھے۔ لیکن یہ ساری خوشیاں اتنے کمزور تھیں جتنے دن میں اُچی کے خط کا جواب آیا۔ اور پھر میری زندگی کو ٹھن گئی۔ اس کے بعد آپ آئے۔ میں نے مرعیا چاہا، لیکن سوچا مرعیا وہ تو آپ کو کیسے دیکھ پاؤں گی۔ ہرنوشتی سے محرومی کی کم سے کم آپ کے دیدار کی پیاس تو بھگی۔ میں نے اُچی سے کہہ دیا کہ اُسے ملنا تھا۔ نہ کہ اُس میں اور کہہ کر آپ کو سنا لیتی تھی وہ بھی گڑھی ہوئی تھی۔ میں آپ

کو آج سنا دوں کہ جب آپ سو جاتے تھے تو میں گھنٹوں دروازے میں کھڑی آپ کو دیکھ کر گرتی۔ سوچتی تھی، یہ خوبصورت آنکھیں جو اس وقت بند ہیں اللہ جانے کس خوش نصیب کو خواب میں دیکھ دی ہوں گی۔ میں جانتے میں کبھی آپ کے سامنے سے گزری تک نہیں میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں خود کو آپ پر نظر نہ کرنا چاہتی ہوں، نہایاں کرنا چاہتی ہوں، آپ کو پتہ نہیں عورت کی محبت ایک ایسا خوش و خوش دہار ہے جو آپ کی مندر میں جلتا ہے۔ اور وہ مندر ہے اُس کا دل، میں سکون میں آپ تھے آپ ہیں، آپ میں نے۔ شمع کی صورت، امتیاز نہ کر۔ اچالوں کی مانند، کیوں کہ ہر حال آپ میری ہی اور آخری محبت ہیں۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ ہنسکی۔ "میں اب آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ کسی سے بھی نہیں کروں گی۔"

"لے نہیں بیٹی۔" راہ داری سے اچانک اُچی کرے میں داخل ہو گئی۔ "میرے بچے پر ایسا ظلم نہ کرنا۔ اس بے چارے نے تو یہ کھانا کھا کر انہیں براتی بن کر شامل ہونا پسند نہیں کر دیا گا۔ اُسے دوہرا بھنا شامل ہونے کے یوں محروم کر رہی ہے؟"
"اُچی آپ۔۔۔؟" شہزادی اُسے گھبراہٹ کے اندر کچھ نہ کہہ سکی۔ "ہاں بیٹی، میں نہیں ڈھونڈتی ہوں یہاں تک کہ اُچی تو تم دونوں کی آوازیں میسک کانوں میں پڑیں۔ میں نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ اب بہت ہو چکا۔ میسک کانوں نے کتنی ہی مدت سے شہنازیوں کی آوازیں میں سنیں۔" ایک دم دھمک کر کہیں۔
"اُسے سمجھتی، تم لوگ نے نئے لوگ کے لوگ۔ شہنازی بھانا پسند کر دو گے یا پسند نہ کرے؟"

سرفراز دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر ہنستے ہوئے بولا "اُچی، آج سے نئے نسل اپنے سارے اختیارات پرانی نسل کو سونپتی ہے۔ اُچی کے چہرے پر مانتا کی گھایاں بھر بیٹھ گئیں۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر ایک ساتھ دونوں کو گنگا لیا۔

ناقصہ عام آبادیں

پاکیزہ

حسین بٹک اسٹال سے طلب کریں

ہرچہ گھر پر پہنچانے کا انتظام بھی ہے

کلے
رتے میں طبعی وہ تھوڑا سا روزانہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی بڑے وقار اور مکت کے ساتھ میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی یہ علم تو نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے لیکن برقع میں سے جھانکتے ہوئے گورے گوبے ہاتھوں اور پرزوں سے یہ اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ یہ شریف لڑکی غامی خصوصیات ہوگی۔ اُسے دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس سے گشت کو کرنا چاہیے یہ علوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں رہتی ہے اور روزانہ کس جگہ جاتی ہے۔ بالآخر ایک روز محبت کر کے میں نے کھڑکی میں سے اُسے آواز دی اُس نے گھوم کر رہنے کی جایوں سے میری طرف دیکھا میں نے اشارے سے

آر وڈو
مرفی کا

اُسے قریب آئے کو کہا۔
”فریاد؟“ کھڑکی کے پاس آکر اس نے پوچھا۔
میں نے کہا: ”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے اندر تشریف لے آئیے۔“ وہ کچھ ہنسی کی کہیں آئی دیر میں میں بیرونی دروازہ کھول چکی تھی۔
خاموشی سے وہ دروازے کی طرف بڑھی اور اندر داخل ہو گئی۔ دروازے پر میں نے اس کا استقبال کیا اور ٹری آؤ بگسٹ کے ساتھ اسے اپنے کمرے میں لے آئی لیکن خدا جانے کیا بات تھی، گھر میں آجائے کے باوجود اس نے ابھی تک اپنے برقع کی نقاب نہیں ہٹائی تھی۔
میں نے اسے اسے سو فریاد پوچھا تھے ہوئے کہا: ”میں آپ کو روزانہ ادھر سے گزرتا دیکھتی ہوں جو خود بخود دل آپ کی جانب کھینچتا ہے چاہتی ہوں کہ آپ سے دوستی کی جائے۔“
”دوستی اور مجھ سے؟“ اس کے انداز میں بے پناہ حیرت تھی۔ ”آخر کیوں؟“

”وجہ تو مجھے بھی نہیں معلوم ہے میں نے کہا: ”یوں مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔“
”پیاری؟“ اس نے کچھ ایسے کرناک بوجھیں کہا جیسے اسی پیچ مار کر روٹی ہے گی پھر اپنے اور قابو پا کر بولی: ”معاف کرنا بہن۔ میں اس قابل نہیں کہ مجھ سے دوستی کی جائے۔“
میں بھی کہ بسلیوں سے اس کی تلخ یادیں وابستہ ہیں کسی بھی پہلی سے اسے رکھ اور در دے علاوہ کچھ نہ ملا جو گا بھی تو اتنی مایوس ہے بے پناہی لیکن میں اسے غلوں بخت اور پاروں گنگلے بنادوں گی کہ صبح صبح اس کی دوستی میں نہ رہے اور پاکیزہ جیسے بیکانا ہے۔
اپنے خیال کا اظہار میں نے اس سے کیا تو کرب و اضطرار کے ساتھ اُس نے دونوں کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے: ”ہمیں نہیں ہے۔“
میں نے پیار بھرے بوجھیں کہا: ”یہ نقاب تو الٹ رو بہا کوئی مرد نہیں ہے۔“

”ہمیں میں نقاب نہیں الٹوں گی۔“
”کیوں؟“
”تم تھل زلا کوگی۔“
مجھے اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی آگئی: ”مانا کہ بہت خوبصورت ہو لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئی تاب ہی نہ لاسکے۔“
”اُٹ غلیا! اس نے در بھری آواز میں کہا: ”تو کب

تک میرا امتحان لے گا؟ کب تک لوگ میرا کیل بناتے رہیں گے۔ پھر وہ مجھ سے غلبہ پھر بولی: ”اگر تم میرا چہرہ دیکھنے پر بند ہو تو لو، یہ دیکھو۔“ اس نے چہرہ کا نقاب الٹ دیا۔ اس کی شکل اتنی خوشگام اور آؤنی اور چمکی ہوئی تھی کہ میں سر سے پاؤں تک لرزتی ہوئی شکل تمام میں نے اپنے اوپر قابو پا کر اپنے منہ سے نکلنے والی پیچ کا ٹکڑا اندر ہی اندر گھونٹ دیا۔ اگر میں ضبط سے کام لیتی تو شاید میرے منہ سے اسی ہسٹاک چھٹ نکلتی کہ نہ صرف گھر والے بلکہ پاس پڑوس تک کے لوگ



دورے چلے آتے۔ وہ تو خیر بے چوٹی کرانگی ہی لکھ وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر گھر کے باہر نکلتی تھی۔
وہ تو جتنی بھی تھیں مجھے پریشان کے عالم میں چھوڑ گئی۔ بار بار اس کا جھٹکا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتے لگتا۔ رات کو خواب میں بھی وہی خوشگام شکل نظر آتی۔ کبھی بھی دل چاہتا کہ اسے اکیلا رہنے دے ہاں ملاؤں اور صلو کم کروں کہ اس کا چہرہ اتنا ہسٹاک کیوں ہے مگر فوراً ہی آنکھوں کے سامنے اس کی ڈراؤنی صورت آجائی جس کو دیکھنا

جوئے تیار لانے سے کم نہیں تھا۔
لیکن ایک روز ایک عجیب سے جذبے کے تحت جس کی توجہ میں آج تک نہیں کر سکی، اسے آواز دینے پر مجبور ہو چکی تھی۔
”فرمائیے؟“ اس نے میری کھڑکی کے پاس آکر باہر سے دریافت کیا۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان لڑکھڑا کر رہ گئی کچھ نہیں آیا کہ اس سے کیا کہوں۔
”کیا آپ اب بھی مجھ دیکھاری سے دوستی کرنا چاہتی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، میری آواز اس طرح بھی جیسے یہ کہیں دور بہت دور سے بولی رہی ہوں۔“
نقاب کے پیچھے سے میں نے اس کی طنز پر ہنسی کی آواز سنی



لیکن آپ کو تو پیسے چھوٹ رہے ہیں۔
میں نے اس کی بات سنا لی کہ رڈی: ”اؤ۔ اندھا ماتوہ وہ گھوم کر دروازے سے اندر داخل ہوئی میں نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کی دروازے کی کھڑکی سے کہنے پر اُس نے اپنا ترنہ اتار دیا۔ اُٹ! ایک بار پھر میرا دل اس کا چہرہ دیکھ کر لرزنے لگا۔“
”تمہارے ہاتھوں اور سروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی تم بھی خوبصورت رہی ہوگی لیکن کسی دیکھی دہرے تمہاری ایسی حالت

اس نے وہ ڈیل ہی ہوئی نظروں سے ہر طرف دیکھا اور مجھے
بہج میں بولی یہ میری بہت سی بہنوں نے وطن عزیز پاکستان کی خاطر اپنے
والدین، بیٹے سیٹھوں اور شوہروں کو قربان کیا ہے میری قربانی بھی
ان سے کچھ مختلف نہیں۔ آپ درست کہتی ہیں میں کسی بھی خوبصورت
تھی، آجی خوبصورت میرے شوہر کو کچھ کرب سے پہلے میرا ہی پر
دیکھتے۔ ان کا گھٹنا کچھ جی میں لڑکی اُن کے عہرے کے خاندان
میں اور کوئی نہ تھی۔ میں نے اپنی خوبصورتی، اپنی زندگی کی سب
قیمتی متاع اپنے وطن کے لئے قربان کر دی ۛ

اُس نے کوکر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یوں تو قیام پاکستان کے بعد ہی سے ہندو مسلمانوں کی جان کے آگے ہو چکے تھے۔ ہر بول پر ہم سے یہ کہا جاتا تھا کہ اب کی تہذیب مسلمانوں کے خون سے ہو چکی ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں ان کی دوسری استہکاک ہو چکی تھی۔ ان کی فوجوں کو جتنی زیادہ شکست اٹھانا پڑی، اتنی ہی ان کی نفرت ہندو مسلمانوں سے بڑھتی گئی۔ پاک فوج پر ان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ لیکن ہندوستان میں رہنے والے نئے اور بے بس مسلمانوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینا ان کے لئے باطل آسان تھا۔ وہ مسلمانوں کا اس طرح سے قتل عام کر رہے تھے جیسے پاک فوج کے یہاں سے انتقام لے رہے ہوں۔ ہمارا چند منزلہ گھر بھی ان کے دشنام حملے کی زد میں آ گیا۔ ہم سب مشترک خاندان کی صورت میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ رات کے دوپہن بجے شہر کے اکثر ہندوؤں نے پولیس کی مدد اور جیت سے ہمارے گھر پر یٹول چمکر کر آگ لگا دی۔ شہر کے بہت سے افرو جن میں بڑی تعداد اور بچوں کی تھی، اس آگ میں زندہ جل گئے۔ ہر طرف انسانی کا علم تھا کہ کسی کی خبر تھی میں اور ہر اُدھر بھاگ کر باہر نکلے گا۔ راستہ تلاش کر رہی تھی کہ سڑکی ہوئی کوئی ایک ٹرا اسٹکارہ میرے سر پر آگرا۔ پہلے میرے بال تلے پھوچا۔ جلتا شروع ہوا۔ اور میرے ٹھون میں آگ لگ گئی۔ مجھے اندیشہ کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس نے مجھے سجایا اور کس نے مرہم پی کی، آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اپنی امی کی ٹوہیں پایا۔ انھوں نے مجھے ہوش میں آئے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور کہے۔ نہیں، گھر بے گھر نہ ہونے نہیں بیٹی، ہم لوگ تھوڑی ہی دیر میں پاکستان پہنچنے جاتے ہیں۔ وہ دیکھو۔ سامنے پاکستان کی سرحد۔ اپنے پاکستان کا جھنڈا کس شان سے لہرا رہا ہے۔



ہم دونوں مال بٹی کر اسی میں شہر ہو گئے۔ کراچی کی جیس
وٹریٹس میں گول پیر میری آنکھیں اپنے شوہر کو تلاش کرتیں مائلند ہی اند
بیسے میرے دل میں کوئی کہتا کہ وہ زندہ ہیں اور میں اسی شہر میں
مجھے تلاش کر رہا ہے۔ پھر مجھے اپنے جھگے ہوئے بد صورت چہرے
کا خیال آتا تو میں نیچے سے اور تک کانپ ماتی۔ اس غلے جھگے ہوئے
چہرے سے تو یہ کہیں اچھا لگا کر میں بھی اس آگ میں ہل کر بڑا ک
ہو جاتی تھ کہ شہادت کا درجہ تو حاصل ہو جاتا۔ آخرت کی زندگی
میری موجودہ زندگی سے کہیں زیادہ اچھی ہوتی۔ اب تو روزانہ مجھے
ملتا پڑتا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا خیال بانا ہو جب میں پڑوس
والے میری صورت پر غصت نہ بھیجے ہوں جھگوئے جھگوئے پٹختے جھگے
ڈانٹ اور چٹیل کہہ کر میرا مذاق اڑاتے۔ مائیں اپنے گورے بچوں کو برا
نام لے کر ڈرائیں۔ اتنے بڑے شہر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا،
جسے ہم سے عذر دردی ہو۔ غموں پر گپو کے لگانے والے بہت تھے لیکن
میرا ہر کہنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

میں نے کوشش کی کہ مجھے کسی اسکول میں ملازمت مل جائے کئی اسکولوں میں گئی مگر ٹھیک سے داخل ہونے ہی پہنچے بچتیاں مجھے کوٹا نامہ شروع کر دیتے بیڑہ ملے اس سے ملتی تو کہا جاتا تھا اس بچے میں صرف تعلیم نامہ ہوتا ہی ضروری نہیں بلکہ ٹیچر کی ذمہ داری بھی اس پر ہونی چاہیے کہ بچے اس سے مانوس ہو جائیں ۔ تم نے بچوں کو ڈور لے کر کالہ لہا لہا کر لے کر بڑھائے کا نہیں ؟

ایک مرتبہ ایک مشہور فرم میں بھی ملازمت کے لئے گئی۔
میرا چہرہ دیکھتے ہی منیجر کو لگا گیا کہ اس نے گھنٹی بج کر چھپ کر کہا ہے۔
اور سارے اخلاق و آداب کو بالائے طاق رکھ کر اس نے کہا: "اے بی بی!"
خان! اس جتنی کو یہاں سے فوراً باہر نکال دو!"

اس روزگار میں مرتبہ میں نے سوچا کہ دنیا کے سارے

سائے ہی ایک کٹھی تھی بغیر سوچے سمجھے جس کو ٹھکی کے
 حیرت میں داخل ہو گئی تھیں۔ دیکھا کہ لان میں میری چھوٹی مندرجہ
 مثنوی ہوئی ایک کتاب بڑھ رہی ہے۔ حیرت و سرت کے باعث میر
 مزے سے حق نکلنے نکلے رہ گئی۔ لیکن اس سے قبل کہ اس کے مزاج
 کرتی، اس کے مزے سے "ادنیٰ" کی آواز نکلی اور وہ بے پناہ ترس طبع
 اندر بھاگی جیسے اس کے سر پہ سانس بگدھ لگا ہو۔

میں وہیں سر کر کے بیٹھ گئی۔ فریج بھی مجھے نہ چھان سکی۔ وہ فرست جو مجھے بے انتہا ہنس رہی تھی اس کا کھانا کھا کر پتہ نہیں۔ وہ دنیا کی کسی ہوئی ہیں جو اپنی ہنس میں سب سے لڑائی جھگڑا کر لی ہیں میں تو اپنی بہن کی صورت نہ دیکھ سکتی تھی۔

اسی وقت کوئی میں داخل ہوئی ہوتی کھڑی کاہارن
شک کر رہا تھا تو سامنے ندیم تھے۔ ندیم میرے ندیم میرے اپنے
ندیم میرے مجازی خاندانم۔ خوشی سے سرشار آگے بڑھی۔ ندیم
کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

ہی کیا بات ہے خاتون؟، میں نے ایسے جواب دیے
 سے پوچھا جیسے میری صورت دیکھ کر مجھے بھی خوفزدہ ہو گیا ہو۔ اب کون
 ہیں۔؟ میری ساری انخسٹیاں صابن کے جھاگ کی طرح ایک ایک
 بڑھ گئیں ہیں اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر نے اپنی ساری داستان
 سنا نا چاہتی تھی۔ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں نے راتوں کو اٹھ کھڑے
 کرتھواری زندگی اور صحت کی دکانیں مانگی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے التجا
 کہ ہیں کہ مرنے سے پہلے ایک بار تیرے ملاقات کرو۔ میں اس کے
 منے سے زندگی بخش جملہ سنا نا چاہتی تھی کہ اسے میرے جہرے کی خوشبو
 سے نہیں بلکہ مجھ سے، عرن مجھ سے محبت ہے۔

۱۰ محترمہ، راستہ تھوڑے سے، ندیم کے چہرے پر غمی اور سنجیدگی کے آثار دیکھ کر میرا دل رونا دلوانا کاپ اٹھا۔ کبھی کیسی دعاؤں اور حقیقتوں کے بعد تمہیں پایا ہے ندیم، اب میں تم سے دو تہیں رو

”باوجودی یہ میری آواز سمجھ گئی تھی میں نے سوچا کبھی نہیں
 تھا کہ کبھی اپنے نیک و کفیلوں کی طرح یوں غائب کروں گی۔ میں
 غریب اور بے بہارا عورت ہوں۔ اگر اپنے تنگ بینوں کو توئی کام مجھ سے
 دیں تو میں آپ کا یہ احسان تمام زندگی فرحوش نہیں کروں گی کیا
 آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ دل و جان سے اپنا یہ گھر سمجھ کر آپ سب
 کی خدمت کروں گی۔“

”لیکن... وہ کہہ چکے تھے کہے نہ گئے۔

میں نے اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تاکہ انکار نہ کیجے بالوحیٰ

جائیں گے۔
 میں نے کہا کہتے اور ندر سبھی اگر کچھ میں رہیں تو لوگ
 اُن سے مانوس ہو جاتے ہیں میں پھر انسان ہوں بتھوڑے ہی دنوں
 میں سب سے اچرہ دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔

میری بات شاید اُس کی سمجھ میں آگئی " اچھا اندر آتی
کے پاس چلو۔ اُن سے بات کئے لیتے ہیں "

بڑی امثال بھی مجھے نہ پہچان سکیں بسو الیہ نظروں سے ہٹیم
کے چہرے کو مٹنے نہ دیں کہ وہ کس جانور کو نہ لایا ہے۔

۱۰ اسی ہی ندیم نے کہا " یہ ہمارے گھر ملازمت کرتا چاہتا ہے۔
وہیں رہنے لگے کسی شریف گھر کے کہ معلوم ہو تو ہیں مناسب سمجھیں
تو انھیں ملازم رکھ لیں۔ آپ کو پہنچے گی ایک ملازمت کی تلاش شیخی اللہ
نے گھر بیٹھے آپ کی شکل آسان کر دی "

اور اس طرح مجھے میرے اپنے ہی گھر میں کپڑے لٹھو
 برتن بچھنے اور اوپر کا کام کرنے کے لئے فکریاتی کنجشیت سے سناٹ
 موسمہ مالانہ مشاہیر پر کوئل گیا۔

ہو گئے۔ میں نے کسی کا خدمت میں کوئی گسٹا نہ رکھی۔ گھر کے کام کاج سے کبھی دست نہ ہوتی۔ سارا کام سچ کر کیا کہ میں اپنے ہی گھر کا کام کر رہی ہوں۔

بہت ہنسی کی کہ جب میں نے دو ایک تبرج پر ہنجر کرائے سنائیں اور ان کا رد میں تبرج کیا تو اسے بہت حیرت ہوئی گھر کے ہر شخص کو اس نے بتا دیا کہ نئی ماڈرن پڑھی محضی ہے۔ اول تو میرے کام دیکھ لیا

لے ان لوگوں کے دل موہ لئے تھے۔ اُس پر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں تعلیم یافتہ ہوں تو سب کی نظروں میں میری وقعت اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔

یہی میں بھی چاہتی تھی کہ آہستہ آہستہ سب کے دلوں پر قبضہ کر لوں اور جب وہ لوگ مجھے چاہنے لگیں تو ایک روز چاکلی ہی انھیں بتا دوں کہ میں کون ہوں؟ میری یاد ابھی تک ان لوگوں کے دلوں میں زندہ تھی۔ بڑی امان اپنی "مخوم" میں وہ تعریف کرتے نہ تھکتے۔ فخر کے سامنے ذکر آجاتا تو وہ سکیاں نہ ہرگز کر دیتے تھے۔ ندیم کے سامنے اس کی بوی کا ذکر کرنا باطل من تھا جی نہیں دیتی تھی کہ میں شہتِ غم سے اس کے دل کی دھڑکن بند نہ ہوئے۔ "اگر کسی روز آپ کی بوی آجائے تو آپ کو خوشی ہوگی نا؟" ایک دن نہ جانے کیوں میں بڑی امان سے پوچھ بیٹھی۔

"خوشی تو خوشی ہوگی یہ انھوں نے کہا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی مارے خوشی کے؟"

"لیکن اگر اس کے آنے کے بعد آپ کو پتہ چلے کہ اس کا سارا حسن واقعی میں چکا ہے۔ کیا آپ پھر بھی اُسے قبول کر لیں گی؟" ہاں ہاں کیوں نہیں جسم کا کوئی عضو گرج جائے تو اُسے کاٹ کر تو نہیں پھینک دیتے۔ تم نہیں جانتیں مائی میری ہومو میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔ کاش وہ زندہ ہو اور ہم لوگوں سے ایک بار پھر مل جائے۔"

اُس رات میں خوب روئی۔ میں زندہ تھی لیکن مردوں سے بدتر۔ دل چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو بتا دوں کہ میں کون ہوں مگر پھر خیال آتا تھا کہ میری وجہ سے کہیں وہ لوگ کسی مصیبت اور پریشانی میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ کتنی پریشانی ہوگی انھیں دوسرے کے سامنے بڑی امان کس مزے کہیں گی، یہ میری کہو ہے۔ فرح اپنی ہسلیوں کو کیسے تنگ لے گی کہ یہ بد صورت عورت میری بھابھی ہے! اپنے دوستوں سے برا تعارف کرانے کے بجائے ندیم کو زیادہ ترجیح دے گا۔ ایک دن ندیم کے سامنے بھی میرے دل کی بات نہان پڑ گئی۔ "باوجودی۔ آپ اپنی بوی کو بہت چاہتے ہیں؟"

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی کے قطرے تیرنے لگے۔ "ہاں مائی۔ وہ اسی قابل تھی کہ اس کی پوجا کی جائے؟"

"کیا وہ بہت خوبصورت تھی؟"

"یوں مجھ کو کہ میری آنکھوں نے اس سے زیادہ سینہ و جہیل لڑکی آج تک کسی نہیں دیکھی۔"

"اگر اس کی خوبصورتی ختم ہوگئی ہو یا وہ ہاتھ پیر سے معذور ہوگئی ہو تو کیا آپ پھر بھی اُسے اپنائیں گے؟ آپ کو اپنے دوستوں کے سامنے کیسی محسوس نہ ہوگی؟"

"مائی! ندیم نے درد بھری آواز میں کہا: تم نہیں جانتیں کہ میرے لئے اس کی کیا اہمیت ہے۔ میں اسے دل کی گہرائی سے چاہتا ہوں اور ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔ اس کی جدائی کے بعد سے ابھی تک کوئی ایسی رات نہیں گزری جب میں نے اسے خواب میں نہ دیکھا ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور کسی کسی دن وہ مجھے ضرور ملے گی۔"

"اگر میں آپ کی بوی کو ڈھونڈ دوں تو مجھے کیا انعام دیں گے؟"

"جو مانگو گی۔ یہاں تک جانتی ہو گی تو وہ بھی پیش کر دوں گا؟"

"باوجودی اپنی بات سے پھر نہ جائیں جو مانگوں گی وہ آپ کو دینا پڑے گا؟"

"ہاں مائی، وعدہ کرتا ہوں۔ باطل پکنا وعدہ۔ پھر چیک وہ میرے سامنے چھوئے چھوئے کی طرح ہاتھ جوڑ کر گریختہ گیا۔" مجھے ایک بار اس سے ملو اور مائی مجھے اس کا پتہ بتا دو۔ میں خود اس کے قدموں میں بیسویں جاؤں گا؟"

میں نے کہا: نہیں باوجودی۔ مجھے آپ کی بیگم صاحبہ کا کوئی علم نہیں میں تو بس اپنی آپ سے پوچھ رہی تھی؟"

"دل میں چھپے والے سوالات کو پوچھ نہیں سکتے جاتے مائی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری بوی کہاں ہے۔ تمہیں بتا پاؤ گے؟" تو میں اپنی اور تمھاری جان ایک کر دوں گا؟"

"میری بات کا اعتبار کیجئے باوجودی؟"

"جسٹوٹوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہے تم اس سے ملتی رہتی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟"

میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں اور اس سے ہوں کہ میں ہی تو ہوں تمھاری بوی۔ دماغ نے بھجھا یا کہ بھلی ہوئی ہے ندیم جیٹیت شخص ہے۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہے۔ اگر اس نے اپنی سادہ محبت کا خیال رکھتے ہوئے مجھے اپنی بوی تسلیم کر لی تو اب بھی وہ کبھی یہ جرات نہیں کرے گا کہ دوسروں کے سامنے مجھے اپنی بوی کی حیثیت سے متعارف کرانے۔ ابھی وہ جذبات کے دھاروں پر بہ

رہا ہے۔ اس کے تصور میں اپنی بوی کا اتنا مکروہ اور نفوس چہرہ نہیں آسکتا لیکن جب تو اُسے یہ بتائے گی کہ تو ہی اُس کی بوی ہے تو اس کے تصور کے بنائے ہوئے سارے حسین بخت چٹکنا چور چٹکنا گئے۔ ہو سکتا ہے فرط غم سے وہ پاگل ہو جائے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اپنی بوی تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کرے۔ بہر صورت تو اس قرب سے کبھی محروم نہ ہو جائے گی جو اس وقت مجھے حاصل ہے۔ بولی مجھے یہ قرب زیادہ عزیز ہے یا ندیم کی دائمی جدائی؟

اور تب میں نے طے کر لیا کہ میں ندیم کے قریب اور محبت کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔

ندیم اب بھی معصوم انداز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا جتنی مائی میری بوی کہاں ہے؟ میں تمام زندگی تجھارا احسان مند رہی تھی۔"

میں نے کہا: مجھے معاف کر دیجئے باوجودی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو اپنی بوی سے اتنی محبت ہے۔ میں تو محض آپ کی محبت کا امتحان لے رہی تھی۔ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کیا اب بھی اس کی محبت کی شمع آپ کے دلوں میں فروزاں ہے۔"

کوئی شبہ یہ معلوم کر وہ میری ہنسی تھی جس روز آپ کا پتہ نہ مل سکا نہ اندیشہ کیا گیا، میں باہر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو آپ کا سارا گھر خاک ہو چکا تھا۔

کئی لوگ جل نہیں سکے تھے بہت سے لوگوں کا علم یہ نہیں تھا کہ کہاں گئے۔ زندہ پنج نکلے یا وہ بھی گھر کے سادہ سا تھنسم ہو گئے۔

لیکن آپ کی بوی زندہ تھی اور ہسپتال میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔ میں لباس سے جا کر ملی۔ اس کا آخری وقت تھا چہرے کی خوبصورتی

جوں کی توں باقی تھی۔ مرتے وقت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کبھی میرے ندیم سے ملاقات ہو تو اس سے کہہ دینا کہ اب ہماری تمھاری ملاقات قیامت کے روز ہوگی۔ ہوئے تو مجھے بھول جانا اور کسی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسالینا؟

ندیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ اُس کی حالت دیکھ کر میرے دل میں جو کجیت پیدا ہوئی اس کا شوق بھی تنک مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ندیم کی بوی اسے دل کی لین اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میرے ندیم مجھے مل گیا۔ اب اب میری موت ہی مجھ سے جدا کر سکتی ہے؟

اپنی داستان سنانے کے بعد وہ بد صورت لڑکی اپنا قہر پہن کر چلی گئی۔ اس کے بعد اُس نے میرے گھر کی طرف سے نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ آج یہ سوچ کر میں نے اُس کی کہانی کو قلم بند کیا ہے کہ شاید ندیم کی نظروں سے یہ کہانی گزریے اور وہ اپنی ایشاور پسند بوی کو گنگے سے لگا لے۔

انعامی افسانے

اولاد پاک بیک بیک گورنمنٹ ماہریت سے خطوط وصول ہوئے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ انعامی انسانوں کے مقابلے میں اگر نئے پڑھنے والوں کے نام کاروں کے انعامی شہر یک ہوئے تو ظاہر ہے کہ نوسنہ قلم کار بھی ہوئی اور ماہوں کے سامنے نہ لکھیں گی اور یوں منشی لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکے گی جو ہمارے پاک بیک کا اولین مقصد ہے۔ (اس سلسلے میں صرف نوسنہ پڑھنے کے خط آئے بلکہ مزید وسیع سیمہ جاب نے بھی پرشورہ دیا کہ انعامی مقابلے میں صرف نئی قلم کاروں کے نامانے ہی شامل کئے جائیں تاکہ ان کی زیادتی سے زیادہ حوصلہ افزائی ہو سکے۔ اس لئے اس ماہ سے انعامی مقابلے کی شرائط میں حسب ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

اب انعامی مقابلے میں نئی اور بتائی لکھنے والی خاتون کے انعامات ہی شامل ہونگے۔ کئی نیا انعامات ہونگے۔

پہلا انعام ۱۰۰ روپے
دوسرا انعام ۵۰ روپے
تیسرا انعام ۵۰ روپے

ان میں انعامی انسانوں کا فیصلہ ادارہ پاک بیک کرے گا۔ اس ماہ کے انعاموں کے متعلق انعامی افسانوں کا اعلان ہوا ہے۔ کیا جانے گا۔ بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ بھی اپنی رائے سے مطلع کریں۔



محب

ڈاکٹر عزیز مجھے اور میرے شوہر کو اپنے دفتر میں لے جا رہے تھے تو میں قدرے خوفزدہ تھی، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، مانو ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا، آنے والے کھٹن اور زور و فرسالت کے شعور سے میرا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا، طرح طرح کے دوسرے اندیشے اور خدشے میرے ذہن میں سرشار رہے تھے۔

میرے شوہر فیصل نے میرا زہم و نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تمام رکھا تھا، گویا مجھے دلاس دے رہے ہوں، نگرہ کروٹوری اللہ نے چاہا تو شب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن میں خوب جانتی تھی کہ میری طرح ان کے دل میں ہی خوف سمایا ہوا تھا۔



141

۱۲۲

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں یہ انسوسناک خبر آپ کو سادوں میں لے پہنچے ہی اپنے شر کا اظہار کر دیتا تھا، مجھے موجود سہمی امید تھی کہ میرا خیال غلط ثابت ہوگا لیکن آج صبح لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق کر دی۔

”آپ کا مطلب ہے....“

”ہاں، آپ کی بیٹی کو لیوکمیو یا ہو گیا ہے۔“

آنسو جواب تک میں نے روک رکھے تھے، آنکھوں سے چھلک پڑے، فیصل نے میرا شانہ آگے سے تھپتھپایا۔

ڈاکٹر عزیز نے واقعی ہمیں اس خطرے سے بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا لیکن مجھے ان کی بات پر زور بھی نہیں آتا تھا، لیکن انوشی ایسی ماں ہوگی جو لیکمیو کی شہوت کے نشیمن کر کے اس کی بچی کا نیکو خاک مرنے میں مبتلا ہے؟

پتہ نہیں، لیوکمیو کیا ملائی، چھپک، خسرو، تپ، دق، بڑبڑ، انفلوزنہ اور اس قسم کی دوسری بیماریوں کے بارے میں تو میں نے سنا تھا مگر لیوکمیو تو مجھے کوئی نئی بیماری تھی جس کی میری بیٹی کو لپکائی نہیں لیوکمیو میں مبتلا تھی، فیتی، جس کے دم سے ہمارے گھر میں رونق تھی، جسے معصوم قہقہے ہمارے گھر میں گونجنے رہتے تھے۔

”یہ گولی کھائیے، بیگم صاحبہ، ڈاکٹر عزیز نے ایک گولی ادا بانی کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، اس سے آپ کو بہت سونخ ملے گا اور آپ باسانی اپنے اوپر قابو پا سکیں گی۔“

گولی زبان پر رکھ کر میں نے لپکایا، مگر تھوڑے وقتوں کے گلاس اٹھا لیا اور مونوں سے لگا لیا، گولی کھا کر میں نے شکل انشوں سے گور و کا جو سسل میرے ڈساروں پر سر رہے تھے، میں نے بات کرنے کی کوشش کی مگر الفاظ باوجود کوشش کے میرے منہ سے نہیں نکلا۔

میرا سوال ڈاکٹر عزیز نے پوچھنا چاہی تھی، وہ فیصل نے ان سے پوچھ لیا۔ ”ڈاکٹر صاحب، فیصل کی سخت پالی کی تصویر بہت امیسا کی نہیں ہے؟“

”میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ اس بیماری کا علاج آج تک دریافت نہیں کیا جاسکا ہے، لیوکمیو ایک موذی مرض ہے، شاید ہی کوئی اس مرض میں مبتلا ہو کر صبح سکا ہو، ورنہ بیشتر مریضوں کا انجام موت ہی ہوتا ہے۔“

”اس بیماری کا علاج ممکن ہے، اصل میں ہی یورپ کے کسی ملک میں دریافت ہوا ہو،“ فیصل نے کہا۔

”میرا خیال ہے، یورپ میں ابھی تک اس مرض کا علاج دریافت نہیں کیا جاسکا ہے، ڈاکٹر عزیز نے سپر ویٹ کو میڈیکل کالے ہوئے بولے: ”آپ کی بچی کی بیماری ابھی دوسرے اسٹیج میں ہے۔“

”تو کیا واقعی....“

”ہاں، آپ کی بچی کا زندہ بچنا ممکن نہیں ہے، ڈاکٹر عزیز نے گمبھیر لہجے میں کہا، زیادہ سے زیادہ پچھ ماہ فیصل کی زندگی کے باقی رہ گئے ہیں، خون میں سفید خلیوں کی افزائش روکنے کے لئے ہمیں ایک بھرے ٹرانسٹ شروع کر دینا چاہئے، ممکن ہے، ہم فیصل کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں، میرا مشورہ ہے کہ آپ دعا کریں، فیصل کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر عزیز ہمیں دیتے ہیں اس جان لیوا بیماری کے بارے میں بتاتے رہے، اب آنسوؤں کو روکنا میرے بس نہیں رہا تھا، میں فیصل کے شانے سے سر کھانے دوٹی رہی، رہ رہ کر سی اتھرتا نک خیال دل کو کچھ کسے نگار تھا کہ میری بیٹی اور معصوم بچی جی جی چھ ماہ بعد ہم سے جدا ہو جائے گی، ہماری تیار ڈوب جائے گی ہمارے گھر کا چرچا بچہ جلنے کا لپکائی تو ہمارے گھر کا اٹھالا ہے، اس کے مرنے کے بعد تو گھر اندھیرا اور ویلان رہ جائے گا، دیواریں کاٹنے کو دوڑیں گی۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے اس نا انصافی کی فریاد کی، ”اے اللہ، تو مجھے کن گناہوں کی سزا دے رہا ہے، اس مرض کے لئے اس دنیا میں کیا میری بچی رگے تھی؟“

ڈاکٹر عزیز نے ہمیں بتایا کہ ہر جمعرات کو صبح ۱۰ بجے کے کلینک آنا پڑے گا، آخر ایک کھنچے بعد ہم ڈاکٹر کے ہاں سے خست ہوئے، میرا پی چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر فیصل کی اتنی کٹھن جی پوچھ لیاں ہم لپکائی کو چھوڑ آئے تھے، میرا پی اپنی بلیفیب بچی کو سینے سے لگا کر خوب پیچھے پیچھے کر بیا کر کے کو چاہ رہا تھا لیکن فیصل نے پہلے گھر چلنے کی تجویز پیش کی تاکہ ہم اس اہم مسئلہ پر سکون سے گفتگو کر سکیں، میں نے فیصل کی یہ عقلی تجویز منظور کر لی اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

فیصل نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود چائے بنانے باورچی خانے میں چلے گئے، کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں دو کپ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، ایک کپ آنکھوں نے میرے ہاتھ میں تھما دیا، دوسرا کپ لے کر وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور گرم گرم چائے کی پیچیاں لینے لگے۔

”یہ بات ہم فیصل کو کیسے بتائیں گے؟ میں نے فیصل سے پوچھا۔“

۱۲۳

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ فیسی ابھی پانچ سال کی ہے، ہم نے کیسے بتائیں گے کہ دن بدن اور لمبہ و لمبہ وہ موت سے قریب ہوتی جا رہی ہے مگر میں نے ہولناک بات بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اتنی چھوٹی بچی کو ایسی بات نہیں بتانی چاہیے یہ بات ہم کی بچی نہیں بتائیں گے حتیٰ کہ اتنی جان کو بھی یہ نہیں پلنے دیں گے کہ فیسا ایک لاعلمی مرض میں مبتلا ہے اور خدا کے لئے فیسا کو اس بات کی ہوا بھی نہ گئے دن ورنہ وہ ویسے ہی گھل گھل کر مر جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے اور ہم ہی کو اس صفت پر پکڑا ہے۔ میں نے اسے سامنے میز پر رکھی ہوئی فیسی کی رنگین تصویر کو دیکھا، وہ بھول لڑکائی لباس میں لمبوس نکوی کے خوبصورت گھوڑے پر بیٹھی سکر رہی تھی، تصویر چھ ماہ پہلے فیسی کی ساگرہ کے موت پر آصف نے خود کھینچی تھی، اس وقت فیسی تھی تو تھی تھی، اس کے معصوم ہاتھوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ جیسے دنیا دوں نے میرے ذہن پر بیخار کر دی اور اس تصویر میری آنکھوں میں بھل جانے لگے، فیسی کی تصویر دھندلا گئی جیسے دھندلے آئینے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔“

”فیسیوہی طرح دن بدن دھندلائی جائے گی، میں نے آنکھوں سے آنسو نکل کر کے ہونے سوچا اور پھر ایک دن آئے گا جب تصویر شاید ہمیشہ نہیں نہیں میں اس تصویر کو نہیں مٹے دوں گی، فیسا نا نہیں مے گی، وہ زندہ رہے گی۔“

ڈاکٹر ابچور نے گئی، پھر میں اس کے ہاتھوں میں ہندی رچاؤں کی، اسے دہن بناؤں گی،

”کیا سوچ رہی ہو نوری؟ فیصل کی آواز میرے کانوں سے نکلتی۔“

جواپے ہاتھ پھیلائے دنیا ناکی تصویر کی طرف بڑھ رہا ہے۔
”مجھے تو کوئی سائے نہیں آ رہا، یہ محض دہم ہے تمہارے“
دن پر فیسا ناکی بیماری چھا گئی ہے، خدا کے لئے اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال پھینکو نوری، اس طرح تو تمہارا بڑا بچاؤ اور پھر فیسا نا کی دیکھ بھال کون کرے گا؟

میں نے فیصل کی بات کی تائید میں اپنا سر ہلایا، وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ابھی سے میں دل برداشتہ ہوئی تو پھر کچھ دیکھ بھال کون کرے گا کون اس کے علاج پر توجہ دے گا۔
فیصل نے میرا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا میں نے اپنا سر اٹک کے چوڑے پچکے سینے پر ٹکادیا، وہ میرے بالوں میں گھلایا پھر تھمے ہوئے بولے۔ ”اللہ تعالیٰ نے پانچ برس پہلے فیسا نا ہمیں عنایت کی تھی، فیسا نا اللہ کی دی ہوئی امانت ہے، نوری، وہ جب چاہے اس امانت کو ہم سے واپس لے سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، میں اپنے ایمان کو مضبوط رکھنا چاہتا ہوں، وہ بڑا مغرور الرحیم ہے، نوری، ضرور وہ ہم پر رحم کرے گا۔“

میں نے مشکل اپنے اوپر قابو پایا اور آنکھوں سے آنسو پونچھ لئے۔ ”حاصلہ کھو نوری؟ فیصل نے ملاکت سے کہا۔“ اپنے روزمرہ کے کام اس طرح سرانجام دو کہ کسی کو تبدیل کا احساس نہ ہو سکے۔ خاص کر فیسی کو تمہاری افسردگی کا پتہ باطل نہیں چلنا چاہیے ورنہ اس کی صحت پر برا اثر پڑے گا میں چاہتا ہوں، تم ہر وقت ہنسی مسکرائی نظر آؤ، یہ اس کے لئے نہیں اپنے اوپر جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے سوچا کسی مال کو پتہ چل جائے کہ اس کی بچی چھ ماہ کے تھیلے میں چھپ چکے ہو جائے گی اور اس کو ایک تنگ و تاریک اور سرد قبر میں دفن کر دیا جائے گا تو وہ کس طرح ہنس سکتی ہے، اسے تو ہر وقت یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ایک بچہ سو رہا ہے۔“

”ہم دونوں میاں بچوں نے مل کر یہ کہہ کر خود کو کم شاش بنایا ظاہر کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔“

خوشی سے سر تھار کر تھی ہوتی ہماری طرف بھی، تب میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی ہوں فیسی کو اپنی آنکھوں میں سختی سے بیخ لیا اور اس کے سر پر سفید پھولے ہوئے گالوں کے کئی سیارے ڈالے، پھر اس نے ہمیں بڑے خوش و خوش سے اُن ٹھیکساری ڈانڈوں کے بارے میں بتایا جو ادبی اماں نے اُسے لکھ دی تھیں۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر عزیز نے فیسی کو زیادہ مٹھا دینے سے منع کیا تھا۔

”تم بہت اچھی بچی ہو فیسی، میں نے سارے اس کے کال تپ چھپاتے ہوئے کہا۔“ لاؤ یہ ڈانڈیاں مجھے دے دو، زیادہ ڈانڈیاں کھانے سے بیٹھ میں بڑے کھڑے پیدا ہو جائے ہیں۔“
فیسی کے چہرے پر ایسی ادب اور فسر دہی کے تاثرات نمودار ہوئے اور فیصل کی آئی نے اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو کبھی تو جہاں بچوں کو ڈانڈیاں بہت پسند ہوتی ہیں، اگر تم نے فیسی سے ڈانڈیاں لے لیں تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔“

”مگر میں کسی صورت میں اُسے ڈانڈیاں نہیں کھانے دوں گی میں نے تیزی سے کہا۔“
فیصل کی اتنی میرے لب و لہجہ اور چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے میں رگ گئیں۔ انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اتنے سخت لہجہ میں ان کی بات کا جواب دوں گی میں نے فیصل کی طرف دیکھا تو میری سرخو کاٹھڑے تھے، وہ میری جذباتی کیفیت کو سمجھ چکے تھے، اس لئے کچھ بولے نہیں، چند لمحے بعد آنکھوں نے اپنی اتنی سے کہا۔ ”اُمی، آپ نوچہاں کی بات کا کلمات ملنے لگے گا کچھ کچھ دلوں سے ان کی کمیت ٹھیک نہیں ہے اور پھر گزشتہ ہفتے ایک دندان ساز نے مشورہ دیا تھا کہ فیسا نا کو زیادہ میٹھا نہ دیا جائے۔“

”اچھی بات ہے فیصل کی اتنی نے کہا۔ اگر تم یہی مانتے ہو تو یہی ہی لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ آج کل کے والدین اپنے بچوں کے بارے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پریشان رہتے ہیں۔“
اب ہم اپنی زندگی کے سب سے مشکل اور پریشان کن انڈو میں داخل ہو چکے تھے، ہماری اکلوتی فیسی فیسی نے چھ ماہ کی مختصر مدت میں ہم سے جدا ہونے والی تھی کہنا تکلیف دہ خیال تھا کہ وہ بڑی نہیں ہو سکے گی، میں اس کے گورے گورے ہاتھوں پر ہندی نہیں رہا سوں گی، میری نانی اماں بننے کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکے ڈاکٹر عزیز نے کہا تھا کہ چھ ماہ کے دوران میں کبھی وقت فیسی کی موت واقع ہو سکتی ہے، لیکن ہے وہ ابھی کھیلنے ہوئے بچہ اگر گر پڑے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح نفس منفردی سے پرواز کر جائے۔“

ہر جمعرات کو مجھے فیسی کو دھونے کے علاج کے لئے ڈاکٹر عزیز کے کلینک لے جانا تھا، اس کے علاوہ ہر ہفتے اب اس پر مجھے فکر کرنی پڑ رہی تھی، میرے ناقابل کا بندھنوں پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی جسے مجھے حسن و خوبی پر اوار کرنا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ فیسی میری لاپرواہی اور عدم توجہی کے باعث موت سے ہلکا ہو جائے، فیسی کو اپنا محافظ کرنا پڑتا نہیں تھا اور جب کوئی برس اسے انجکشن لگانی یا ایسا ٹری ٹیسٹ کے لئے اس کا تھوڑا سا خون نکالنا جاتا تو وہ جینے جینے کمر لگا کر کلینک سرور لٹھا لیتی، یہ پریشان کن اور تکلیف دہ صورت حال اس وقت تک برقرار رہی جب تک ڈاکٹر عزیز نے اس کا ہر قسم کا علاج اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیا، ہاشم انہیں بچوں کو بہلانے اور پھیلانے کا فن خوب آتا تھا، وہ ہی ہفتوں میں فیسی اپنی ساری کھوپڑیاں بھول کر صحت مند اور اچھی بچی بن گئی، اب وہ خاموش سے انجکشن گواہی لکھتی تھی۔

”فیسی، تم بہت بھگدڑ اور اچھی بچی ہو، ڈاکٹر عزیز کبھی کو میں اگر کہنے اور فیسی کے ہونٹوں پر ساری سی مسکراہٹ پھیل جاتی بار بار کے محاوروں کو دہراندہ نہیں کرتی تھی لیکن ان کی اہمیت اُسے اس بگیا تھا، کلینک میں ایک کچھ بچوں کے کھیلنے کا بھی تھا، اس کمرے میں بہت سارے اچھے اچھے کھلونے رکھے ہوئے تھے، ان کھلونوں کی وجہ سے فیسی کا دل بہلا رہا تھا۔“

فیسی کا علاج کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کے کھلانے پینے کی چیزوں کا ڈاکٹر عزیز نے باقاعدہ جارت بنا کر دیا تھا اجارٹ میں کچھ ہی چیزیں ایسی تھیں جو فیسی کو پسند تھیں، بیشتر چیزیں ایسی تھیں جو فیسی کو باطل پسند نہیں تھیں بلکہ ان میں سے کسی ایک چیزوں سے تو وہ سخت نفرت کرتی تھی، اسے ایسی چیزیں کھلانے میں مجھے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

فیسی کے آرام کا بھی خیال رکھنا تھا، ڈاکٹر عزیز نے فیسی کے لئے دن میں ایک گھنٹہ کی نیند کو ضروری قرار دیا تھا اور فیسی کو زبردستی سنانا ایک مسئلہ تھا، آپ ہی بتائیے، کبھی کبھی کو زبردستی اس طرح سٹلایا جاسکتا ہے جبکہ اس کا جی باہر اپنی ہم عمر بچیوں کے ساتھ کھیلنے کو چاہ رہا ہو مگر فیسی فطری طور پر سا بڑا وسعت مند شخص تھا، اس نے کسی کسی طرح حالات سے سمجھ کر کر لیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس اب تک خود پر قابو نہیں پا چکی تھی، دن میں اس پر لوجہ پین اور ٹکڑے مند رہتی، رات کو مجھے بڑے ہولناک اور ڈراؤنے خواب نظر آتے اور میں بچہ مار کر اٹھ نہ سکتی۔ دن بدن میری صحت گرتی جا رہی تھی۔

فیصل ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاتے تھے، انھوں نے یہاں تک ہوسختا تھا میری مدد کی، وہ اکثر مجھے مبرا درخت کی پلکیں کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے میرا حوصلہ بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن میں اپنی جگہ سے ہٹنے سے انکار کرتا تھا، وہ بھائی، ایک دن میں سب کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹی فیصل کی ہوتی جا کر کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ فیصل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وفادار انداز میں چلتے ہوئے میرے قریب آئے اور کھینچی باندھ کر مجھے دیکھنے لگے۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنے ذہن کو تو کمرے سے تفکرات سے آزاد رکھنا چاہتا ہوں، بالآخر انھوں نے حکمت و حکمت کو ٹوٹے ہوئے کہا ”فرا سوچو، اگر اسی طرح پریشان اور فکرمند ہو گئی تو بیمار ہو جاؤ گی پھر فیصل کی دیکھ بھال کو نہ کر کے گا۔ اس تم سمجھتی ہو کہ میں سنگدل اور جیسے ہوں میرے جذبات اور احساسات نہیں ہیں اور کیا فیصل کی محبت سے مبرا دل خالی ہے، نہیں پوری، ایسی کوئی بات نہیں فیصلی مجھے بہت عزیز ہے، اس کے لئے میں آنا ہی مقرر اور پریشان ہوں یعنی کمرے ہو، فرق عرف آتا ہے کہ نگہوں اور پریشانیوں کو کم کرنے کے ذہن پر مسلط کر رکھا ہے جبکہ میں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے ہوں، ہر آزمائش، ہر مصیبت اور ہر تکلیف کو خندہ پیشانی اور مبرا استقلال کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔

”میں سخت خوفزدہ ہوں فیصل، میں نے اپنے زخموں پر بیٹھتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا ”اللہ جانے کیا ہو گا میری کچی پرچہ کی یا نہیں، چہ نہیں میں نے اس کا سونگنا کیا ہے میری کچی ایسے جان لیوا مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔

”اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے تو کیا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس آزمائش میں ثابت قدم رہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں مبرا کرنے والوں کے ساتھ ہوں، میں اس واحد و احد شریک کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہتا ہوں۔

فیصل اللہ کو میرے بستر کے قریب آئے اور اس کی سے میرے برابر بیٹھ گئے، میں نے اپنا سر ان کے چوڑے سینے سے ٹکایا اور دھیرے دھیرے بالوں میں دھیرے دھیرے اٹھائیں پھیرنے لگے، ان کے سینے سے لگ کر میں ڈاکھن محسوس کر رہی تھی، اس خیال نے مجھے طمانیت بخشی تھی کہ مصیبت کے اس ٹھن وقت میں میں تنہا نہیں ہوں فیصل میرے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

نمبر کی بندرہ تاریخ کو فیصل کی سالگرہ تھی اور یہ ہمیں آگت کا تھا گویا سالگرہ میں اسی پانچ بیٹے باقی تھے، پر نہیں اس

وقت تک میری کچی زندہ رہے گی یا اللہ کو یہاری ہو جائے گی، اس ضمن میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی، ممکن ہے اپنی سالگرہ کا ایک کاٹنا اور غزنوں، رشتہ داروں سے تحائف قبول کرنا اچھے نصیب ہو جائے، یہ بھی تو ممکن ہے کہ سالگرہ والے دن میرا یہ لباس پہننے، بال بھڑکنے بھی ہوں اور فیصل مجھے مبرا کی تلقین کر رہے ہوں۔ اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال کھلی کی طرح گوندا کر چھوٹی ہوئی ایک تقریب سالگرہ سے پہلے بھی تو منجھد کی جا سکتی ہے فیصل بازار سے ایک کیک، ٹھکانا، پھل، اور دوسری چیزیں لے آئیں گے اور گھر میں بیٹھے ریلے آؤں گی اس کیم کریم تار کو لگی ہوئی بہت لطف ہے گا یعنی کیم کیم ہر لڑکیوں اور لڑکوں کو بلا لینگ، پھر ایک کیم کیم کا آئیں کریم اور دوسرے لوازمات آئیں گے بچوں کے مخصوص تم قہوں سے پورا گھر گونجنے لگے گا۔

پنچانچہ میرے اور فیصل کے باہمی صلاح و مشورے کے بعد نیچر کے روز تقریب منعقد کی گئی، مجھے بھر کے پیارے پیارے بچے اس میں شریک ہوئے فیصل اور میں نے اس تقریب کو بڑھاپے پارٹی، فرض کر لیا تھا، فیصلی اس غیر متوقع تقریب کے انعقاد پر بہت تعجب ہوئی لیکن فیصل نے اسے بہتر کر اطمینان دلایا کہ ہیلپوں سے تعلقات مضبوط بنانے کے لئے اس قسم کی تقریبات منصفہ ہوتی رہنی چاہئیں تقریب بہت شاندار اور دلچسپ رہی، بچیاں اٹھتی، کودتی، بھاگتی اور شور مچاتی رہیں، مختلف قسم کے کھیلوں سے دل بہلائی رہیں، دیا معلوم ہوا تھا ماؤ خیرال کے طویل اور ادا کرنے والے موسم میں تیس چانگ کی بہار آگئی ہو گی یہ بہار عارضی تھی بچوں کے رخصت ہو جان کے بعد ڈرا دینے والا سنا اور آیا تھا اور گھر کے دروازے پر خوف ک پرچائیاں تھیں کر لگے تھیں۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے فیصلی کی حالت ڈھل جاتی تھی، اس کے زخموں کی مٹی ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ پیلاہٹ نے لے لی تھی، جسم لاغر ہو گیا تھا اور وزن میں بتدریج کمی ہو رہی تھی اب فیصلی کو ڈاکٹر غزنو نے بستے میں مبرا مرتبہ ٹیکٹ لائے کی ہدایت کی تھی، اس کے علاج حالے پر ساری تیس پچی خیرا ہوئی تھی فیصل نے اپنے ایک قریبی دوست سے دو ہزار ترقی لئے تھے ”اے بھی ختم ہونے والے تھے، ایک مرتبہ پھر کسی سے آگے ہاتھ پھیرنا سنا جس کے فتنے رہے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی کیونکہ یہ پانچ شہادہ فطرت کے خلاف تھی لیکن مجھوری انسان کو کیا کہیں کرا، ادا اور پھر فیصل نے تیرہ کر لیا تھا کہ وہ فیصلی کا ماما ڈاکٹر غزنو کے ہاں۔

کلید کی ہی میں کر لے گا، چاہے اس کے لئے اسے کچھ ہی کیوں نہ پڑے فیصل کی آئی کو ہم نے فیصلی کی بیماری کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور یہ ہمارا پانچوں ہی تھا ورنہ ہمیں اب تک انہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا، فیصل کا اسٹال اس سلسلے میں یہ تھا کہ وہ دل کی ریفیڈ تھیں اور فیصلی کو جنون کی حد تک چاہتی ہیں، ممکن ہے وہ اندوہ نگ بات کو برداشت نہ کر پاں لیکن فیصلی کی تیز گزرتی ہوئی حالات نے انہیں شبہ میں مبتلا کر دیا اور انھوں نے بچہ سے سختی سے فیصلی کی گجڑی ہوئی حالت کے بارے میں استفسار کیا اور میں نے نہیں الف سے کہہ دیا، سب کچھ بتا دیتے، سچ بچھتے تو ہیں خود ہی انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی تھی، اور انہیں سب کچھ بتا کر میں بہت سکون محسوس کر رہی تھی، میرے سر سے ایک بوت ڈرا بچہ اتر گیا تھا، انھوں نے مجھے کاپی ہوئی آواز میں صبر کی تلقین کی، میں نے دیکھا کہ ان کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا، اور جیسے پر تشویش اور پریشانی کے آئینہ نمایاں تھے فیصلی کی بیماری کا کس کران کے دل کو شدید ڈچکا ہو چکا تھا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھو لیکن بالآخر انھوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ”فیصلی ضرورت مبرا ہو جائے گی، ان کوڑے ڈانکوں کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہے، کبھی کبھہ کہیں آں اور کبھی کبھہ لوہلا تاؤ دنیا میں کوئی ایسا مرض بھی ہے جس کا علاج نہ ہو، اللہ نے ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے۔

پانچواں مہینہ آن ہو چکا میری بی بی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا، فیصلی کی حالت اب مجھ سے کبھی نہیں جاتی تھی کیونکہ کربلا کا ٹاپو گئی تھی، پڑ پڑی بھی بہت ہو گئی تھی جب دیکھو روٹی رہتی تھی۔

ایک دن رات کے تیسرے بہر ایک میری آنچھ کھل گئی فیصلی اپنے چھوٹے پانگ پر کھون کی فینڈ سوری تھی، فیصل اپنے بستر پر موجود نہیں تھے میں نے بستر کے برابر کھڑے ہوئے میل لمپ کو بلا کر نامت پس میں وقت دیکھا، پانچ بج کر میں مٹ ہوئے تھے، برابر کے کمرے سے فیصل کی دبی آواز سنائی دے رہی تھی، پتہ نہیں، رات کے اس پہر وہ کیا کر رہے تھے، آنچھیں ملے ہوئے میں بستر سے اتری، سیلپر پہنے اور ساتھ والے کمرے کی طرف چل دی، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں دیکھ کر فیصلی کی کھڑکی پر گئی میری آنچھوں نے جو منظر دیکھا، اس کی مجھے بعید ترین توقع بھی نہیں تھی فیصل خفید کرتے پاجامے میں بیٹوس، ٹوپی اوڑھنے بیٹھے ہوئے تھے، ہاتھ دعا میر

انداز میں اٹھے ہوئے تھے، آنچھیں بند تھیں، زیر لب شاید دعا مانگ رہے تھے، زخموں پر آنسوؤں کے بہنے کے نشان نمایاں تھے فیصلی دیر تک روتے رہے تھے، دفعتاً ان کی آواز بلند ہو گئی، وہ گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی بی بی کی محبت مبرا کی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

”پروردگار، تو ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو گئے ہیں، انہیں درگزر فرما، مالک ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو ہم ہمارے نہیں جس بار کو اٹھائے کہ ہم میں طاقت نہیں، وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ تیری رحمت، ہم سے درگزر فرما ہم پر رحم کر تو بڑا بخشنے والا رحیم ہے، میری بی بی کو شفا عطا فرما، میرے سب بھمارے قدم مبارک ہے، ہم ہر صبر کا فیضان کر، ہمیں اپنے خزانہ فیض سے رحمت عطا کر تو ہی فیاض ہے۔

میں مارے شرم سے بالی پانی ہو رہی تھی مجھ پر فیصل کو دعا مانگتے دیکھ کر رقت طاری ہو گئی تھی، آنسو میری آنچھوں سے بہے جا رہے تھے کتنی عجیب بات تھی، ایسے ٹھن وقت میں نے اپنے مشکل کشا، رب العالمین کو فراموش کر دیا تھا، کاش یہ فرش پھٹ جائے اور اس میں سما جاؤں،

واپس اپنے کمرے میں آکر میں نے ایک حاصف تھرا جوڑا زیب تن کیا، اور ڈوکر نے غسل خانے کی طرف چل دی، کوشش کے باوجود میں اپنے آنسوؤں پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوئی، فو کے دوران کبھی میرے آنسو نہیں تھے،

فیصل کے برابر بیٹھے بچا کر میں نے فجر کی نماز ادا کی، فیصل بدستور آنچھیں بند کئے آیت کریم کا درود کر رہے تھے، وہ اچھا آتنا یا کیرہ تھا کہ اس سے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی، جب انسان پر مصیبتیں ٹپتی ہیں تو اسے خدا بہت یاد آتا ہے، مجھے فیصل نے بڑی طرح بھجور کر خواب غفلت سے بیدار کر دیا تھا، نماز کے دوران مجھ پر کچھ ایسی ہی صحنی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی کہ آنسوؤں کی جھری لگ گئی، مشکل میں نے نماز ادا کی اور پھر وہیں صلی پر بیٹھ کر آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اور ساتھ ہی سر و نوں نافوں میں لے کر پچھلے کے رونا شروع کر دیا، بھٹوری دیر بعد ہی بچکی منگ گئی اور میں بے حال ہونا شروع ہو گئی، اتنے میں کیا محسوس کر رہی ہو کر کوئی میرے کندھوں کو بھجور رہا ہے، آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے چپے شر کر دیکھا، فیصل آنچھوں میں آنسو لے کھڑے تھے، انھوں نے میرا ہاتھ قلم لیا اور دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے، پھر دم نوں میاں ہوئی نے مل کر آیت کریم کا درود شروع کر دیا، صبح تک ہم گڑ گڑا کر دعائیں

مانگے رہے اور قرآن شریف کی مختلف آیتیں پڑھتے رہے، اس رات کی عبادت نے میری کایا پاٹ دی، سارا ڈر اور خوف دل سے نکل گیا، میں انتہائی جوش اور ولولہ محسوس کرنے لگی خدا پر بھروسہ کر میں نے فیسی کی دیکھ بھال کرنے لگی، رات کی نیند میں نے اپنے اور حرام کر لی جس کے بھی اضطراب دے چینی حد سے بڑھتی تو میں کئی کئی مرتبہ آیت آخری کو پڑھتی اور خدا کی شان دل کو فوراً اعلیٰ نفع نصیب ہو جاتا۔

ایک ہفتے بعد مجھے فیسی کو ہسپتال میں داخل کر دیا دو روز بعد اس کے جسم کا سارا خون نکال کر تازہ خون اس کی رگوں میں دوڑا تا تھا، یہ بہت ہی خطرناک مرحلہ تھا، زیادہ تر مریض خون کی فیسی



انسانی افغانوں کا نیکو

پاکیزہ میں ٹوٹے

ماہ جو افسانے شائع ہوئے تھے ان میں

سے انسانی افغانوں کا انتخاب تاریخی کو کرتا تھا۔

مقابلے میں بیسی گزلی، ماہ سین اور زیب افغان کے افسانے نہیں شائع کیے گئے کیونکہ یہ تین خواتین اولے کی لڑکی ہیں۔ ان کہانیوں کو نکلنے کے بعد سے زیادہ مظلوم تقریباً ۱۱۰۰ ویدیم کے افسانے سکون دل کی خاطر کے لیے ہیں لہذا ان کے افسانے کو اول قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۳۰ مظلوم عمر نہایت اقبال کے افسانے آتا آچل کے لیے ہیں۔ ان کے افسانے کو دم قرار دیا جاتا ہے۔ عمر نہایت اقبال سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مکمل پتے آگاہ کریں۔



ادارہ قلمیہ و فنیہ و ادبیہ و تعلیم و تربیت اقبال کو دل بہانہ پیش نہ کیے



کے دوران انتقال کر جاتے تھے بقول ڈاکٹر عزیز کے بعض مریضوں کا جسم نیا خون قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا، اس طرح مریض کی موت واقع ہو جاتی تھی۔

دو روز کس قدر تکلیف اور زحمت میں گزارے، یہ وہی جان سکے ہیں جو اس قسم کے مرحلے سے گزر چکے ہیں، آپریشن سے ایک روز پہلے کی رات میں اور فیصل ایک پل کے لیے بھی نہیں تھے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مسئلے سے ہی نہیں اٹھے جتنی دیکھیں اور قرآنی آیات مجھے یاد تھیں، انہیں میں بار بار پڑھتی رہی۔

دوسرے دن دس بجے آپریشن شروع ہوا، فیصل ان کی اہلی اور میں کو ریڈوز میں انتہائی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں بیٹھے رہے، ایک ایک لمحہ قیامت کا لمحہ تھا، وقت کسی طرح کاٹے نہیں کٹ رہا تھا فیصل نے کئی بار مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا، لیکن مجھے قرار کہاں تھا، ایک منٹ کے لیے بیٹھتی اور پھر ٹھہرنا شروع کر دیتی، خدا خدا کر کے چار گھنٹے کا طویل آپریشن ختم ہوا، ڈاکٹر عزیز رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے آپریشن تھکے سر سے باہر نکلتے فیصل ان کی اہلی اور میں ایک ساتھ ان کی طرف لپکے۔

”کیا رہا ڈاکٹر؟ فیسی تو ٹھیک ہے نا؟“ ہم تینوں نے

ایک وقت پوچھا۔

ڈاکٹر عزیز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے نرمی سے جواب دیا ”بارک ہو مریض، آپ کی بیٹی کا آپریشن معجزانہ طور پر کامیاب رہا، ہاں میں اسے مجروحہ کی کہوں گا نہ صرف اس کلینک میں بلکہ پورے ملک میں کیو ما لایہ سہلا کامیاب آپریشن ہے میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ آپریشن شخص آپ کی دعاؤں کی بدولت کامیاب ہوا ہے۔“

”ہاں ڈاکٹر یہ سب اہلی جان اور نور جہاں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے“ فیصل نے کہا۔

”اور آپ تو جیسے اس سارے عرصے میں ہمارا مدد کیجئے تھے مجھے رہا نہ گیا، بول ہی پڑی اپنی بات تو یہ ہے کہ آپ ہی نے مجھے سیدھی راہ پر چلایا اور میں تو یونہی اندھیروں میں گھسکتی پھر رہی تھی آپ نے میرے دل میں جو صبح ہاریت روشن کی ہے، اللہ اللہ میں اسے کبھی جھینے نہیں دوں گی، اور ہاں ڈاکٹر صاحب، کیا ہم اپنی بیٹی کو دیکھ سکتے ہیں؟“

”ہاں ہاں بھئی نہیں، تشریف لائیے، ڈاکٹر عزیز مسکرا کر بولے۔“

کامیاب ازدواجی زندگی



شادی کے بعد شوہر اور بیوی کی فتنے واری توجہ ہوتی

ہے اور مستقبل کی تصویر میں دیکھ جھنسنے ہوتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کا تصور خوبصورت ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ ازدواجی تعلقات کی بنیاد محبت ہو۔

شادی شدہ زندگی میں شوہر اور بیوی کے درمیان محبت کے بندے کی سب سے زیادہ اہمیت

ہے۔ اس بندے کے بغیر ازدواجی زندگی بھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ عورت کا وجود بے حد پایا دل ہے۔ اُسے

پیار محبت کی دلیی کہا گیا ہے، اس کے بندوں میں محبت دلچسپی دیتی ہے۔ وہ محبت کوئی سہرا اور غرض میں محبت

پانے کی خواہش دیتی ہے۔ محبت کے غفلت ڈوب جاتے ہیں جس کا تعلق جسم اور دل دونوں سے ہوتا ہے۔ شوہر کو

چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کی محبت کو قبول کرے اور بدلے میں اسے بھرپور محبت دے۔ بیوی کا فرض ہے کہ وہ ہر مناسب

موقع پر شوہر کو بھرپور پیار دے اُس کے دکھ کا پناہ دے اور اُس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھے۔ بیوی کی حیثیت سے ہر قدم پر

اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اُس کے بندہ کی قدر کرے، بناوچہ اس پر نہ بھیجی ذکر کرے۔ اگر کبھی کسی بات پر تنقید کرنا ضروری

ہو تو اُس کا انداز اور مہذب انداز ہو کہ شوہر کو اس میں بھی محبت کا شہرہ حاصل ہو۔ اپنی تنقید بھی سے شوہر کے

بندہ کی محبت سے پیچھے یا بیوی کی ایسی مدد جس سے خاوند دلچسپی ہو، ازدواجی زندگی کو بھانجی گئی ہے۔

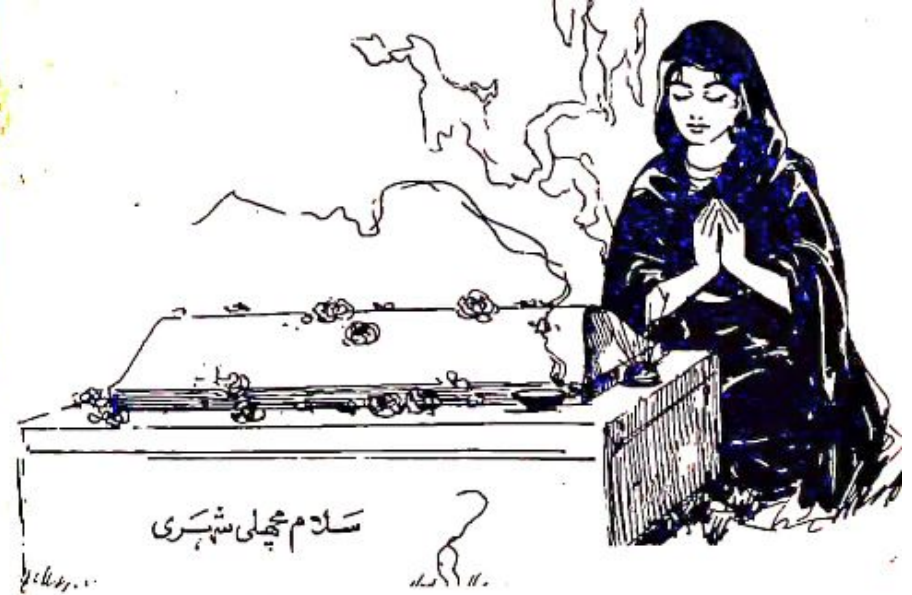
بہجے کی بھانجی، بھول کی بھانجی، تعریف کے درجوں اور محبت کا اظہار ازدواجی زندگی کی

بنیاد کو مضبوط بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر ایک بیوی اس دوسرے پر کار بندہ دیتی ہے تو یقیناً

شوہر بھی اپنی بیوی کو شکایت کا کبھی موقع نہیں دے گا اور جب شکایت پیدا ہو

ہو گی تو زندگی میں محاسن کتنے کی اور یہی محاسن ازدواجی زندگی کی جڑیں





سلام چھلی شہسری

قود توڑ کے آئی ہوں فائے کے لئے
جو سن سکو تو تم ہی سے یہ پوچھے کیلئے
”کہ تم تو زندگی فوبہ کو کے قائل تھے
گلگوں کی موج ستاروں کی منہ قائل تھے
تہیں چھپکتے پرندوں سے پیار تھا کتنا
اور اپنے گھر کے تنگ فوسے پار تھا کتنا
تم ہی تو کہتے تھے ”میں زندگی کا ساتھی ہوں
جو تم ہو شمن تو میں روشنی کا ساتھی ہوں“
تمام دھڑے بھلا کر یہاں چلے آئے
فضائے گور غریباں سے کچھ نہ گھبرائے
یہاں تو چاروں طرف موت ہی کا ڈیرا ہے
سحر کا وقت ہے لیکن بڑا اندھ سیرا ہے
گلاب سرد، سبک نہنیاں ہراساں ہیں
بری یہ ساری اگر قباہیں ہراساں ہیں
ہست ٹھنک یہاں سورج کا نور رہتا ہے
خدا بھی جیسے خزاںوں سے دور رہتا ہے

ماف کیجئے میں کچھ بہک گئی شاید
رگ خودی کوئی میری پھوک گئی شاید
یہ بھول بیٹھی کہ میں مناتے کو آئی ہوں
یہ بھول اور یہ خوشبو جی تو لائی ہوں
مجھے تو کہنا ہے ”دوب کر عقیدت میں“
”رکھے خدا تمہیں اپنے جوار رحمت میں“
مگر نہ جانے مرے دل میں کیا خیال آیا
بچائے اشک فشان مجھے حبال آیا
فضا خوش، مبرا پپ، تو آسمان ساکت
مرے لئے تو ہے گویا یہ دو جہاں ساکت
اب ایسے میں مری حالت خدا کر ہے سلام
اثر بھی ہے کہ نہیں، یہ موعا کو ہے سلام
یہ جائے پاک ہے تم بھی زبان نہ کھولو گے
مجھے خبر ہے کہ اب تم کبھی نہ بولو گے
تو اوداع ”بری زندگی، مری دُنیا!
کہ آج سے ہے مرا نام ”نوجواں بیوہ۔“

پہلو بونہاں

میں اپنے لئے درد کا خورشید بنی ہوں
تاروں کی خاک چھاؤں میں کیا کیا نہ ملی ہوں
دیکھو تو میرے رنگ بہت بھول کی مانند
سوچو تو فقط خواب کے سانچے میں ڈھل ہوں
تو قر کے افسوں کا سلام بھی یہی ہے
میں گھر کا اجالا ہوں، مگر ترہ بھی ہوں
میں خود سے بھلا ہونے نیا غم ہوں سراپا
میں ایسا تافل تو نہیں اپنی خوشی ہوں
اشکوں کی روانی سے بہا وقت کا دھارا
میں وقت کی موجوں کا ستم بھول چکی ہوں
آجائے تقدس کا ہستہ تجھ کو بتاؤں!
میں غصہ سرت موم ہوں معینوں میں کبھی ہوں
وہ جبر کا مطلق ہو کہ غالب کی غزل ہو
ترشے ہوئے الفاظ کے پیکر میں چسپی ہوں

ریحانہ رضوی تبسم

شاہدہ شبیر

سوچا ہے مجاں بول میں ایسی کوئی تصویر ملے
شاید کہ ہم کو زندگی کی اب انتہا ملے
کیا نہ جرجی وہ اب کرے ہیں کیوں
جائے موج کیونکر بنا ساحل سے ملے
بھٹک جائیں جب تیری سوچ کے بھلے
کر کوشش دل کو عقل کی پاسبانی ملے
رُسوائیاں جس کی خاطر ہوں سیری شادی
کاش دل کو ایسی نہ کوئی تصویر ملے

دل غریب پریشاں ہے، دیکھئے کیا ہو
اگر گردش دوراں ہے دیکھئے کیا ہو
ہمارے خون کی بوندوں کی روشنی سے طفیل
روشن روش پر چسرا غافل ہے دیکھئے کیا ہو
ابھی ابھی تو بتا یا سنا آشتیاں ہم نے
ہجوم برقی ہے، باراں ہے دیکھئے کیا ہو
افس نصیب! ایسے آشتیاں کی خیر دنا
بلائی زد میں گلستاں ہے دیکھئے کیا ہو
وہ دل کہ صبح مسرت بھی جہنم کی نازاں
تمام شام غریباں ہے دیکھئے کیا ہو

پہلو بونہاں

اس عنوان کے تحت آپ اپنا پسندیدہ
شعر شائع ہونے کیلئے بھیج سکتے ہیں



میں اکثر گنگناؤں ہوں

بے وقافتہ سے وفاؤں کا گلہ کچھ بھی نہیں
تھا معتد رہی برا، تیری خطا کچھ بھی نہیں
دعنا جمال (اسلام آباد)
اب تو اٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بالآخر
کس طرح کالے کوئی سیل دہرا انتظار
منہ مقبیلہ سپاؤنگ
منزل کی جستجو میں، منسلک کی آزمائش
کچھ پالیا ہے میں نے کچھ کودیا ہے میدانے
سنیلا عاشق (ملتان)
اب ہم میں تیرے کی رہ ہمت نہیں پائی
ہم درد کے شعلوں میں ہی جل جائیں گے آہستہ
رشید مارا ہم گمانی گریں ہلاکت
اپنی ہی ذات میں تیری سے کھنڈ ملے ہیں
اپنی ہی ذات میں اک کوہِ نادر تہا ہے
حوت مدنی (راولپنڈ)
میں خود پہل کر دوں کہ ادھر سے ہوا ابتدا
برسوں گزر گئے ہیں کبھی سوچتے ہوئے
سابعہ حبیب (والٹر جھڈ سنگھ)
یادو ہوگی وہ اپنی بے رخی
اب مری تصویر دیکھا کیجئے!
شہناز نعت (جہلم)
کسی کو وحدتِ دیو حرم کا پاس نہیں
خدا پرست ہے دنیا خدا شناس نہیں
فرمانہ ناز (کراچی)

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رد و رکوتے
ہم اور بلبلِ مینا گپ گفت گو کرتے
فرخ میور (دہلی، ہندوستان)
تمام لوگ ہی کہتے ہیں دور کیوں مجھ سے
خواب نصیب ہی، مگر خزاں تو نہیں
فرمانہ ناز (کراچی)
بلا نہ دل کا قدر دان کوئی نہانے میں
یہ شیش ٹوٹ گیا دیکھنے دکھانے میں
نہیم احمد (کراچی)
خوشی کی چھاؤں میں مینا تو خیر آساں ہے
منوں کی دھوپ میں جینے کا اہتمام کرو
طاہر زریں (لاہور)
فرصت ہو تو اپنا گریباں بھی دیکھ لے
اے دوست یوں نہ کیل مری کی کیشا
فرحت دتتا (اسرائیل، ہندوستان)
دل لٹکے ہم یہ سمجھ زندگی کیا چیز ہے
کس کو کہتے ہیں محبت اور وفا کیا چیز ہے
نازیہ شہزاد (لاہور)
کوئی مدد سے تو یہ بے دردی سا سکرانہ ہے
منائے کس کو اپنے آئینوں کی داستان کوئی
خالد چوہی (درہنہ، پاکستان)
قیس ہی مجھ کو عزت ہے مہیاں جی ہاں تو تارک
مجھے آئین میں نہ پلویں دریا ہوں بہا کر
رضیانا (سرگودھا)

شاز یہ صدیقی (لاہور): (پہلا انعام)
س: کون کب فرصت ہوتا ہے؟
ج: جب شہنائیاں بجاتی ہیں!
رعنا اعجاز - لاہور: (دوسرا انعام)
س: دنیائیں بے وقوف کتنے ہیں؟
ج: افسوس! ہمیں شہرِ دل کی بیچ تلو کا اندازہ نہیں ہے
عابدہ ثروت - کراچی: (تیسرا انعام)
س: سچے دوست کی پہچان کیا ہے؟
ج: سچے دوست؟؟۔۔۔ بل بل کیس بازار میں لٹے ہیں؟
شاہین قادر - کراچی:
س: محبت کو توڑا کیوں سمجھا جاتا ہے؟
ج: سرب کو اور کیا سمجھیں گے؟
یاسمین خاں - لاہور:
س: انسان خوشی کرنی کب سوچتا ہے؟
ج: جب کوئی نیکی کرتا ہے۔
فرخ میور - دہلی (ہندوستان):
س: کیا انسان کو اپنی تعریف خود کرنی چاہئے؟
ج: مرد کو اسی اصل پر بل پڑا ہے بل!، لیکن آپ نیچے
کر بڑا فضل ہے۔
منجیل قریشی - کراچی:
س: آج کل جس سے بھلائی کی بات وہ دشمن کیوں بن جاتا ہے؟
ج: اسے جواب میں شہر کا ہی ہے:
اپنی آمد رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے
دلوں میں کفر رکھتے ہیں بغاوتِ دوستانہ
سلمہ حبیب - کراچی:
س: اچھوٹ کوڑا کہا جاتا ہے کیوں نہ بڑائی کو اپنا لیا جائے؟
ج: بڑائی کو اپنا لے وقت میں مطلق ضرور کر دیں۔
ناظمہ بی بی - لاہور:
س: آپ کو کون سی خاتون پسند ہیں؟
ج: جو جتنی سے گیارہ فٹ دور رہیں۔ دیے ہیں ناظمہ خلیفہ
بہت پسند نہیں۔



ایک منہ کا غذا پوسٹ کارڈ پر یاد سے لیا دو دو
سوال بھیجے جس کا غذا کارڈ پر سوال لکھے اس کے
بچے جو ایک لے بچہ چھوٹے اور اس کا غذا کارڈ پر لکھے
ہر ماہ کے سوالات میں سے تین منتخب آؤں، دو نم آؤں
سوم سوالوں پر ایک سال، چھ مہینے اور تین مہینے کے
لے پاکیزہ انعام کے طور پر بجا جائے گا۔
اس سلسلے کا مقصد خالص پاکیزہ بہنوں کی دلچسپی ہے
ان کے کسی کی دلزاری مستور نہیں۔

اپنے سوالات اس پتے پر بھیجئے
پاکیزہ • پتہ: جی ۱۲، کراچی

نفسیات ازدواجی مشکلات

نفسیات ازدواجی

میں کہیں سے اپنے جانا اور جانی سے منسوب ہوں۔ عمر کے ساتھ محبت بھی پروان چڑھتی رہی اور جب ہماری بچہ بچہ کے چلنے کا وقت آیا تو خاندانی مسئلے کے حل کے لیے ایک طویل سلسلہ کل ٹرا اور ہم ان جھگڑوں کی بحیثیت چڑھ گئے۔ اوتو نے یہی شادی دوبہری جگہ کر دی۔ اتنی ہی مدت میں زندگی میں با ش۔ کچھ کہہ سکتے ہیں حال شادی ہوئی لیکن اس زندگی میں شادی ہو رہا ہے۔ میں کچھ عرصہ سرال میں رہی لیکن ان لوگوں نے مجھے نکال دیا۔ میں پھر والدین کے در پر گئی۔ اور ایک عرصہ حالات سے اچھے اچھے گزارنا میں کوئی کرتی ہوں لیکن اب تنہا رہنا مشکل ہے۔ میرے سامنے دو رشتے ہیں۔ ایک تو اسی سابقہ منگیت کا۔ دوسرا ایک اور آدمی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کیا منگیت اس عرصے میں اپنی شادی ان کیلئے اور ہر جی کو کو جو عرصہ کے بعد طلاق نے یہ بتلے۔ شراب کا عادی بن گیا۔ جانا نہ چھوڑی۔ کہیں تعلق لگزی نہیں کرتا۔ اور کبھی کبھی عاداتیں اپنا لگتی ہیں۔ اب یہ بھی اپنی محبت کا واسطہ دیتا اور کہتا ہے کہ میں تمام برائیوں کو چھوڑ دوں گا۔ میری ہر شرط ماننے کو تیار ہے۔ اب آپ تیار ہیں کہ میں کیا کروں۔ ایک طرف بچپن کی محبت اور دوسری طرف اس کی ماؤں۔ خدا کے لئے مجھے راستہ دکھائیں۔

نورین ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کا سنگیہ آپ سے واقعی سچی محبت رکھتا ہے۔ جس سے تو آپ کے بعد اس نے سکون اور محبت کی تلاش میں پانچ شادیاں کیں اور ملن نہ چکر رہے ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فعل عورت کے اشتقاق کو یہ سمجھ کر بھی ہمارا مشورہ ہے کہ دوسرے بہتر شوق کی بجائے آپ کی کا دامن تمام میں جکڑ دے آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہے۔ شراب نوشی اور دوسرے شوقیہ اعمال سے غم سے فراق کے لئے

باجی۔ میرا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ لہذا جلدی سے اس کا جواب بخندگی سے دے دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے میں ایک لڑکا رہتا ہے۔ اس کو لے جاتے رہتے ہیں۔ سلام کرتا اور جاتا رہتا۔ اس کی شرافت پر میں بھی ڈول گئی اور جب اس نے خط لکھا تو میں نے بھی محبت بھرا جواب دے دیا۔ پھر سلسلہ تواتر کئی سال تک چلتا رہا۔ اس عرصے میں میں دو تین مرتباً اس سے تنہائی میں بیٹھی شادی جلدی اس لئے ممکن نہیں تھی کہ ایک تو ہمارے حالات میں رہتے تھے دوسرے وہ بھی پردہ کا تھا۔ غیر محبت خط و کتابت کے ذریعہ پڑاں چڑھتی رہی۔ ایک دن میں اس نے تنہائی میں بیٹھی تو باجی اس نے ایک انتہائی ذلیل حرکت کرنی چاہی۔ اور عزت مجھے بڑے پیاری ہے لہذا میں اس سے جھگڑا کر کے چلی آئی۔ اس کے بعد میں نے تقویٰ کے خطوں کے جواب دینے اور نہ ہی کبھی ملنے کی بھی رشتے میں نظر آتا تو راستہ کاٹتی تھی۔ اس پر اب اس نے مجھے خط لکھا ہے کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے میں کچھ کا کے

رانی عروسہ۔ کراچی: س، بنیادیں ہے زیادہ خطرناک چیز کیا ہے؟ ج، مرد کا اعتماد جو عورت کو حاصل ہو۔

شعیبہ شمیم۔ کراچی: س، تین سکون کی دولت حاصل کر سکیا آسان طریقہ کیا ہے؟ ج، شادی مت کیجئے اور لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھریں۔

خالدہ عزیز۔ راولپنڈی: س، کیا عورت واقعی ناقص عقل ہوتی ہے؟ ج، جی ہاں۔ جب ہی تو مردوں سے شادی کر لیتی ہے۔

راشدہ۔ کراچی: س، ممکن سکون کی تلاش؟ ج، آگے چلنے والے سائے کے تعاقب کے برابر ہے۔

منیر ساجدہ سلطان۔ انور کراچی: س، میرا بچہ پانچ سال کا ہے؟ ج، جب میرا بچہ پانچ سال کا ہے تو میرے بچہ پانچ سال کا ہے۔

سلطانہ زیب۔ کراچی: س، امیروں کے پاس وہ مندوں کیوں نہیں ہوتا؟ ج، اس لئے کہ وہ خدا نہیں ہوتے کہ ہر کس و ناس کی حاجت رواں کر سکیں۔

شعیبہ شمیم۔ کراچی: س، عورت کو مرد کا بک لٹی ہے؟ ج، تخلیق انسانی کے بعد اور یہی چیز ان کے روال باعث بھی ہے!

حمیرا فردوس۔ ناظم آباد: س، آج کل طلاق کی بیکاری عام کیوں ہے؟ ج، اس لئے کہ اگر ہماریا ریلوں کا ملاح دیانت ہو گیا۔ اما طلاق کے۔

شانہ زہیر۔ کوئٹہ: س، عورت کو غصہ کب آتا ہے؟ ج، جب اس کے شوہر کی جیب سے کبھی جنس عورت کی آمد برآمد ہوتی ہے۔

نازہ۔ لاہور: س، بڑی کا اہلین فرض؟ ج، شوہر کی دوستوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا۔

شروت نیازی۔ ملتان: س، مرد کی سب سے بڑی خالی کیا ہے؟ ج، وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔

فریدہ حق۔ سرگودھا: س، شادی کے وقت دہن کو لال کر کے یوں پہنا جاتے ہیں؟ ج، تاکہ اسے احساس ہو جائے کہ اسے زندگی بھر شریخ خون اگلنا ہے اور شعلوں میں جلتا ہے۔

نازیہ کاشف۔ لاہور: س، عورت کو شوہر کی عمر کیوں لگتی ہے؟ ج، یہ ایک راز ہے جو بیک وقت کلینک والوں کے سینے میں دفن ہے۔

رخسانہ امیر۔ بھاولپور: س، کیا کوئی ایسی چوٹ ہے جسے طاقتور بھی نہ سہے؟ ج، جی ہاں۔ ایک مرتبہ ایک عورت نے شوہر کے بازو سونپی اس نے دیکھا کہ اس کی نگاہ کی بازی کی زندگی میں سب سے زیادہ چوٹ اس نے کھائی؟ اس نے جواب دیا۔

سلطانہ شمیم۔ کراچی: س، ستائش کی تعریف کریں۔ ج، زیبا۔ شعیبہ۔ رانی۔ اور دیا کے علاوہ اور کس چیز کی تعریف کریں؟

صفیہ زیب۔ ناظم آباد: س، کیا دنیا کی ہر عورت مفلسی اور غربت سے تنگ ہے؟ ج، جی ہاں۔ کارل مارکس کہتے ہیں کہ مفلسی اور غربت کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں کہ ایک مرتبہ اپنے شوہر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا اچھا ہو گا کہ اس کے سرمائے پر ان کا کچھ گھنے کے بجائے کچھ سرمائے چاہیے۔

روبینہ بدر۔ کراچی: س، اگر زندگی بوجھ بن جائے تو...؟ ج، اس کا بوجھ اٹھانے کا نہ ہے پر رکھنے یا ہلوں کے

وقت تمام خط دکھا دوں گا۔ باجی خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں میری شادی میں صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے کبھی سوچی ہوں اچھی کو سب بتا دوں۔ کبھی سوچی ہوں شادی سے انکار کر دوں۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا آپ ہی کوئی راہ دکھادیں۔
ناظمہ انجم۔ لاہور

حلہ ناظمہ! اس کے سوا کیا کہیں کہ آپ کی حالتوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے خط لکھے ہی کیوں؟ یہ مرض ہمارے یہاں کی ہر لڑکی کو ہے۔ اس کے بعد ایسے نازک موقعوں پر کھپتی ہیں لیکن مانتی پھر بھی نہیں۔ ایسے واقعات سے دوسری لڑکیاں بھی نہیں سیکھتیں۔ اور میری بہن! مرد عجیب فطرت کے ہوتے ہیں۔ تفریق ہر لڑکی سے کریں گے لیکن شادی ایسی لڑکی سے جس کا چہرہ دوسروں نے بھی نہ دیکھا ہو حقیقتاً یہ چیز آپ کے ہونے والے شوہر کے ساتھ بھی ہوگی۔ لہذا اب بہت صورت یہی ہے کہ آپ اچھی کے سامنے اعتراض جہم کر لیں۔ شاید وہ اس لئے کہ مجھ کا خط حاصل

میں عرصہ دراز سے ایک بھائی کی محنت کی سلاشی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ایسا بھائی مل جائے جو میرے دکھ درد کا دوا کر سکے۔ اور میری دلی مسئلہ مراد عرصہ کے بعد پوری ہوئی۔ ایک باغیت اور سیاحانی مجھے مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی میرا بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔ میرا ہر طرح احترام کرتا ہے۔ میرا حکم ماننا ہے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ میں شادی شدہ اور درجنوں کی ماں ہوں۔ میرے خاندان سے میری بھائی کے شتے پر غم خستے کا اظہار کرتے ہیں اور شاید شک و شبہ کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں اور ہم پر دیکھ کر بھی کہتے ہیں جس سے گھٹن بخشی پیدا ہو رہی ہے۔ ویسے میں انہیں ہر طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ آپ، شوہر ہیں اور وہ بھائی ہے۔ لیکن وہ کچھ بھی ناخوش رہتے ہیں جس سے مجھے اور میرے بھائی کو بڑی الجھن ہے۔ کوئی ایسا عمل بتائیں جس سے میرے دونوں شتے قائم رہیں۔ میں بھائی کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی اور نہ شوہر کو دگانی کی دلدل میں پھنسا کر اپنی ازدواجی زندگی کی سترچیں ٹکڑا چاہتی ہوں۔
خالہہ لطیفہ کبھی۔ روہڑی

حلہ خالہہ! آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک ازدواجی زندگی کا دوسرا بھائی کی محنت کا۔ میری بہن! مر کھال میں اگر ایک مرد پر شک پیدا ہو جائے تو اسے ختم کرنا بچاؤ کی نازک اور بے غلوص صورت ہے میں نہیں۔ مرد جس بات کو اپنی آن کا سوال بنا لیتے ہیں اس کو پورا کرنے کے لئے تمام اچھے بھتیجا استعمال کر دیتے ہیں۔ آپ کے شوہر کو آپ کے بھائی کا آنا جانا پسند نہیں۔ تو میری بہن! آپ اپنی ازدواجی زندگی کی بہاریں دیکھنا چاہتی ہیں جو آپ کے اور درجنوں کے مستقبل کے لئے ضروری ہے

میری عمر اس وقت پندرہ سال ہے۔ میری الجھن یہ ہے کہ میں تنہائی پر غور ہوں۔ اس سے میری قسمت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ دوسرے کہ میں مسئلہ کسی کے سامنے نہ بولتے ہوئے بہت جلد بڑوں بوجالی ہوں۔ میں بنی اچھی طرح یاد رکھتی ہوں لیکن جس مسئلے کو کہتی ہیں ا میری زبان پر تالے لگ جاتے ہیں۔ میں اپنے احساس کتری پر کیسے قابو پاؤں۔
غزالہ غزل۔ قید نازی خان

حلہ بی بی! آپ نے نہیں لکھا کہ آپ گھر میں اکلی ہیں اور دوسرے بہن بھائی بھی ہیں۔ اکثر تنہائی پسندی کا شکار وہ لڑکیاں

باتیں کرتی رہا کریں۔ مجھے بہن دوچار میلیاں بنائیں جس سے فالتو وقت میں ملا کریں اور انتہائی بے تکلفی سے۔ میری بہن! اچھا اخلاق دشمن نہ کہ جو کچھ کہتا ہے پھر بیان تو سنا صرف آپ کی تنہائی تم ہونے کا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کوریوں پر نظر ڈالتی ہیں جو بہت معمولی ہیں آپ ان کو آپ بہت زیادہ محسوس کرتی ہیں اور کسی سے ملتے یا بات کرتے وقت وہ گھبراہٹ آپ پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ بات دل سے نکال دیں۔ شریں گفتاری اور لچھے اخلاق کو اپنا کر محاسن دوستوں

سے مل کر رہیں۔ رہی بات کہ آپ کو تنہائی یاد ہو جاتا ہے لیکن میں نے سنا سنا نے سے مجھوتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ آپ میں خود اعتمادی کی کمی ہے اور یہ بات تنہائی سے زیادہ پروان چڑھتی ہے۔ آپ اپنا حلقہ احباب سے منقطع کریں۔ نہیں بولیں۔ پھر دیکھیں کہ آپ کے دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کوئی رسالہ یا ناول زور زور سے پڑھا کریں اس سے بھی کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔



آپ کا ہاتھ کیا بتاتا ہے؟

اس سے صحت

عصمت آراء۔ اسلام آباد

صاف ستھرے پرنٹ پہنچنے پر مبارک بادیں آپ کا پہلا سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب صرف آپ کے شوہر کے پرنٹ کو دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں آپ کو کچھ پریشان ہونے کی حاجت نہیں کیونکہ آپ کے ہاتھ میں ایسی کوئی الجھن نظر نہیں آتی۔ مطمئن رہیے آئندہ زندگی کسی بھی طرح ماضی سے کم تر درجہ کی نہیں۔

ش۔ یہ۔ لاہور

سب سے پہلے تو آپ اپنا اچھا پرنٹ دیکھیں پھر مبارک بادیں آپ کے حالات پر غور کر دیکھو لیکن اللہ پر کچھ دوسرے دیکھیں۔ اس کے امکانات کم ہیں کہ آپ کو اکثرین سیکس لیکن انشا اللہ آپ خوشحال زندگی ضرور بسر کریں گی۔ آپ کی زندگی کا بہترین دور ۲۹ ویں سال سے شروع ہوگا۔ آپ کی شادی کے

امکانات کو باطل نظر انداز تو نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ کوئی قطعی بات کہنی مشکل ہے کیونکہ کمپرس اس جگہ ذرا غیر یقینی ہیں آپ اپنا علاج جاری رکھیں۔ آپ کی صحت ۳۰ ویں سال سے بہتر ہو جانے کے امکانات موجود ہیں۔

زیڈ۔ ایس۔

فاتون۔ آپ کی شادی آئندہ پانچ سالوں کے درمیان ممکن ہے۔ قیمتی سے دست نشانی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں جس سے ہونے والے دولہا کا نام بتایا جاسکے۔ درجہ ضرورتاً۔

آپ کی آئندہ زندگی کا بہت اچھا نہیں تو کچھ خراب بھی نہیں نظر آتی۔ مالی حالات عمر کے ۳۰ ویں سال سے قدرے بہتر ہونے کے امکان ہیں۔ ۲۵ سال سے ۲۸ سال کے درمیان کچھ مالی مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے دائمی فیصلوں میں صاحب نہیں ہیں۔ اور یہ ذہنی فیصلہ اچھوتوں کا باعث بن سکتی ہے۔

نازو۔ لاہور

بی بی! آپ کے بھیجے ہوئے پرنٹ بہت خراب ہیں لڑکیوں کا کچھ بتا نہیں چلتا۔ آپ نے اگر تھوڑی سی محنت اور کی ہو تو بہتر تھا۔ بہر حال جو کچھ نظر آ سکا اس کے مطابق جواب حاضر ہے۔

۱۔ آپ ایک انتہائی جذباتی لڑکی کہی جاسکتی ہے۔ صنف مخالف کا آپ پر گہرا اثر ہوتا ہے لیکن آپ میں جو حد سے غمی ہوئی خود بخود ختم ہو جاتا ہے اس سے باعث آپ کی شادی کی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ آپ ان دونوں عناصر پر کچھ قابو حاصل کریں چونکہ کمپرس پرنٹ میں بہت غیر واضح ہیں لہذا اس ضمن میں کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔ آپ ایک آزاد رو آزاد خیال خود اعتماد اور دلکش مزاج شخصیت کی مالک ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ بے حدود و سی ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

اور وہ

حکایت

آصف ضریحی

بن گئی

کے شہزادہ کی چونتیس سالہ بیٹی نے جہاں
لکشاؤں کا ہری شکل صورت سے ملتی تھی انہوں
میں کی ماہر ڈانڈاؤں کے ایک خط لکھا کہ آپ کے
بناؤ سے آرائش و زیبائش کا ہر ایک سیکڑ میں رنگ کے
علاوہ حسد کے جذبات بے انتہا بڑھ گئے ہیں اس کی وجہ سے کہیں ایک آہٹ
معمولی شکل کی صورت ہوں میرے تین بچے ہیں اور میں جزوقتی ملازمت بھی
کرتی ہوں میں آرائش میں پرزیا دو بیسے صرف کر کے اپنے آپ کو حسین خواتین
میں شمار نہیں کر سکتی لہذا میری خواہش ہے کہ میں آپ کی بات پر عمل کرنے کے
اپنے حق کو نکھاروں۔ آپ میری کس حد تک مدد کر سکتی ہیں؟
میگی کا یہ خط ڈانڈاؤں کے لئے کھلا جانے لگا تھا انہوں نے اس
چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے آرائش میں کا ایسا کورس ترتیب دیا جو نہ صرف کم
وقت بلکہ کم خرچ بھی تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میگی کے بیشتر
مناظر قدرت سے طاقت مند ہو کر اپنی ظاہری شان و شوکت کو بچانے پر مجبور تھیں۔
اس کورس کو مکمل کرنے میں صرف دو دن لگے اور یہ بعض تین سو روپے لپے آیا۔
یہی اس کورس کے اختتام پر شاہنشاہ بٹالشا بھی آکر دیکھتی تھی کہ آئندہ بیسہ سال
ہیں ایک تیرہ میں اس کورس پر عمل کرو گی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے لئے اسے
کہا کہ اپنا اس کی تفصیل بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ موجودہ دور میں بناؤ نکھار اور میک اپ کتنا سا دلچسپ ہو چکا ہے۔
ڈانڈاؤں کے یہ بات کے مطابق میگی بدترین یوشی بیٹی
اور کینٹھن ہائی اسٹریٹ واقع ویسٹ سائڈ سٹیٹ کلبس رجسٹر کیا یہاں
جہاں تک کی ماہر ڈانڈاؤں نے میگی کو بتایا کہ اپنے جسم کو مناسب کرنے کے لئے

عقبی ورزش کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اقبال بہت ضروری ہے کیونکہ ابتدا
میں اقبال بڑھ کر رکھنا ہی بہتر طریقہ ہے۔ جب کوئی ورزش کا مادی ہو جائے
اور تواتر ورزش سے اس کے ہڈی سخت ہو جائیں تو اسے چاہئے کہ ورزش بھی اسی
تناسب سے بڑھاتا جائے۔
پاکستانی خواتین اگر اس ورزش پر عمل کرنا چاہیں تو اس کی تفصیل
یوں ہے کہ۔ فرسٹ پریٹھ جائیں اور ٹانگوں کو اپنے سامنے پھیلائیں اور
مکڑھتا مکھن ہو سکے سیدھا کہیں۔ اب دائیں ہاتھ کو اگے نکالیں اور اپنے
سامنے دائیں سے بائیں مکھن جھک چکریں۔ اس عمل کی وجہ سے آپ کا جسم
بھی حرکت کرے گا لیکن خوش کیجئے کہ آپ کی دائیں ساکت رہیں۔ ایک لمبے
توقف کیجئے اور پھر بائیں عمل کو بائیں ہاتھ سے دہرائیے۔ نصف گھنٹہ تک یہ
عمل کرنے کے بعد نیم گرم پانی سے غسل کریں۔ اس عمل کے فوراً بعد پانی
کی بوتل پر کھڑی ہو جائیں اور کچھ گھنٹوں کے بعد پانی سے لیا جائے۔ میگی نے اس عمل
کے متعلق کہا ہے کہ پہلے تو میں کمر ہانی کے مسئلے سے ڈرتی لیکن کچھ دن بعد
مجھے عجب راحت محسوس ہونے لگی۔ غسل کے بعد میں نے عجب راحت اور
تازگی محسوس کی۔
اس کے بعد میگی لندن کے علاقے ساؤتھ ویسٹ سٹریٹ چھائی
گئی یہاں اس نے جلد کی ماہر خصوصی کینٹھن کا ریسٹ سے شروع کر رکھا تھا لیکن
نے میگی کی جلد کا سنا سنا اس خاص شیشے کی ادھر سے کیا جو دنیا کو اصل شکل سے
کئی گنا بڑھا کر دکھاتا ہے۔ میگی نے کہا کہ میں نے آج تک جلد کی کوئی نہایت
محسوس نہیں کی لیکن اب اس طرح میں اگر محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اپنی جلد
کی حفاظت ضرورت سے کرنی چاہئے کیا اس کے لئے مجھے کوئی خاص کریم

استعمال کرنی چاہئے۔ کارپسٹ نے جواب دیا کہ ہائیڈرولک کیموٹاٹ اور
سے بہت اچھی ہے جہاں سے رخساروں کے لئے بہت سی کیموٹاٹ ہے۔ ایک ہاں اور
بالائی حصہ کیموٹاٹ مائل ہے نہیں اس کی، ایک ہاں کیموٹاٹ کی ہائیڈرولک
ضرورت نہیں ہے کہ صرف اس کو صاف کرنا ہوگا۔ ایک ہاں کیموٹاٹ کی
تخلیہ کیجئے جسے کے لئے اور ایک کیموٹاٹ کے لئے نہایت بہتر ہے۔
اس کے علاوہ اور کئی چیزیں ضرورت نہیں کیونکہ ہماری جلد خود بخود بہت
کے مطابق چمکا ہٹ پیدا کرتی ہے۔ اس پر بھی نے دریافت کیا کہ میسی
منہ کے کونوں کی جلد چمکتا جاتی ہے۔ اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔
کارپسٹ نے جواب دیا۔ COCA BUTTER یہ یہ تکلیف
دور کر دیتی ہے۔ یہ آپ اس کی خوب کی طرح ٹریب میں ہتی ہے اور تم
اسے آپ اس کے تیل اپنے ہاتھوں پر لگا سکتی ہو۔ اور یوں پاکستانی
بھی عام ہتی ہے اور نہ شکایت جسم میں وقت میں ڈی کی کی سے پیدا ہوتی ہے
لہذا تم کو زیادہ مٹی وٹامن کی ایک گولی استعمال کیا کرو۔ اس کے علاوہ جلد
کو صاف رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہمارے گرم پانی میں آدھا لیٹر جوڑ کر
پی لیا جائے۔ سبزیوں کا استعمال کثرت سے کیا جائے۔ سبزی بندے روپاٹے
وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کسی طرح اس کے وٹامن ضائع نہ
ہو سکیں۔ سنگت سے کچھ کثرت استعمال کیا جائے اور پوری طرح سویا جائے
یعنی گرمی اور بھی چندی جائے۔
دوسرے دن صبح نو بجے میگی ریسٹ اسٹریٹ کے شول ٹنٹ نمبر
گئی جہاں اسے پاؤں کی دیکھ بھال کے لئے سس شول سے ملنا تھا میگی
کے پاؤں کی جلد سخت اور کھردھری تھی جس کو میگی کے زیرِ تیمم کیا
گیا۔ چند منٹ کے لئے میگی کے پاؤں صاف میں رکھے گئے جس کی وجہ سے
نما مسامات کھل گئے اور پھر پاؤں کی خاص کریم میں میں جذب کی گئی پھر
پاؤں پر ہلکا سا مساج کیا گیا اور کافی دو رنگ چھنے کو کہا۔ میگی کچھ دن
نرم نرم گھاسا رہتی اور کچھ ریسٹ کر کے پھر۔ اور پاؤں کا کھردھرا پن دور ہوتا
گیا۔ آج شول ٹنٹ نو بجے اسٹریٹ پہنچی جہاں اینڈری براؤن میں اسے مسٹر
ایڈورڈ سے ملنا تھا کہ وہ اپنے بالوں کو سٹول سے مسٹر ایڈورڈ سے معمولی
تاریخ خارش کے بعد اس کے بال سیٹ کر دئے اور شول دیا کہ بالوں کو ڈانڈاؤں کے
پانی سے دھوئے پھر سے دھوئے کھان میں بالوں پر استعمال کرنا ضروری ہے
اگر ایک شیمو استعمال کیا جائے تو بالوں کی چمک جڑ لڑتی ہے لیکن شیمو
پھٹنے میں صرف ایک تیرہ کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شیمو ڈاسا
ہاتھ میں لیکر گیلے بالوں میں ملیں اور سخت ہاتھوں سے اس میں بھاگ
پیدا کریں۔ سر دھو لیں اور دوبارہ پانی میں عمل کریں گیلے بالوں میں برش کریں

اور کھلا چھوڑیں۔ آدھے گھنٹے بعد صبح چائیں بنائیں۔
بالوں کی سینگ کے دوران ستر لے لیگی کے ہاتھوں
ہاتھوں پر کڑی اور کھار معروت میں بھی مولی تو ستر لے لیگی کے ہاتھوں کو
خوبصورت رکھ سکتی ہیں اس کے لئے ہاتھوں کی کریم ضروری ہے۔ باورچی خانے
میں واش بین کے قریب ہمیشہ ہاتھوں کی کریم موجود رہنی چاہئے تاکہ گھر کے
کا آگاہ سے خارج ہونے کی کریم کو ہاتھوں پر ملا جائے۔ ستر لے لیگی
کے ہاتھوں پر ہوتی کے رنگ کی پین پالش کر دی۔ اب میگی کے صرف چہرے
کا ایک اپرہ کیا تھا لہذا وہ ہاں سے شکر کراس کر کے میس کیٹر ملین
پینچی بناؤ گھاسا کر ماہر مارگریٹ نے میگی نے کہا کہ میری سینگ کی طرح
بڑی نظر آ سکتی ہیں۔ مس مارگریٹ نے میگی کا پھر وٹامن کیا پھنویں کو
ایک کر کے خواب کی شکل میں خم دیا اس کے لئے اس نے آئی بیسیٹ کا استعمال
بھی کیا اور کھار کھنویں کی بڑی سے نکھو کھان طرح در کیا جاسکتا ہے۔
اور اس سے جو کچھ میگی اس پر مناسب آئی شیدو کے ذریعے پھر دیا جائے
ہے کہ آکھیں بڑی نظر آئیں۔ دن میں ہزاروں شام میں سفید آئی شیدو
استعمال کیا جاسکتا ہے بصورت اگر اس کے دوسرے ہلکے رنگ بھی چہرے
کی رنگت کی مناسبت سے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔
اس کے بعد ایک آگیت نے ہادی رنگ کی فائوڈریشن کریم
لگائی کیونکہ میگی کی جلد کا رنگ زردی مائل تھا۔ اس کے بعد ہلکے رنگ
کارڈر وورنہ لگایا۔ ہاتھوں کے گرد سفید ہوتی کے رنگ کا شیدو استعمال کیا
اور ہادی رنگ کے گہرے شیدو کی سپلنگ لگائی جس میں فائوڈریشن کی سی
چمک بھی تھی۔ اور میگی نے پوری ہلکے کا سٹوڈرین کیا جس وقت
وہ میز پر لکھی تو ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑی وہ ایک دوسرے سے پوچھ
رہے تھے کہ یہ ملکہ من کون ہے۔
صبح تو یہ ہے کہ جیڈیزین اشیا جن نہ صرف شول کو دیا
کرتی ہیں بلکہ خوراک کم عمر بھی نظر آتی ہے اور قدرتی کھانا لگا جاتا ہے
آرائش شول کے لئے بہتوں کو شول سے اور سوالوں کے جواب
دینے کے لئے ایک ماہر آرائش شول کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ یہیں
اپنے دو سوالات بھیج سکتی ہیں۔
آرائش شول سے تعلق سوالوں کے جوابات

رفتہ سلطاط کلاپی

میری آنکھوں میں طغیانی کیا وہ دور کتنے ہیں؟

ج: بی بی! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ ٹھنک باریک کو دیکھ کر
جانتے سے آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جاتے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کی سائنس
ترکیب یہ ہے کہ کیسے کو کچھیں کر اس کا عرق نکال لیں ایک چائے کا
چمچ کیسے کے عرق میں ایک چمچ پیچ بستر بانی ملا لیں۔ پانی برف کا ذہن
بلکہ برف سے ٹھنڈا کیا گیا ہو اب روٹی کا بہت باریک ٹکڑا لیں ان
ٹکڑوں کو بستر بستر محلول میں بھگو کر دو دنوں آنکھوں پر رکھیں اور

لیٹ جائیں۔ پندرہ منٹ بعد بنائیں۔ صبح اور شام دو دنوں وقت
یہی عمل کریں مگر کیسے کا عرق روزانہ نکالیں صبح اور شام کے لئے
ایک ہی وقت محلول تیار کر سکتی ہیں لیکن استعمال کے وقت محلول
کو برف پر رکھ کر ٹھنڈا ضرور کریں۔ اس کے اندر برف نہ ڈالیں۔
جب تک آنکھوں کے حلقے دور نہ ہوں یہ عمل کرتی رہیں۔ رات کو
سوتے وقت حلقوں میں باڈام کا تیل لگائیں آدھے گھنٹے بعد
روٹی سے آہستہ سے صاف کریں۔ یہ عمل بھی روزانہ کریں۔



علم الاعداد کے ذریعے



پیش کشی کے نام

لے۔ ایس۔ حنیفی

زیب النساء

آپ کے بھائی کا نام انصاف احمد مناسب رہے گا۔
دیے اگر کسی بزرگ نے کچھ ہدایت کر رکھی ہے تو میرا خیال ہے
اُسے نظر انداز کرنا دانشمندی نہیں ہے

مردی

محترم آپ کے بچے کا نام "عابد نبی" معقول ہے۔
ابنہ نظر کی نگاہ فرمادیں تو بہتر ہوگا۔ یعنی پورا نام عابد اطہر ہے، "بہتر علیہ"
رکھا جاسکتا ہے۔

جیلہ خاتون

میرے خیال میں آپ کی بچی کیلئے "عقیلہ" ایک مناسب
نام ہے۔

کلثوم انور

چونکہ آپ نے تین ناموں ہی میں سے انتخاب کی شرط
لگا دی ہے۔ لہذا میں ان میں مناسب ترین بہن کی انور کو جیسا بیٹا
دیتے مجھے شاید ہی نہ۔ "نظارا" بات لیکن چونکہ یہ لوگوں کو جو
ہو گیا ہے۔ لہذا بدل ہی ڈالیں۔ ورنہ شاید بھی برا نام نہ تھا۔

زادہ سلیم
آپ کی بچی کا نام ساجدہ مناسب رہے گا



بچوں کے نام رکھنا بھی ایک فن ہے۔

بہت کم لوگ اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ
بچے کا نام، بچے کے مستقبل پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔
سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اس مسئلے میں ذرا سی احتیاط برتی جائے
تو بچے کی آمدہ زندگی میں بہت آسنے والی بہت سی دشواریاں
کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر ہم بائبل و ہندو کے یہ ایک
مسئلہ شروع کر رہے ہیں۔ اپنے نوجوانوں کو بچے کے نام کی مسئلہ
میں باہر ظاہر اعداد سے مشورہ دیکھیے۔ اس مسئلے میں مذہب اور
گواہت سے آگاہ کریں مناسب نام جو دیو دیا جائے گا۔
۱۔ بچے کی تاریخ پیدائش (معدود) ۲: ۱۰ پانچ ماہ پہلے



معجزہ

یہ واقعہ میری انی کے ساتھ پیش آیا اس لئے انہیں کی زبانی
میں لیں تو سب سے پہلے تقسیم کے فوراً بعد کا واقعہ ہے جبکہ مسلمان بڑوں
کی تعدادیں پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور اس حالت میں کہ یہ
تھے وہ نہایت دشوار گزار کوٹھن تھی کیونکہ جو لوگ ٹھکی کے ہستے قافلہ
کی صورت میں جا رہے تھے ان کو کھانے پینے کی کشتیاں تیار نہیں اور جو
لوگ ٹرینوں میں سفر کر رہے تھے بھائی پولیس میں سے نہایت ظالمانہ
اور جارحانہ سلوک کر رہی تھی مسافروں سے مار پیٹ کر ان کا سامان چھین رہی
تھی۔ ان دنوں کسی بھی مسلمان کو ذہنی سکون حاصل نہ تھا بلکہ اپنی وقت
نے بڑی جیسا تک صورت حال پیدا کر رکھی تھی اس معاملے میں کچھ دنیاوی
بزدل واقع ہوئی تھی۔ ہم بھی کون سے پاکستان جانے والی ٹرین پر سوار تھے
میں تاکا راستے والی ری اور خلافت قدس سے ہم کی جیکب طلب کرنا رہی
میسرے ساتھ میری بھینچتی ہیں "بھئی" دیور اور شرم کو بھی تھے یہ لوگ اپنے خوف
کو چھپاتے بدستور مجھے تسلیاں دے رہے تھے ہمارے پاس ٹکٹ میں ایک
بوڑھا مسکھ منہ بند ہے ان کے بالوں میں ہونے کا کینے سے ٹیک لگائے جیسا تھا
چہرے سے بڑا بڑا سلوم ہوتا تھا۔ مجھے کافی دیر سے دیکھتے ہوئے دیکھتا تھا
کینے لگا۔ بیٹی رو روکتی ہیں جو کہاں سے ساتھ ہوں پھر کون کھڑا ہے؟
مگر سیکرڈل و ناغہ برائے دشمنی دنوں کا خون بری طرح مسئلہ تھا۔
اس بوڑھے مسکھ نے پھر میری تسلیاں نہ دلائے کی کوشش کی کہ "بھئی" تم ڈرنا
کیوں ہے؟ میں جو کہاں سے ساتھ ہوں کھڑکیوں کرتا ہے؟ یہ سبائی لوگ تمہارا
کچھ نہیں لگا کر سکتا۔ اچانک ٹرین ایک جگہ سے رکی میں نے سوچا اب



اس عنوان کے تحت ایسے واقعات شائع ہوتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہوں

یہ بوڑھا کیا کر سکتا ہے؟ جو گھنٹہ بھر مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔ میری
چینیں بلند ہوئے گئیں۔ اسٹیشن پر اس قدر شور وغل تھا کہ اللہ ان کے ہر طرف
بچوں، بڑوں، عورتوں اور مردوں کی رائے چھین سنا کر دے رہی تھیں
اچانک ہمارے ساتھ والے کپڑے میں چند سیاہی انگلیں لئے داخل ہوئے
پھر چند برقع پوش خواتین اور دو مردوں کو بڑی طرح گھسیٹتے ہوئے ایک
طرف لے گئے اور ان کا سامان دو مسکریا ہوں کی طرف اچھال دیا میں نے
پلٹ کر دیکھا تو بوڑھا مسکھ نہایت مطمئن اور بے سکون ملازمین بیٹھا تھا۔
"اُن انسانیت نمری ہے اور اس بڑھے کو ذرا بھی شش نہیں ہوتی کتنا
بے رحم اور جاہل ہے یہ" میں نے دیکھ سے سوچا۔ اسی لمحے بھاری سیاہی پانی
رائے قلیں دروازے میں نکلتے دیکھ کر ہمارے گری لوگی میں لگے میں
اپنی پوری جان سے لڑا تھی سیاسی ہمارے سامان کی طرف بڑھے مگر
اُس بوڑھے نے نہیں اس لئے سے نہ گرد یا اور اپنی جیب سے ایک ٹکیٹ کا پڑ
نکال کر انہیں دکھایا۔ سیاہی ایک دم سیدھے گئے ایک دوسرا سیوٹ اس
بوڑھے مسکھ کو کیا اور انگلیں بھجلا کر ہر شکل گئے۔ ہم وہاں سے پڑ
اس شخص کو دیکھتے رہے جس نے ہماری جان و مال کی حفاظت سناستے
خلوس اور سکون سے کی کہ ہم شش پانچ میں پڑ گئے اس غیر مسلم مرد بزرگ
کا شکر کس صورت میں ادا کریں۔ اگلے اسٹیشن پر ہم نے اس بزرگ کے ساتھ
کھانا بھی کھا یا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھا؟ کیونکہ وہ اسی اسٹیشن پر
اتر گیا اور ہم اسے ایک خواب سمجھ کر بھلائے کی کوشش کرتے رہے مگر حقیقت
میں یہ ایک مجرور سے کم نہ تھا۔ سعید کاظم عثمان

یوم اطفال

بچے عید ایک گھنٹے سے دو گھنٹے میں کے لئے بیٹھنا
کے چہرے میں اچھی ہوتی تھیں آخر لڑکے کے ہر مدللے ہوا بچہ عید شہر
کی مشہور سڑکوں پر لڑائی مگر کھانے کی چیز کے ماحول اور ماحول
کاموں میں بڑھ چڑھ کر چند تین شہر کی تقریب میں ان کی شمولیت لازمی
سمجھائی تھی جو تین کی کوئی بھی محفل ہوا ان کے بغیر جیسکی تھی۔ اسی شام
خدا کی بنا پر ان کو تین کی مل گیا۔ ان کی کئی شام کا سرخین لڑا

گیا۔ بکریری ان جانے کے بعد تو ان کی سڑیاں سنیں بے باوا اضافہ ہو گیا۔ کبھی مینا بازار سے تو کبھی کسی اسکول کا افتتاح سے کبھی ورنی شو کبھی کوئی دینی محفل سے توجہ بھی ایک مقامی اسکول میں یوم اطفال منایا جا رہا تھا اور بیگم لطیف بہان شخصیت کی حیثیت سے مدعو تھیں۔ ایک ایک کرنے کے بعد بیگم لطیف نے ایک ناقدانہ نظر سے سراپا پردانی اور ایک ٹیچر کی کلرٹ ان کے ہونٹوں پر کھج گئی۔ ایک ہاتھ سے ساڑھی کا پلو تھامتی ہوئی اور دوسرے پرک کو تھامے ہوئے وہ اٹھیں۔ اچانک ان کی نظر ڈانٹنگ م کے دروازے پر پڑی تو کھلا ہوا تھا۔ زمین کا سات سالہ لڑکا شرف الداری کھلی رہا تھا۔ شرف الداری کو دیکھتے ہی گیم صاحبہ الگ الگ ہو گئیں۔ شرف الداری نہیں دیکھ چکا تھا اور اس کے مدد کو لالہ پر موت کی ہی زردی چھا گئی۔ وہ خوف سے تھوڑا سا رہا تھا۔ تمام ذلیل لوگ اجنبی ہمارا خیال کر رہے تھے آتے ہو اب ہمارا یہ جزا تو ہو گئی کہ تو چہرہ پا بھی کرتے گناہ بیگم صاحبہ جنہیں اور ساتھ ہی وہ دلچسپی سے جڑیئے شرف الداری کی یہ وہ ماں بیگم لطیف کے ہاں کھانا پکانے پر کو کھتی چار بجے اور خواہ وہ کوئی سال پہلے بھی کیونکہ بیگم لطیف لوگوں کی توجہ ہر جگہ کے حق میں نہیں تھیں چنانچہ مینے کے آخری دنوں میں زمین کے گھر پر لاکٹ ملتا۔ جسے بچے سمجھ رہے تھے۔ بھوکہ رداشت کرتے تھے۔ لیکن شرف الداری اپنی عقل کہاں آج ماں کا کام کرنے آتی تو وہ بھی ہند کر کے اگیا اور نظر ہجاکے ڈانٹ روم میں گھس گیا۔ بیگم لطیف کو دفتر تو آ رہا تھا لیکن دو چار چاٹوں ہی پر کھانا کی کینجکا نہیں لاتی رہی ہو گئی تھی۔ التیرہ مارشای حکم ضرور سنایا کہ آئندہ شرف الداری کے اندر قدم نہ رکھے۔ اس کا سے فارغ ہو کر وہ کاریں جا بیٹھیں اور کاریں شہر کی سڑی ہو گئیں پوچھنے لگی۔ پندرہ منٹ بعد کارڈز ملے مقصود پر کھڑی تھی۔ اسکول کا تمام اعلیٰ ان کی پذیرائی کے لئے گیٹ پر موجود تھا۔ بیگم صاحبہ گیٹ میں داخل ہوئیں تو ایک خوفناک تصویر دیکھنے میں بار ڈال دیا۔ فوراً فلیش لائٹ چمکی اور یہ لڑکا لڑکی کے کی آنکھیں محفوظ رکھ لیا۔ اسکول کے جینڈر کے ایک لکھنؤ میں چھوڑ دی اور بیگم صاحبہ رشتان کے جلوں خال خال شیشی کی طرف بڑھیں۔ جب وہ کرسی پر بیٹھیں تو پینڈل تالیوں سے گونج اٹھا۔ پرگرام شروع ہو گیا۔ پرگرام کے خاتمے پر پرنسپل نے تقریر کی جس میں بیگم صاحبہ کی شاندار خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا اور انہیں بیگم صاحبہ کی تشہیر کی درخواست کی گئی۔ بیگم لطیف تالیوں کی گونج میں اٹھیں اور تقریر کا آغاز کیا۔ آج کا دن دنیا میں یوم اطفال منایا جا رہا ہے۔ بچے ملک و ملت کا انتہائی قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور تمام لوگوں اس سڑی کے اہیت سے آگاہ ہیں لیکن انہیں اس کے ہرے ملک

میں بے شمار ایسے بچے ہیں جنہیں پرست بھر کر کھانا لگ کر نسیب نہیں ہوتا۔ بچوں کو علاج معالجہ کی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بجائے رینگولوں میں مائے اسے پھر رہے ہو ہیں۔ نہ معلوم ہماری غفلت سے کتنے بچوں جیسے بچے ہر جگہ جاتے ہیں۔ کتنے جہیز تیل بن کی پیش میں غفلت و ہوشی کو ذرا نظر سے لے کر ان بچے اب ہیں غفلت جہیز کو ان بچوں کو تباہی کے گرد سے لے کر گرنے سے بچا جائے کیونکہ یہی پاکستان کا آئندہ کریں گے۔ جس وقت بیگم لطیف یہ تقریر کر رہی تھیں ان کی ٹیبلٹ ان کو کبھی کے سروٹ کارڈ کی ایک ٹانگ ڈاڑھ کا ایک کونھری میں ایک کارڈ پر زور دیا کہ لڑکی ماں سے کھانا مانگ رہا تھا۔ فائزہ ضیائی سیالکوٹ

”ارے نہیں بھئی! مجھے اپنے بیٹے کی شادی ان لوگوں میں نہیں کرنی، نہ یہ کہ اتنی تو بیاں چڑھا کر غلام زمین سے کہا۔ یہ بچیلوں کی بات ہے جب ہم کہنے لگے آئے ہوئے چند برسوں کے شرف الداری لگا لگا۔ اب یہ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی یہ ترمز تو بچپن میں سال سے ہوتا تھا۔ ہاتھ کا پتلے لڑکی لہجہ کی جاتی تھی اور اس کے کورسے کے سے شے سے انکار کر دیا جاتا تھا۔ اس کی دیکھ کر ہمارے کاک تو کچھ نہ پایا لیکن جب سامنے والی لالہ کوٹھی کے کچ صاحبہ کے یہاں رشتہ کی بات پتی تو اس رشتے سے انکار نہیں ہوا تو ہم بھی پوچھنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کچ کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے طور پر تحقیقات کیں۔ جن سے پتہ چلا کہ کچ صاحبہ جہیز میں اپنی بیٹی کو ٹیبلٹ لڑکی پر کر رہی تھیں۔ ایک عدد ٹیبلٹ تھیں تو زبورات اور نہ جانے کیا کیا دے رہے ہیں۔ اب اس ذاتی طور پر دیکھ کر اتنی سے ملنے کے لئے گئی اور ان سے پوچھا۔ خال خال لڑکی کو دیکھا ہے آپ نے کبھی؟ یہ خال خال ہمارے اس سوال پر کھل اٹھیں اور بولیں: ”اے بیٹی ہوئی کسی تھی تم تو جانتی ہو کہ یہ لڑکی اب کیلے ہے۔ اب اس پر تمام ارمان نکالو گی؟“ ہمارے پوچھا کہ خال خال جانے یہ تباہی کر لڑکی کیسی ہے۔ خال خال جان سوج میں ہو گئیں پھر بولیں: ”میں نے چہرہ تو نہیں دیکھا ہاں اٹھوں پر نظر پڑ گئی تھی۔ میں جب آئے دیکھنے گئی تو ان لوگوں نے چہرہ نہیں دیکھا یا کتنا کتا کتا رہے ہاں دستور نہیں ہے ویسے اندازہ ہے کہ اچھی ہے۔“ میں چپ چاپ اپنے گھر چلی آئی۔ پھر وہ دن ہی آیا جب ہم کہیں کی شادی ہوئی تھی۔ تمام گھر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا جب جہاز اور دوسری چیزوں پر دیکھ کر اتنی کا تمام میسر ختم ہو گیا تو انہوں نے اودھار مانگ کر اپنے ارمان نکالے۔ عرفین جیسے سے شادی ہوئی۔ بیگم صاحبہ واقعی اپنی بیٹی کو بہت ساجیہ رہا

ہوسن

تھا کیونکہ وہ بھی اپنے ماں باپ کی اگلی بیٹی تھی اور انہوں نے بھی اپنے ارمان نکالے تھے اور اب میری کچھیں کیا تھا کہ ہم کہیں کی اتنی دیکھ کر رشتوں کو اس بدردی سے کیوں ٹھکراتی رہی ہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان تمام لوگوں میں جن کے رشتے ٹھکرائے گئے آنا جہیز دینے کی کست نہیں تھی اور بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کو ان سب سے زیادہ جہیز دینے کا چرچا کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے کی شادی کے بعد ہم کہیں کی اتنی نہ جانے کیوں خاموش رہنے لگی تھیں۔ کئی بار پوچھا لیکن مال نہیں۔ ایک دن صبح کو جب میں سو کر اٹھی تو ہم کہیں کے ہاں سے روتے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہم کہیں کی اتنی ہو گئیں۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں ان کے گھر کی تو پتی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میری آنکھیں سے نہ اٹھا کہ رات کو تو وہ ابھی بھلی تھیں یہ اچانک ہو گیا۔ لیکن جس کی جیسے اتنی ہے وہ دیے ہی جاتا ہے

تاثرات

راشدہ فائزہ دھولان مغز خواتین روزنامہ شرق کراچی، پاکیزہ کی یہ سب بڑی خوبی ہے کہ اس نے مجھے بتا کر دیا۔ مجھے بہت کم باتیں بتا کر تھیں۔ افسانہ سب کی بہترین تھے۔ خصوصاً انا آنجل شرف الداری کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ انا سچائی پر چپ بھلے پر ماہ سین اور دیگر لکین کو مبارکبادیں کرتی ہوں۔ میرا ایک ناچیز شرم ہے، وہ یہ کہ آپ اپنے رزلے اور میں اپنے مختصر سے صفحے کے ذریعے ایک ایسی ہم ملائیں جو بے روزگار خواتین کے لئے سودمند ثابت ہو۔ ہم سب صحافی خواتین مل کر ایک ایسی انجمن کی بنیاد ڈالیں۔ بے روزگار خواتین کے مسائل اٹھ کر لیا اور حکومت تک اپنی آواز پہنچائیں۔ مجھے امید ہے کہ اس سنگین مسئلے پر آپ بہت قلم اٹھائیں بلکہ سیکرٹ ساتھ تعاون کریں گی۔

ش. فرخ (انٹرنیشنل ڈیٹا اور ایس ڈیٹا خواتین) گلران شرف الداری کے باوجود ہم سب کے ایک دوسرے سے محبت ہیں کہ پاکیزہ دیکھا دیکھا اور پتہ کیا۔ بہت جا کا آپ لوگوں پر تنقید کیلئے کچھ وادعہ ملے لیکن..... بہر حال صحافت میں ایک نئے باگیا اضافہ ہوا جس پر ہم سب صحافی خواتین بہت مسرور ہیں۔ ماہ سین صاحبہ

ان کے مقدر میں بھی تھا۔ اور ڈاکٹر کو تھا کہ انہیں کوئی شدید عارضہ نہ پڑتا ہے لیکن میں یہ نہ سمجھ پائی کہ انہیں کیا عارضہ ہو سکتا ہے۔ ہمیکہ کار و سے روتے برا حال تھا میں نے انہیں دلاسا دیکر چپ کر لیا اور پوچھا بھائی کہاں ہیں؟ ہمیکہ بھیتانے میری طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کون سی بھائی بچہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک جڑی عورت کی طرف اشارہ کر دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا میں خاموشی سے اپنے گھر آ گئی۔ ہم کہیں کی اتنی کو کتنی تنہائی کو وہ اپنے بیٹے کے لئے بہت ہی خوبصورت سی ہو گیا کہیں لیکن ان کی ہوس نے انہیں کہاں کا نہ رکھا اور وہ بیسز جس کے لئے تھے جن کے تھے ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکا میں سوج رہی تھی کہ سامان سرسبز کا ہے بل کی خبر نہیں؟ فزوات بیگم کراچی

اح. عنوان کے تحت "مذہب پاکیزہ کے نام سے موزے غلطو کے بچے اختراعات شائع کیے جاتے ہیں۔"

ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ پاکیزہ کے ذریعے "عوام سدھار" کی طرح جان جا عوام کی تمام غلط روئ کو بدل دینے کا عزم ہو کر ہم اپنے شرم سے آپ کو گفت دیں گے۔ رجوع کریں۔ پاکیزہ کیلئے دوائیں۔

منزشتاق سہیل کراچی، ایک دواور۔ پاکیزہ "نہیں بلکہ ڈائجسٹ" میسر مطلب آپ سمجھتی ہوگی۔ "پاکیزہ" تو چاہے لیکن اس کا ساز انتہائی داریات ہے، ڈائجسٹوں کی روش ترک کر کے یہ قوم کو بگاڑنے والے "ملا" ہیں، اینڈ ہر ڈائجسٹ کی ایسی ہی ہوئی ہے خدا کرے کہ "پاکیزہ" پاکیزہ ہے۔ ویسے امید..... بہر حال پہلا شمارہ اچھا ہے۔ آئندہ کیلئے دواور کریں۔

نثار فاطمہ دلاہن، پاکیزہ میری میز پر لڑا۔ لیکن میں نے وہ دن تک نا تھا نہیں لکھا، اسلئے کہ میں اپنا اعلان اور خواتین میں کرنا چاہتی ہوں وہ دن بد ہو رہے کی قوت نہ پا کر پاکیزہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور خاموشی سے پری میں ڈال دیا۔ گھر لڑا تو ایک دم فست کلاس پایا کراچی سے ایسا ڈائجسٹ نکلا۔ انہیں نہیں آتا۔ شہرت مسکے پاس ہے بلکہ لکھنؤ کا

آپ سب کو مبارکباد دیتی ہوں لیکن ایک مشورہ ہے کہ ہمارے لئے پاکیزہ گوشت کھانے سے بچیں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ پاکیزہ کے ذریعہ خواتین کی ذہنی عروانی کو ختم کر کے جود جہد کریں گی۔

شمیہ نقوی (کراچی)

پاکیزہ ملا۔ اس سے پہلے اس نے سنیوں کے ساتھ آپ کا بیجا م بھی لایا تھا اور ایک افغان شہر میں بھی کر دیا تھا۔ لیکن مگر ملو مصروفیت کی وجہ سے اس کی شکل نہ کر سکا۔ بہرحال آئندہ ہمارے حضور پاکیزہ کیلئے کچھ نہ کچھ لگوں گی۔ یہ وعدہ ملا۔

پاکیزہ کے متعلق کیا لکھوں ساری ہی تعریفیں آپ سے چکی ہوئی۔ راضی ایک ہی شے ہے میں اس رسل نے خواتین کے دلوں میں جو عمامہ بنایا ہے وہ قابلِ صداقت ہے۔ میں نے اس کی باتوں کی گفتگوں کا پھل بھی میری توہین و غلبہ کے ہر نئے پرچے کے ساتھ پاکیزہ کے مبارک اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

منجمہ ناہید نجفی (حیدرآباد)

گرامی قدر ماہِ مبین صاحبہ!

مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ کی چوکاوش پاکیزہ کے روپ میں جلوہ گر ہونے سے اس نے سب کا اپنا ملاحظہ کر لیا اور سرخوشی قبول کیجئے کہ خیراد کے افق پر ایک روشن ستارے کی کی ٹری شدت سے محسوس ہو رہی ہے اور اس نے اس کی کو پورا کر کے ادب و فاضلہ پر احسان کیلئے پاکیزہ کی پاکیزگی اور انفرادیت پر تکرار کئے گئے آپ کو کتنی الوداع کو خوش کرنی ہوگی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مس شاکل رشتی (راہوالی)

آپ نے تمام مصنفین کو ایک جگہ جمع کر دیا جن کی تحریروں سے کچھ کچھ حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے انسانوں کے علاوہ جو بیوی نہیں اور اسلامی مضمون لکھے ہیں وہ بے حد ضروری ہیں بے ہماری وہ خواتین جنہیں سنیں نہیں جاسکتیں وہ یہ رسالہ پڑھ کر بہت کچھ حاصل کر سکتی ہیں اس وقت جتنے بھی ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں ان میں آپ کا ڈائجسٹ بالکل غریب و بے باطل ایسا ہی ہے جیسے کہ نے کوڑے میں دریا کو بند کر دیا ہو۔

نورگس سعید قریشی (کراچی)

پہلے تو اتنا پیارا اور خوبصورت سا ہمارا نکالنے پر

مبارکباد قبول کریں۔ سرورق دیکھ کر دل مجھ اٹھا، جیسا باہر سے تو بہتر تھا، ویسا ہی اندر سے سین پایا تقریباً اتنا کہاں نیاں اچھی تھیں، آپ کی پیشکش بھی لاجواب ہے کہ اس میں نئی لکھنے والیوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اس خیریت مجھے پاکیزہ کی طرف متوجہ کر دیا کہ نہ لکھی اس نے وغیرہ لکھتی ہوں اس لئے اس پیشکش سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گی اور علیحدہ اپنا اساتذہ آپ کو رسالہ کر دوں گی۔ فی الحال تو ایک واقعہ رسالہ ہے آپ نے "معصوم" باتیں میں جو ذکر و تذکرہ فرمائیں۔ شکریہ۔

سروری چاند زینت آباد کراچی

پاکیزہ کا پہلا شمارہ ہمارے ہاتھ میں ہے رسالہ خوب ہے متناہ ہے کہ پاکیزہ "پاکیزہ" ہے جدیدیت اور تجارتی نقطہ نظر سے اپنے اس عزم کو نہ قبول جائے کہ "آپ پاکیزہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پائیں گی جسہاری دینی بی اور ماحشری اقدار کے خلاف ہو۔" بلکہ بانگ و دعویٰ اور خوبصورت جملوں سے ترتیب شدہ ڈائجسٹ ہزاروں ہنگام کا مقصد اور شرفِ وقت کی بکارتیں۔

آپ بھی افغان نگار بن سکتی ہیں :

آپ کی تحریر خامیوں اور نقصان سے عاریت ہے آپ کو کہانی کی تکنیک نہیں معلوم یا آپ کے مجھے خوبصورت نہیں ہیں تو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود آپ ایک اچھی افغان نگار بن سکتی ہیں۔ آپ کو میں ذرا سی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

ادارہ پاکیزہ نے نئی لکھنے والیوں کے لیے ایک مشق تیار کیا ہے۔ اس شے کے نام "مضمون" اور ایجنٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی کہانی ہو تو میں دیکھ بیٹھی۔ ہم سے دست کو دے آپ کے نام کے شائع کر دیں گے۔

افسانے اور کہانیاں اس پتے پر ارسال فرمائیں

پاکیزہ - پوسٹ بکس نمبر ۲۲۰ کراچی

معصوم باتیں

میرا بیٹا زمان جس کی عمر برسال ہے ایک رات بڑی اچھی اچھی باتیں کر رہا تھا مجھ کو اس پر بہت پیارا آیا اور میں کافی دیر تک اس کو چمٹائے پاس کرتی رہی۔ صبح ہوئی تو وہ پھر شہرت کرنے لگا مجھ کو بہت غصہ آیا اور میں اس کو ڈانٹنے لگی تو کہنے لگا اتنی رات کو تو آپ بہت تڑپنا تھیں۔ اب کیا ہو گیا۔ اس نے قی معصومیت سے کہا کہ مجھے بے ممانہ سنائی گئی۔

"امتدافِ حق کہی"

ہم سب گھروالے اکٹھے بیٹھے تھے اور سب سے چھوٹے بن بھائی بیٹھے اپنے اسکول کا کام کر رہے تھے میرا چھوٹا بھائی ایک کہانی تیار کر رہا تھا۔ وہ پڑھتا تھا۔ وہ پڑھتا تھا اور ہم نے کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن وہ پڑھتے پڑھتے ایک لفظ کو "مکڑی" کہہ رہا تھا۔ اس نے ایک دو دفعہ ایسے پڑھا تو پھر غصے نشوونما ہوئی کہ یہ لفظ کہاں سے آگیا۔ جب میں اپنے بھائی کے پاس گئی اور اس سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو تو کہنے لگا "مکڑی" میں نے "مکڑی" اور مکڑی کی کہانی پڑھ رہا ہوں اس کی یہ بات سن کر "مکڑی" ہوجاں ہر امت پوچھے۔ "یاد رہے کہ مکڑی کو کہانی اس "مکڑی" اور کچھ شکل لفظ ہونے کی وجہ سے اس کی زبان سے نکلا۔

چند دن ہوئے ہم سب دوپہر چائے پیا کرتے تھے۔ برف کھانے کی خبر کہنے لگا اس کی وقت تو یہاں تک پہنچ گئی کہ برف میں برف نہ کر دی۔ چھوڑ دیں گے کہ برف نہ پڑے۔

"عاطف برف کیوں نہیں کھاتے؟" اور اس نے جواب میں کہا کہ "نار آپ بھی سنئے۔" اتنی ٹھنڈی تھی مجھے کھانے نہیں جانی تھی میں اسے دھوپ میں رکھ کے آیا ہوں تاکہ ذرا گرم ہو جائے۔"

راحت الاول۔ ساہیوال

بچوں کو سردی اور گرمی کا احساس کچھ کم ہی ہوتا ہے یہی حال میرے بچوں کے لیے رہا ہے جو ہمیں چھوٹے ہیں پڑھتا ہے سخت سردی پڑ رہی ہے۔ مگر جب وہ باہر نکلے گا لڑکھڑکے تو پھر اسے ٹھنڈے کی کوئی بھی بات نہیں کر سکتا۔ ایک دن سر پر کے وقت جب ماسٹر صاحب اسے گھر پر پڑھانے کیلئے آئے تو میں نے ان سے شکایت کی کہ اب سردی میں باہر پھرتا ہے اور توڑ پھوس بھی نہ پہننے کی ضد کرتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے اسے ایسا نہ کرنے کی تلقین کی اور پھر ایک تپا واقعہ سنایا کہ ایک ہی لڑکا تھا بالکل تمہاری عمر کا تھا ایک دن سخت سردی پڑ رہی تھی اور وہ اپنی ڈھائی سائیکل لے کر باہر نکل گیا جب گھر آیا تو اسے سردی لگ گئی تھی تو نیا پیرا اور پھر دو تین دن کے بعد فوت ہو گیا۔ ماسٹر صاحب اسے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ان کی زبان لنگ ہو گئی اور انھیں ڈر لگا کہ "نہما" اور اس سے ماسٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اس واقعہ سے بہت متاثر کر دیا ہے مگر چند گھنٹہ کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

"ماسٹر جی اب وہ لڑکا سائیکل کہاں ہے؟"

بنام عمن بعداؤ و خپھہ ریاضی

یہ افسانہ ابالی بن کی مقرر کیا پانچ سال سے عموماً مصروفیت میں رہا ہے۔ ابالی بن کی باتیں کرتا ہے۔ ہماری گلی میں ایک لڑکا "نالی" کہلاتا ہے۔ اس کا بہن اس کا دوست ہے۔ وہ ہر وقت اکٹھے کھاتا ہے۔ ان کو اکثر شان کر کر لگا رہا جاتا ہے۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا ہے تو ہم اپنے چھوٹے بھائی طارق سے کہتے ہیں "جائو کہلا"۔ ان کے بہن کے ایک دن دوسرے پیرا بھائی کے دوست آئے۔ ان کے طارق سے کہا کہ جاؤ اباجان سے کہو کہ باہر آدمی ملا ہے۔ طارق نے انداز کرنا جان سے نہایت معصومیت سے کہا "اباجان۔" اور آپ کے شان ملا ہے ہیں؟ یہ جھوٹا سب پڑھ کر دھوکا دے دیا گیا۔ اس نے یہ سچ لیا تھا کہ ایک دوست کو شان کر کر لگا رہا تھا۔

طاہرہ ذیاض ہاشمی۔ ریاضی

۱۲۵